چیختی لاشیں

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	شیطانی قوت	۵
۲	بدروح	۲۹
۳	منحوس کھوپڑی	۴۵
۴	اراولی کی چڑیل	۵۷
۵	دست قضا	۶۷
۶	ڈائن	۸۵
۷	آسیبی کمرہ	۱۰۹
۸	تصویر کا انتقام	۱۲۵
۹	بدا کشش	۱۳۷
۱۰	جنونی شیطان	۱۴۹
۱۱	معلم کا راز	۱۶۳
۱۲	چیختی لاشیں	۱۷۵
۱۳	آسیبی بلی	۱۹۷

شیطانی قوت

جیل کے گھڑیال نے پانچ کا گھنٹہ بجایا۔ فیروز چونک کر اٹھ بیٹھا۔ وہ آج تمام رات جاگتا رہا تھا۔ کبھی کوٹھری میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے، کبھی سنگین فرش پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے اور کبھی سجدے میں خدا کے حضور گڑگڑاتے ہوئے۔ اس کی رحم کی اپیل صدر مملکت نے مسترد کر دی تھی اور آج صبح چھ بجے اسے پھانسی دی جانے والی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اسے قربانی کا بکرا بنایا جارہا ہے۔ قاتل کوئی اور ہی ہے مگر سزا اسے دی جارہی ہے۔ شہر کے ایک کروڑپتی سرمایہ دار اور مل اونر نے اپنے ایک کاروباری رقیب کو راستے سے ہٹانے کے لیے سازش کی۔ مزدوروں کے ایک گروہ کو اکسا کر اس کے کارخانے میں ہڑتال کرادی اور جب وہ ہڑتالی مزدوروں کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی کرائے کے غنڈے سے اس پر گولی چلوادی۔ فیروز کا تعلق اس یونین سے تھا جو ہڑتال کے حق میں نہیں تھی۔ وہ اور اس کے چند ساتھی ہڑتال کے باوجود کام پر آئے تھے اور کام کر رہے تھے۔ جس وقت کارخانے کا مالک مزدوروں سے مخاطب تھا تو وہ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے محض اس کی تقریر سننے آ گیا تھا۔ مالک کے برابر ہڑتالی مزدوروں کا لیڈر بھی کھڑا ہوا تھا۔ جب گولی چلی تو مزدوروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ بھی بھاگ رہا تھا کہ چند لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔ پھر پتہ نہیں کیسے اس کے کوٹ کی جیب سے ایک ریوالور بھی برآمد کر لیا گیا جس کے بارے میں بعد میں کہا گیا کہ اس سے چلنے والی گولی نے کارخانے کے مالک کی جان لی تھی۔ استغاثہ کے وکیل نے دعویٰ کیا کہ اس نے کارخانے کے مالک کے اشارے پر ہڑتالی مزدوروں کے لیڈر کو قتل کرنا چاہا تھا مگر گولی

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

مالک کے لگ گئی۔ ایسے گواہ لائے گئے جن کی زندگی میں اس نے کبھی صورت نہیں دیکھی تھی اور ان سے گواہی دلوائی گئی کہ فیروز نے فلاں اور فلاں موقع پر ہمارے سامنے واضح الفاظ میں مزدور لیڈر کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ریوالور دکھایا تھا۔ وہ نوٹ نکال کر دکھائے تھے جو اسے اس کام کے معاوضے میں کارخانے کے مالک نے دیئے تھے۔ اور پھر عدالت نے اسے پھانسی کی سزا سنا دی۔ اس کے رشتے داروں نے...... اس یونین نے جس کا وہ رکن تھا اور شہر کے کچھ مخلص لوگوں نے جو اس کی بے گناہی پر یقین رکھتے تھے، بہت دوڑ دھوپ کی۔ جہاں تک لڑ سکتے تھے لڑے، مگر کروڑ پتی سرمایہ دار کا روپیہ دور دور تک پھیل گیا تھا کسی کے بنائے کچھ نہ بن سکا۔ رحم کی ذاتی اپیل مسترد ہوئی تو شہر کی بہت سی تنظیموں اور نمایاں شخصیتوں نے اجتماعی اپیل کی مگر حکام نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی پھانسی کی تاریخ مقرر کر دی۔ فیروز کی آخری امید اب یہی تھی کہ شاید مقررہ وقت سے پہلے اپیل کا جواب منظوری میں آجائے۔

کوٹھری کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ قفل کھولا گیا اور جیل کا وارڈن دو سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ فیروز نے امید و بیم کے عالم میں وارڈن کی طرف دیکھا۔ مگر وہاں اسے جو سنگین سنجیدگی نظر آئی اس نے امید کی آخری کرن بھی بجھا دی۔ ایک ٹھنڈی اور گہری سانس بھر کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

پھانسی گھر میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ "ڈاکٹر" ایک مولوی صاحب، وارڈن، دو سپاہیوں اور جلاد کے علاوہ ایک پریس فوٹو گرافر بھی تھا۔ سپرنٹنڈنٹ نے اس سے اس کی آخری خواہش معلوم کی۔ فیروز نے اپنے عزیزوں رشتے داروں اور کچھ دوستوں کے نام فرداً فرداً پیغامات دیئے اور خواہش کی کہ ایک مرتبہ اور متعلقہ حکام سے رحم کی اپیل کے بارے میں معلوم کر لیا جائے کہ اس پر کوئی فیصلہ کیا گیا یا نہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے بتایا کہ وہ یہاں آنے سے پہلے معلوم کر چکے ہیں مزید یہ کہ ایسا انتظام کر کے آئے ہیں کہ اگر کوئی فیصلہ عین وقت پر بھی موصول ہو تو فوری طور پر اطلاع پہنچائی جا سکے۔

اس کے بعد مولوی صاحب نے اس سے کلمہ پڑھوایا، توبہ استغفار کرائی۔

پھر فیروز کی مشکیں کس دی گئیں۔ جلاد نے اس کا بازو پکڑ کر پھانسی کے تختے تک لے جانا چاہا مگر فیروز نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ خود نہایت ہمت کے ساتھ سیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ جلاد نے اس کے چہرے پر سیاہ غلاف چڑھا دیا۔ موٹے شہتیر سے لٹکتا ہوا رسی کا پھندا فیروز کی گردن میں ڈال کر کس دیا اور اشارے کے لیے سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھا لیکن اس سے قبل کہ سپرنٹنڈنٹ جس کی نظریں اپنی رسٹ واچ پر جمی ہوئی تھیں ہاتھ اٹھا کر کوئی اشارہ کرے ایک بڑی عجیب و غریب بات رونما ہوئی۔ رسی کا وہ پھندا جس کا ایک سرا شہتیر سے اور دوسرا فیروز کی گردن میں کسا ہوا تھا اچانک یوں غائب ہو گیا جیسے کبھی موجود ہی نہیں تھا۔

مجھے سید نگر آئے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا، دارالحکومت سے روانگی کے وقت اتنے دن ٹھہرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا مگر جن بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا وہ اپنی شہرت سے کہیں زیادہ صاحب علم و فن ثابت ہوئے۔ روحانیت اور پراسرار علوم سے میرا شغف جنون کی حد تک تھا۔ یہ شوق کچھ تو وراثت میں ملا تھا اور کچھ ایک خدا رسیدہ بزرگ کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صدیوں پہلے جب ہمارا خاندان حجاج بن یوسف کے زمانے میں سندھ میں آ کر آباد ہوا تھا تو اس وقت ان بزرگ نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ہمارے خاندان کی ہر نسل میں ایک نہ ایک شخص ایسا ضرور پیدا ہوگا جو ان بزرگ کی چھوڑی ہوئی امانت کو سنبھالے گا اور علوم روحانیت میں کمال حاصل کرے گا۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ ان کی پیش گوئی مجھ پر صادق آتی تھی۔ خدا کے فضل سے میرے عزیز و اقارب میں کچھ اور ہستیاں بھی ایسی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے طور پر اس امانت کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں اس سلسلے میں بچپن ہی سے کچھ زیادہ سنجیدہ تھا۔ جب تک تعلیم کا سلسلہ جاری رہا میری دلچسپی پرانی اور نایاب کتابوں اور بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ملفوظات کے مطالعے تک محدود رہی لیکن یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوتے ہی میں اپنی تمام توجہ کے ساتھ روحانیت اور ہمہ اقسام کے پراسرار علوم کو حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دنیا کے ہر گوشے کا سفر کیا۔ ہر مذہب و ملت کے باکمال لوگوں سے ملا اور ان سے تھوڑا یا بہت اکتساب فن کیا۔ سید نگر کا سفر بھی اسی مقصد سے تھا۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ تین چار ماہ لگ جائیں گے مگر جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ ان بزرگ سے ملنے کے بعد محسوس ہوا کہ ان کے بارے میں جتنا سنا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں اور اگر مجھے واقعی کچھ حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے مدت کی قید ختم کرنا ہوگی۔ یوں تو بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن پر عبور حاصل کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے لیکن جہاں تک نظریاتی طور پر کسی بات کے سمجھنے کا تعلق ہے تو ان بزرگ کی خصوصی اور نہایت مشفقانہ توجہ نے اس مختصر مدت کو ہی میرے لیے کافی بنا دیا۔

میں نے کبھی اپنی صلاحیتوں کی نمائش کو پسند نہیں کیا اور نہ کبھی عوام کی عقیدت یا اوہام پرستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے فن کو کسب معاش کا ذریعہ بنایا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے اور جو جانتے تھے ان میں سے بھی ایسے افراد تین چار سے زیادہ نہیں تھے جنہیں کسی نہ کسی حد تک میری بعض پوشیدہ صلاحیتوں کا علم ہو لیکن اپنے علم کو دنیا کمانے کے لیے استعمال کرنے کے خلاف

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ہوتے ہوئے بھی میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اگر میری ذات سے خلق خدا کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو مجھے اس میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے محدود حلقہ احباب میں دارالحکومت کی خفیہ پولیس کے انسپکٹر سلیم کا نام شامل تھا جس کے توسط سے مجھے اکثر و بیشتر پراسرار اور الجھے ہوئے کیسوں میں قانون و انصاف کی مدد کرنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔

ان بزرگ سے رخصت کی اجازت پا کر میں دوسرے دن واپسی کا ارادہ کر رہا تھا۔ سید نگر ایک چھوٹا سا شہر تھا، جہاں دارالحکومت سے شائع ہونے والے اخبارات سہ پہر تک پہنچتے تھے۔ میں چائے پی رہا تھا کہ ملازم لڑکے نے اخبار لا کر دیا۔ صفحہ اول کی سرخیاں سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے میں نے اخبار پلٹا ہی تھا کہ ایک دلچسپ خبر نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

ایک حیرت انگیز معجزہ پھانسی کا پھندا غائب ہو گیا

کل صبح چھ بجے جب مشہور مقدمہ قتل کے مجرم فیروز کو پھانسی دی جانے والی تھی تو مشیت الٰہی نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ وہ جسے بچانا چاہتا ہے دنیا کی کوئی طاقت اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ ہمارے رپورٹر کا 'جو اس حیرت انگیز واقع کا عینی شاہد ہے' بیان ہے کہ جس وقت فیروز کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر کے پھندا اس کی گردن میں ڈال دیا گیا تو کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اگلے لمحے وہ ایک آزاد انسان کی حیثیت سے سانس لے رہا ہو گا مگر ٹھیک اس وقت جب کہ جلاد اپنا فرض انجام دینے والا ہی تھا ایک معجزہ رونما ہوا اور فیروز کی گردن میں پڑا ہوا پھانسی کا پھندا یوں غائب ہو گیا جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا 'حیران و سراسیمہ سپرنٹنڈنٹ جیل اور دوسرے حکام ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ پھانسی ملتوی کر کے فیروز کو واپس جیل بھیج دیا جائے یا دوسری رسی فراہم کر کے قدرت کے فیصلے کو چیلنج کیا جائے کہ چھ بج کر پینتیس منٹ پر صدر مملکت کا تازہ حکم موصول ہوا جو انہوں نے رحم کی اجتماعی اپیل پر صادر کیا تھا۔ اس حکم کے مطابق فیروز کی سزائے موت منسوخ کر کے عمر قید میں تبدیل کر دی گئی ہے۔

عام تاثر یہ ہے کہ قدرت کے اس معجز نما فیصلے نے عوام کے اس خیال کی تائید کر دی ہے کہ فیروز اصل میں بے گناہ ہے اور اسے جیسا کہ اس کا بیان ہے...... ایک گھناؤنی سیاسی سازش میں دانستہ پھانسا گیا ہے۔

اس کے بعد خبر میں بڑی تفصیل سے فیروز کے پھانسی کی کوٹھری سے نکلنے اور رسی غائب ہونے تک کے واقعات تحریر کیے گئے تھے۔ اس خبر کا روحانی پہلو مجھے بڑا دلچسپ معلوم ہوا اور میں نے ارادہ کر لیا کہ دارالحکومت پہنچنے کے بعد میں نہ صرف فیروز سے ملنے کی کوشش کروں گا بلکہ ممکن ہوا تو اس پھانسی گھر کو بھی دیکھوں گا جس کی رسی 'وہ پھندا جس کے ذریعے اب تک نہ معلوم کتنے انسانوں کو پھانسی دی جا چکی ہو گی، اس مافوق الفطرت انداز میں غائب ہو گئی تھی کوئی شک نہیں

کہ خدا کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں۔ وہ اگر کسی کو بچانا چاہے تو ہزاروں حیلوں بہانوں سے بچا سکتا ہے لیکن موجودہ واقعہ میں مجھے دو وجوہات سے اس کی صحت کو تسلیم کرنے میں تردد ہو رہا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ یہاں ہر بات کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے اور اصولی طور پر مشیت الٰہی کا یہ منشاء نہیں کہ وہ کارگاہ حیات کے فطری معمول میں غیر فطری انداز سے دخل دے 'الا یہ کہ انسانی فلاح و بہبود کا کوئی اہم پہلو یا مسئلہ اس کا متقاضی ہو اور یہ بات بھی خدا کے بیشتر پیغمبروں یا برگزیدہ بندوں کے زمانے تک محدود رہی ہے۔ اس بنا پر مجھے یہ ماننے میں تامل تھا کہ فیروز کی زندگی بچانے یا اس کی بے گناہی ثابت کرنے کا مسئلہ اتنا اہم تھا کہ اس مافوق الفطری مظاہرے کی ضرورت پیش آتی۔ دوسری وجہ میرے تردد کی یہ تھی کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ معاملہ واقعی اہم تھا تب بھی رسی کا غائب ہونا کیا ضروری تھا۔ کیا یہی نتیجہ رسی کو توڑ کر حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جیل کے حکام اگر دس مرتبہ بھی فیروز کو پھانسی پر لٹکاتے تو رسی دس مرتبہ ٹوٹ سکتی تھی اور یہ بات رضائے الٰہی ظاہر کرنے کے سلسلے میں عقل سے زیادہ قریب ہوتی۔ پھر آخر رسی کیوں غائب ہوئی؟ خدا کی باتیں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اس تعجب انگیز واقعے کی پس پردہ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔

دوسرے دن ساڑھے بارہ بجے دوپہر میں دارالحکومت پہنچ گیا جہاں ایک اور حیرت خیز واقعہ یا یوں کہیے کہ واقعات کا ایک سلسلہ پیش آ چکا تھا۔ میں نے فیروز سے ملاقات کرنے کے خیال سے انسپکٹر سلیم کو بھی اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا مگر یہ امید نہیں تھی کہ وہ اسٹیشن پر میرے استقبال کے لیے موجود ہو گا۔

"خدا کا شکر ہے۔" اس نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ایک سال کی طویل غیر حاضری کے بعد آپ نے عین اس وقت پر واپس آنے کا فیصلہ کیا جب کہ میں آپ کی مدد کی اشد ضرورت محسوس کر رہا تھا۔"

"خدا کے بندے نہ دعا نہ سلام۔ نہ میری خیریت پوچھی نہ اپنے بارے میں کچھ بتایا۔ صورت دیکھتے ہی مطلب کی بات چھیڑ دی۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے کچھ دم لینے کا موقع تو دیا ہوتا۔"

"بات ہی کچھ ایسی ہے۔" سلیم نے پریشان لہجے میں کہا۔ "آپ کو لینے کے لیے تفتیش ادھوری چھوڑ کر آیا ہوں۔ آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"وہ قلی نکال رہا ہے۔" میں نے ڈبے سے اترتے ہوئے قلی کی طرف اشارہ کیا۔ سلیم اپنے ساتھی سب انسپکٹر کی طرف گھوما۔

"حمید صاحب!" اس نے کہا۔ "آپ یہ اسباب نعیم صاحب کے گھر پہنچا کر ہیڈ کوارٹر چلے جائیے گا۔"

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

"کیا مطلب ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔" سلیم نے میرا بازو پکڑ کر پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پہلے پولیس ہسپتال کے مردہ خانے اور پھر ہیڈ کوارٹر"

"مگر کیوں۔ بات کیا ہے۔؟"

"کل رات شہر کے مختلف علاقوں میں رہنے والے چار افراد نے یا خودکشی کر لی یا انہیں قتل کر دیا گیا ہے......"

"معلوم ہوتا ہے تم واقعی بہت پریشان ہو۔" میں نے بات کاٹی۔ "اتنے پریشان کہ خود اپنی تضاد بیانی محسوس نہیں کر سکے۔ ایک طرف کہتے ہو کہ چار افراد نے خودکشی کر لی۔ دوسری سانس میں بتاتے ہو کہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں یا نہیں۔"

"آپ پہلے میری پوری بات تو سن لیں۔" سلیم نے گیٹ سے نکلتے ہوئے کہا۔

سامنے ہی پولیس کی ایک گشتی کار کھڑی ہوئی تھی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی کانسٹیبل بیٹھا ہوا تھا۔ سلیم نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے پہلے مجھے بیٹھنے کا موقع دیا پھر خود بھی ساتھ ہی اندر آتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

"جہاں سے آئے تھے وہیں واپس چلو۔" اس نے کانسٹیبل کو ہدایت کی اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

"تم مجھے کچھ سنا رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔" سلیم دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ "آج صبح شہر کے تھانوں سے ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کی گئی کہ ان کے علاقے میں چار لاشیں پائی گئی ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ انہیں قتل کا کیس سمجھیں یا خودکشی کا۔ مجھے تفتیش کا حکم دیا گیا جو حالات میں اب تک معلوم کر سکا ہوں' وہ یہ ہیں۔ چاروں افراد معاشرے کے محنت کش طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تاج الدین ہے اور وہ درزی تھا تیسری لاش عبدالغنی کی ہے جو پان فروش تھا اور چوتھا آدمی رفیق احمد تھا جس کی بیکری کی دوکان تھی۔ سوائے رفیق کے جو اپنے کمرے کی چھت سے رسّی کے ذریعے لٹکتا ہوا پایا گیا۔ باقی تینوں افراد اپنے بستروں پر مردہ ملے لیکن ان سب کو کسی رسّی ہی سے پھانسی دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ان سب کے گلوں پر ایک ہی قسم کے نشانات ہیں اور ہمارے ڈاکٹر کا خیال ہے کہ انہیں نہ صرف رسّی سے بلکہ عین ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کی رسّی سے مارا گیا ہو۔ اور وہ رسّی یا تو وہی ہے یا بالکل اسی طرح کی ہے جس سے رفیق کی لاش لٹکتی پائی گئی۔ ابتدا میں مقامی تھانے [illegible]

کی ہے جس کی بڑی وجہ وہ حالات تھے جن میں لاشیں پائی گئیں مثلاً دوست محمد اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے تنہا سو رہا تھا۔ صبح کو بھی اس کے کمرے کا دروازہ بند پایا گیا۔ کوئی کھڑکی تک کھلی ہوئی نہیں تھی۔ اسی طرح تاج الدین کمرے میں اگرچہ بیوی بچوں کے درمیان سو رہا تھا مگر رات کو ان میں سے کسی نے کوئی آہٹ تک نہیں سنی' پھانسی دے کر ہلاک کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ مقتول کچھ نہ کچھ کشمکش ضرور کرتا ہے اور ایسی کشمکش ہوئی ہوتی تو تاج الدین کے بالکل برابر سونے والوں کی آنکھ ضرور کھل جاتی۔ پھر گھر کا دروازہ اس کا بھی اندر سے بند ہی ملا۔ تقریباً یہی معاملہ عبدالغنی کا ہے ان تینوں کیسوں میں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی موت ان کے اپنے ارادے اور عمل کا نتیجہ ہو یعنی خودکشی' لیکن اول تو کسی کو ایسی کوئی پریشانی یا الجھن لاحق نہیں تھی کہ وہ خود اپنی زندگی ختم کرنے کے بارے میں سوچتا۔ دوسرے ظاہر ہے کہ اپنے آپ کو پھانسی دینے کے بعد کوئی لاش گلے سے رسّی کھول کر اور اسے ضائع کر کے آرام سے بستر پر آ کر نہیں لیٹ سکتی۔ گویا انہیں قتل کیا گیا ہے۔ جس کے بارے میں ابھی بتا چکا ہوں کہ ظاہری شہادتیں اس کی بھی تصدیق نہیں کرتیں۔"

"واقعی بڑے الجھے ہوئے حالات ہیں۔" میں نے پہلی مرتبہ دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے۔" سلیم اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اب آیئے رفیق کی جانب جیسا کہ میں نے ابھی بتایا صرف اسی کی لاش خودکشی کے نظریے کو تقویت پہنچاتی ہے مگر اس کی زندگی میں بھی کوئی ایسا پریشان کن مسئلہ نہیں تھا جو اسے اس انتہائی اقدام پر مجبور کرتا۔ اس کے علاوہ جب یہ چاروں کیس ہمارے علم میں آ گئے اور پولیس سرجن نے یہ بتایا کہ ہو سکتا ہے وہ سب ایک ہی یا ایک جیسی رسّی سے ہلاک ہوئے ہوں تو یہ بھی سوچا گیا کہ ممکن ہے کسی ایک شخص یا اشخاص نے ان سب کو قتل کیا ہو یا پھر رفیق کو کسی وجہ سے باقی تینوں سے پرخاش ہو اور اس نے ان تینوں کو ٹھکانے لگا کر خودکشی کر لی ہو لیکن ان دونوں صورتوں میں ہمارے لیے سب سے بڑی الجھن یہی ہے کہ قاتل رفیق ہو یا کوئی اور مگر اس نے یہ کام آخر کس طرح کیا۔ وہ ہر طرح سے بند کمرے میں کیسے داخل ہوا اور کیسے باہر نکلا۔ وہ افراد سے بھرے ہوئے کمروں میں اتنی خاموشی کے ساتھ کس طرح تاج الدین یا عبدالغنی کا کام تمام کر سکا۔ جب کہ بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ ان کا محض گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ پولیس سرجن کی رپورٹ کے مطابق ان سب کی گردن کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی اور گردنیں کھنچی ہوئی ہیں جیسا کہ کسی کو لٹکا کر پھانسی دینے میں ہو جاتی ہیں۔ گویا ان کا گلا نہیں گھونٹا گیا بلکہ انہیں پھانسی دی گئی ہے مگر رفیق جیسا دبلا پتلا آدمی یہ کام ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"یعنی بات گھوم پھر کر ایسے موڑ پر آ گئی ہے جہاں تمہاری ناک کسی پراسرار مافوق الفطرت وجود کی بو سونگھنے لگی ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر آپ ہی بتایئے اور کیا نتیجہ نکالا جائے۔"

سلیم نے بیچارگی سے پوچھا۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

"تم نے مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ...... اگر انہیں قتل فرض کر لیا جائے تو...... طریق قتل یا آلۂ قتل کے علاوہ ان وارداتوں میں کوئی اور بات بھی مشترک ہے یا نہیں۔" میں نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔ "مثال کے طور پر یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے واقف تھے یا نہیں۔"

"جی ہاں۔ میں اسی جانب آنے والا تھا۔" سلیم نے جواب دیا۔ "مزید تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ نہ صرف ایک دوسرے کو جانتے تھے بلکہ گلشن کالونی کے علاقے میں ایک ہی اسٹریٹ پر ان سب کی دوکانیں قریب قریب واقع ہیں۔ محلے والوں کے بیان کے مطابق ان کے تعلقات آپس میں بہت اچھے تھے۔"

"محلے میں کسی سے ان کا جھگڑا تو نہیں تھا؟"

"جہاں تک معلوم ہوا ہے کسی شخص سے ان کی ایسی دشمنی نہیں تھی کہ وہ ان کی جان لینے پر تل جاتا۔" سلیم نے کہا۔ "اس کے علاوہ اگر کوئی ایسی بات تھی بھی تو پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کسی نے ان سب کو کیسے قتل کیا ہوگا۔"

"اب تک کی تحقیقات میں کوئی ایسی بات بھی سامنے آئی جس سے مقصد قتل پر کوئی روشنی پڑتی ہو۔"

"بالکل نہیں۔"

"ایک بات اور۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے بتایا کہ رفیق کی لاش رسّی سے لٹکی ہوئی پائی گئی تھی تو کیا تم نے دیکھا تھا کہ جو پھندا اس کے گلے میں ڈالا گیا اس کی ساخت کیسی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ ماہرین یہ کہتے ہیں کہ رسّی کے باندھنے یا گرہ دینے کے انداز سے بھی قاتل کی شخصیت اور اس کے کردار کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔"

"دراصل جب یہ معاملہ میرے سپرد کیا گیا تو مقامی تھانے کے انسپکٹر نے لاش اتروا کر رسّی اس کے گلے سے نکلوا دی تھی۔ اس وقت سے میں اتنا مصروف رہا کہ اسے دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ ویسے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میرے خیال میں اس کی اتنی اہمیت بھی نہیں تھی۔ اب آپ کہتے ہیں تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔"

"جو کچھ میں سوچ رہا ہوں اگر وہی بات نکلی تو یہ رسّی بنیادی اہمیت کی حامل بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

مردہ خانے میں چاروں لاشوں کو دیکھنے کے بعد میری رائے پولیس سرجن سے مختلف نہیں تھی۔ گردن کے نشانات بلاشبہ یہی ظاہر کرتے تھے کہ ان سب کو ایک ہی جسامت کی رسّی سے [illegible]

چلا گیا تھا۔ اس نے متعلقہ تھانے کے انسپکٹر کو فون کیا۔ انسپکٹر نے جواب دیا کہ اس نے لاش کے ساتھ ہی رسّی بھی ہیڈ کوارٹر کے عملے کے سپرد کر دی تھی۔ سلیم نے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا مگر وہاں پندرہ منٹ تک ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد بھی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ رسّی اب کہاں ہے۔ سب ہی اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاش کی گردن سے کھلتے ہی رسّی جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

دوسرے دن کا سورج ایک اور اندوہناک واقع کی خبر کے ساتھ طلوع ہوا۔ رسّی غائب ہونے پر سلیم کو اپنے ماتحتوں کی لاپرواہی پر اتنا غصہ آیا تھا کہ وہ اس غیر ذمہ داری کی چھان بین کرنے اسی وقت ہیڈ کوارٹر روانہ ہو گیا۔ میں بھی اپنے گھر واپس چلا گیا۔ سب انسپکٹر حمید نے میرا سامان پہنچا دیا تھا۔ جسے میرے ذاتی ملازم علی جان نے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے میری آمد سے پہلے ہی کھول کر درست کر دیا تھا۔ سید نگر جاتے ہوئے میں علی جان کو گھر کی دیکھ بھال کے لیے یہیں چھوڑ گیا تھا۔ اسے بھی میرے آنے کی اطلاع تھی چنانچہ میں غسل کر کے نکلا تو وہ میز پر کھانا لگا چکا تھا۔ کھانے کے دوران اور اس کے بعد بھی میرا ذہن اس عجیب و غریب واردات میں الجھا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلیم کا سوچنا درست ہی ہے۔ ان واقعات کی تہہ میں یقیناً کسی پراسرار طاقت کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ مجھ سے رخصت ہونے کے بعد شاید وہ اتنا مصروف رہا کہ پھر اس دن اس سے ملاقات نہیں ہو سکی لیکن دوسرے دن وہ صبح ہی صبح آ دھمکا اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا ایک اور افسوسناک خبر کے ساتھ۔

اس نے بتایا کہ پندرہ منٹ پہلے ہیڈ کوارٹر سے اس کے گھر فون کر کے اسے فوری طور پر عتیق الرحمان صاحب کے بنگلے پہنچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ عتیق الرحمان صاحب سرکاری وکیل تھے اور فون پر دی گئی اطلاع کے مطابق آج صبح ساڑھے چھ بجے جب وہ حسب معمول نماز کے لیے نہیں اٹھے تو ان کی بیگم نے انہیں جگانے کے لیے کمرے کے دروازے پر دستک دی لیکن زور زور سے پکارنے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد بھی جب اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو انہیں فطری طور پر تشویش ہوئی۔ اس وقت تک ان کے دونوں لڑکے اور دوسرے گھر والے بھی وکیل صاحب کے کمرے کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ کمرے میں تین کھڑکیاں ہیں مگر وہ بھی اندر سے بند پائی گئیں۔ مجبوراً وہ لوگ دروازہ توڑ کر اندر گھسے اور دیکھا کہ عتیق الرحمان صاحب کی لاش چھت کے کنڈے

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

سے رسّی کے ذریعے بندھی ہوئی لٹک رہی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے نے فوراً ہیڈ کوارٹر فون کیا جس کے نتیجے میں انسپکٹر سلیم کو موقع واردات پر پہنچنے کی تاکید کی گئی۔

"ہو سکتا ہے کہ یہ واردات خودکشی کی ہی ہو۔" اس نے آخر میں کہا۔ "لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور پر کل کے واقعات سے ہے۔ اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ تحقیقات کے ابتدائی مرحلے سے ہی آپ کو شامل کر لیا جائے تاکہ یہ تو نہ ہو کہ کوئی اہم سراغ ہمارے دیکھے بغیر ہی غائب ہو جائے۔"

"گویا کل تمہاری دن بھر کی جستجو کے بعد بھی اس رسّی کا سراغ نہیں ملا۔" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" سلیم نے جواب دیا۔ "پہلے میں آپ کے باوجود اسے اتنی اہمیت نہیں دے رہا تھا لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ واقعی کوئی اہم کڑی تھی جسے قاتل یا قاتلوں نے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اڑا لیا۔ آپ کے خیال میں ایک معمولی رسّی نے آخر اتنی اہمیت کیوں اختیار کر لی ہے۔"

"میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن گزشتہ تین چار دن میں رسّی گم ہونے کا یہ دوسرا واقعہ ہے۔"

"دوسرا واقعہ۔" سلیم نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔ تم نے اخبارات میں پڑھا ہو گا کہ عین اس وقت جب کہ فیروز کو پھانسی دی جا رہی تھی۔ شہتیر سے بندھا ہوا رسّی کا پھندا پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔"

"اوہ۔" سلیم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اور ان چاروں کو بھی پھانسی ہی دی گئی ہے۔ آپ یہ تو کہنا نہیں چاہتے کہ وہی رسّی اس کام میں استعمال کی گئی تھی۔ مگر کیوں۔ آخر فیروز کے معاملے سے ان لوگوں کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اس کے مقدمے کی پوری کارروائی کے دوران نہ گواہوں کی حیثیت سے نہ کسی اور طرح ان لوگوں کا نام سننے میں آیا۔"

"ممکن ہے فیروز کے مقدمے سے ان کا تعلق نہ ہو کسی اور مقدمے سے ہو۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ اب پانچویں نمبر پر ایک سرکاری وکیل کی موت واقع ہوئی۔" میں نے جواب دیا۔

عتیق الرحمان صاحب کے بنگلے تک پہنچنے میں ہمیں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ پولیس سرجن اور دوسرا عملہ پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ لاش چھت سے اتار کر ایک پلنگ پر رکھ دی گئی تھی۔ سرجن ابتدائی معائنے میں مصروف تھا۔ میں نے اور سلیم نے اسی رسّی کو دیکھا۔ یہ ایک غیر معمولی طور پر موٹی اور مضبوط رسّی تھی اور سب سے عجیب چیز جو دیکھنے میں نظروں کو کھٹکتی تھی وہ اس کا پھندا تھا۔ بالکل اس پھندے کی طرح بڑے اہتمام سے تیار کیا ہوا تھا جو مجرموں کو پھانسی دینے میں

استعمال ہوتا ہے۔

"مجھے یقین ہو گیا کہ اگر اس کی شناخت کا کوئی طریقہ ممکن ہو تو یہ وہی رسّی ثابت ہو گی جو پھانسی گھر سے غائب ہو گئی تھی۔" سلیم نے حیرت سے کہا۔ "اتنا ہی نہیں اگر اس تھانے کے انچارج کو دکھایا جائے تو شاید یہ بھی ثابت ہو جائے کہ رفیق کی لاش جس رسّی سے لٹکتی پائی گئی وہ بھی یہی تھی۔"

"اسے ذرا حفاظت سے کہیں رکھ دو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ پھر غائب ہو جائے۔" میں نے کہا اور جواب میں سلیم نے اس کو بڑی احتیاط سے اپنی پولیس کار کی ڈکی میں رکھ کر مقفل کر دیا۔

اس اثناء میں سرجن اپنے معائنے سے فارغ ہو چکا تھا۔ موت یقینی طور پر گردن کی ہڈی ٹوٹنے اور دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ لاش پر اور کسی قسم کا کوئی نشان یا زخم نہیں تھا جس سے یہ ظاہر ہوا کہ پھانسی پانے سے پہلے مرحوم وکیل صاحب نے کسی کے خلاف کوئی کشمکش یا مزاحمت کی ہو۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرجن صاحب کی نگرانی میں ہسپتال بھجوانے کے بعد سلیم گھر والوں کی طرف متوجہ ہوا وکیل صاحب کی بیگم کا صدمے سے برا حال تھا اور انہیں ڈاکٹر نے کوئی مسکن اور خواب آور دوا دے کر ان کے کمرے میں آرام سے بستر پر لٹا دیا تھا۔ مرحوم کا بڑا لڑکا...... شفیق الرحمان یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ زیادہ تر سوالات اسی سے کیے گئے۔

"انسپکٹر صاحب!" وہ سلیم کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی بول اٹھا۔ "میرے ابا جان نے خودکشی ہرگز نہیں کی، انہیں قتل کیا گیا ہے۔"

"یہ خیال آپ کے ذہن میں کیوں آیا۔ جب کہ خود آپ لوگوں کے کہنے کے مطابق دروازہ تو دروازہ وکیل صاحب کے کمرے کی کھڑکیاں تک اندر سے بند تھیں۔" سلیم نے سوال کیا۔

"یہ میں نہیں جانتا کہ قاتل کس طرح اندر داخل ہوا یا کیسے باہر آیا۔" شفیق نے تیزی سے کہا۔ "یہ تحقیقات کرنا آپ کا کام ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ قتل کی واردات ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابا جان کی لاش اسی رسّی سے لٹکی پائی گئی ہے جو کل کسی نے دھمکی کے طور پر انہیں پارسل میں بند کر کے بھیجی تھی۔" ظاہر ہے اس بات پر سلیم کو چونکنا چاہیے تھا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ وہ رسّی کسی نے وکیل صاحب کو بھیجی تھی۔" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ "یہ کس وقت کی بات ہے۔"

"کل دوپہر تقریباً ایک بجے جبکہ ہم سب کھانے کی میز پر تھے۔ ملازم کپڑے میں بڑی احتیاط سے سیا ہوا ایک پارسل لے کر آیا تھا۔ پارسل تقریباً دو فٹ لمبا ایک فٹ چوڑا اور تقریباً اتنا ہی موٹا تھا۔ اس پر بڑے بڑے حروف میں ابا جان کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ پارسل پر کوئی ایسی علامت نہیں تھی جس سے معلوم ہو کہ وہ بذریعے ڈاک آیا ہے۔ چنانچہ ابا جان نے ملازم سے پوچھا کہ یہ کون لایا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ کوئی بوڑھی عورت ہے اور کہہ رہی ہے کہ وکیل صاحب اسے بڑی اچھی

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

طرح جانتے ہیں ایک سال پہلے انہوں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ اسے آج تک نہیں بھول سکی اور یہ حقیر سا تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہے۔ ابا جان اسی وقت اٹھ کر باہر گئے مگر وہ عورت اتنی دیر میں خدا جانے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ انہوں نے واپس آ کر ہم سب کے سامنے پارسل کھولا۔ اندر سے لکڑی کا ایک بکس برآمد ہوا۔ جب اسے کھولا گیا تو آپ یقین کریں کہ اس میں وہی رسّی بڑی احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ اتنا ہی نہیں اس کے ایک سرے پر وہ پھندا بھی موجود تھا جس نے............"

شفیق کی آواز رندھ گئی اور وہ باقی فقرہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اور سلیم نے بھی اس کے غم کا احساس کرتے ہوئے کچھ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد جب اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے کہا۔

"ابا جان رسّی کو دیکھ کر بڑے فکرمند اور پریشان نظر آنے لگے تھے۔ مگر انہوں نے ہم سب کے خیال سے اس بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ شاید ان کے کسی دوست نے شرارت کی ہے۔ مگر کم سے کم میں ان باتوں سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ سرکاری وکیل کی حیثیت سے ان کا یہ فرض تھا کہ وہ قانون کی گرفت میں آئے ہوئے مجرموں کو قرار واقعی سزا دلوانے کی پوری کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اس فرض کی ادائیگی میں وہ کتنے ہی مجرموں کو جیل یا پھانسی کے تختے تک پہنچا چکے ہوں گے اور یقیناً کچھ ایسے مجرم یا مجرموں کے ساتھی ہو سکتے ہیں جو اس فرض کو ذاتی دشمنی کا رنگ دے کر انتقام لینے پر تل جائیں۔ میں نے ابا جان سے بہت کہا کہ وہ اس بات کو سرسری طور پر نظر انداز نہ کریں مگر انہوں نے میری بات پر توجہ نہیں دی۔ رسّی کو اسی پارسل میں بند کر کے اسٹور میں رکھوا دیا کہ کل جب کچہری جائیں گے تو اپنے قریبی دوستوں سے اس بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ بظاہر بات ختم ہو گئی مگر میرے دل کو جو تشویش لاحق ہو چکی تھی وہ نہ گئی۔ ابا جان بھی کچھ کم فکرمند نہ تھے۔ اس بات کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے کل رات خلاف معمول اپنے کمرے کا دروازہ اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند کر لی تھیں لیکن اس کے باوجود قاتل اپنی دھمکی پوری کر کے رہا۔ میں نے اس حادثے کا علم ہوتے ہی اسٹور میں جا کر اس پارسل کو دیکھا اور یقین کیجیے کہ رسّی پارسل میں موجود نہیں تھی۔"

"کیا آپ مجھے وہ پارسل دکھا سکتے ہیں؟" سلیم نے پوچھا۔

"جی ہاں" شفیق نے اٹھتے ہوئے جواب دیا اور پارسل لانے چلا گیا۔ مگر جلد ہی وہ پریشان صورت بنائے واپس آیا۔

"انسپکٹر صاحب! پارسل وہاں موجود نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔

اتنا ہی نہیں ہیڈ کوارٹر واپس پہنچ کر سلیم نے مجھے فون کیا کہ جب اس نے رسّی نکالنے کے لیے کار کی ڈکی کھولی تو وہ پراسرار رسّی ایک مرتبہ پھر غائب ہو چکی تھی۔

اس حد تک واقعات سامنے آنے کے بعد یہ بات تقریباً یقینی طور پر کہی جا سکتی تھی کہ یہ تمام وارداتیں انتقامی کارروائی کے تحت کی جا رہی ہیں جن کا تعلق گزشتہ سال عدالت میں پیش ہونے والے کسی مقدمے سے ہے۔ کسی ایسے مقدمے سے جس میں مجرم کو پھانسی دی گئی تھی اور جس میں عتیق الرحمان صاحب سرکاری وکیل کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے۔ اس سہ پہر کو میں نے سلیم کے ساتھ پولیس اور سیشن کورٹ کے گزشتہ سال کے ریکارڈ کا جائزہ لیا اور بہت جلد مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اتفاق سے گزشتہ ایک سال میں صرف ایک مشہور مقدمہ ایسا تھا جس میں عتیق الرحمان صاحب نے سرکاری وکیل کی حیثیت سے پیروی کی تھی اور جس میں ماخوذ مجرم کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ اس ضمن میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دوست محمد، تاج الدین، عبدالغنی اور رفیق احمد کی جانیں کیوں لی گئیں۔ وہ چاروں اس مقدمے میں سرکاری گواہ اور ایک حیرت انگیز واقع کے عینی شاہد تھے۔

عدالتی ریکارڈ کے مطابق مقدمے کے واقعات کچھ یوں تھے:

گلشن کالونی کی اسی سڑک پر جس پر ان چاروں کی دوکانیں تھیں ایک دو منزلہ مکان کرائے کے لیے خالی تھا۔ گزشتہ سال اگست کے پہلے ہفتے میں کوئی پراسرار جوڑا اس میں آ کر رہنے لگا۔ مرد کا نام غرناش تھا اور عورت اپنے آپ کو بیگم غرناش کہلواتی تھی۔ ان کے عجیب ناموں کی طرح ان کی حرکتیں بھی بڑی پراسرار اور ناقابل فہم تھیں۔

دونوں میاں بیوی دن بھر مکان میں بند رہتے تھے مگر شام کا اندھیرا پھیلتے ہی بن سنور کر گھر سے نکل جاتے اور پھر پتہ نہیں رات میں کس وقت واپس لوٹتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ غرناش کا ذریعہ معاش کیا ہے۔ یا وہ دونوں رات کو کہاں اور کیا کرنے جاتے تھے۔ محلے میں ان کے تعلقات کسی سے نہیں تھے اور نہ وہ کسی کا اپنے گھر آنا پسند کرتے۔ البتہ مہینے میں دو مرتبہ ایک سیاہ رنگ کی کار انہیں چھوڑنے ضرور آتی تھی...... اور اس وقت محلے والوں کے خیال کے مطابق دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کا سہارا لیے ہوئے خاموشی سے گھر میں چلے جاتے تھے۔ ان کے اندر جاتے ہی کار بھی روانہ ہو جاتی تھی۔ محلے کی کسی دوکان سے انہیں کبھی کوئی کھانے پینے یا دوسری قسم کی چیز یا خریدتے نہیں دیکھا گیا۔ چنانچہ لوگوں کو یہ حیرت بھی تھی کہ آخر یہ کھاتے کیا ہیں۔ کبھی غرناش کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جاتا اور اسی طرح کبھی اس کی بیوی کی صورت ہفتوں نظر نہیں آتی۔ لوگوں

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

میں ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہونے لگیں۔

اسی دوران شہر میں کنواری لڑکیوں اور کنوارے لڑکوں کی پراسرار گمشدگی کی یکے بعد دیگرے کئی وارداتیں ہوئیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ہر ماہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی' جن کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا' بڑی باقاعدگی سے غائب ہو رہے ہیں اور پولیس کی تمام تر دوڑ دھوپ اور جستجو کے باوجود ان میں سے کسی ایک کا بھی پتہ نہیں لگایا جا سکا تھا۔

پھر ایک رات اور وہ اکیس نومبر کی رات تھی تقریباً دس بجے جب کہ دوست محمد اپنی دوکان بند کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس نے ایک کالے رنگ کی کار کو غرناش کے مکان کے سامنے رکتے دیکھا۔ دوست محمد کی دوکان نسبتاً مکان سے قریب تھی اور پھر وہ دوکان بند کرنے کے لیے باہر بھی کھڑا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلی مرتبہ نوٹ کیا کہ کار سے اترنے والا مرد تو بے شک غرناش ہے مگر عورت اس کی بیوی نہیں ہے۔ وہ کوئی اور ہی حسین لڑکی تھی اور اس کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ کیونکہ غرناش اسے سہارا دیئے ہوئے لے جا رہا تھا۔

یہ بات دوست محمد کو چونکا دینے کے لیے کافی تھی۔ شہر میں لڑکیوں کی پراسرار گمشدگی کے چرچے عام ہونے لگے تھے۔ کار کے رخصت ہوتے ہی وہ تاج الدین ٹیلر ماسٹر کے پاس گیا اور اس سے اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ جلد ہی اس مشورے میں عبدالغنی پان فروش اور رفیق بیکری والا بھی شامل ہو گئے جنہوں نے خود بھی اس کار کو آتے دیکھا تھا پہلے ان چاروں نے اپنے طور پر حالات معلوم کرنے کی کوشش کی مگر مکان کا صرف ایک ہی دروازہ تھا جو بند تھا۔ مکان میں کسی دوسری طرف سے داخل ہونے کی کوشش کے دوران دوست محمد اور عبدالغنی نے کسی عورت کی دبی ہوئی چیخ بھی سنی جوان کے خیال کے مطابق گھر کے اندر سے آئی تھی اور اتنی ہلکی تھی کہ اگر وہ مکان سے کچھ فاصلے پر ہوتے تو نہیں سن سکتے تھے۔

اس مرحلے پر انہوں نے باہمی صلاح و مشورے کے بعد پولیس میں رپورٹ کرنا ضروری سمجھا چنانچہ عبدالغنی اور رفیق حلقے کے تھانے کی طرف دوڑائے گئے اور دوست محمد نے تاج الدین کے ساتھ مل کر محلے والوں کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اسی اثناء میں مزید چیخوں کی آوازیں سن کر لوگوں نے مکان کا دروازہ توڑنا شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں چیخوں کی آوازیں بند ہو گئیں اور غرناش نے دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے جھانک کر لوگوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ محلے والوں نے اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس عورت کو باہر لائے جس کے ساتھ وہ کچھ دیر قبل کار سے اترا تھا۔ غرناش نے جواب میں بتایا کہ وہ اس کی بیوی تھی مگر لوگ اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

یہ ہنگامہ جاری تھا کہ تھانے سے ایک سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ساتھ آ پہنچا۔ پولیس دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک اندرونی

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

فرش پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے جسم کو جگہ جگہ سے نوچا اور کاٹا گیا تھا۔ گردن پر شہ رگ کے پاس سے خون بھی جاری تھا۔ غرناش نے بھاگنے کی کوشش کی مگر محلے والوں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ گھر میں اس کی بیوی کہیں موجود نہیں تھی۔ مزید خانہ تلاشی میں ایک بند کوٹھری سے بے شمار انسانی ہڈیاں جن میں سات کھوپڑیاں بھی شامل تھیں برآمد کی گئیں۔

بے ہوش لڑکی کو ہسپتال بھیج دیا گیا اور غرناش کو حوالات۔ اس کی بیوی کی تلاش جاری رکھی گئی۔ مگر ریکارڈ سے معلوم ہوتا تھا کہ پھر اس کے بعد وہ دوبارہ کبھی نظر نہیں آئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ لڑکی ایک اسکول ٹیچر مرزا انور بیگ کی بڑی بیٹی حور بانو تھی۔ گذشتہ شام اپنے محلے ہی میں ایک سہیلی سے ملنے گئی تھی مگر پھر واپس نہیں آئی۔ شریف باپ صبح تک اسی تذبذب میں تھا کہ پولیس میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائے مگر بدنامی کے ڈر سے خاموش رہے۔

شہر میں اس وقت تک گمشدگی کی سات وارداتیں ہو چکی تھیں۔ جن میں چار لڑکے شامل تھے اور تین لڑکیاں اور غرناش کے گھر سے برآمد ہونے والی کھوپڑیاں بھی سات ہی تھیں۔ مزید یہ کہ پولیس لیبارٹری میں کھوپڑیوں کے کیمیاوی تجزیہ سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ ان میں چار کھوپڑیاں مردوں کی اور تین عورتوں کی ہیں۔ جن کی عمروں کا تعین بھی اس بات کی تائید کر رہا تھا کہ وہ بدنصیب غائب ہونے والوں کی کھوپڑیاں ہیں۔

غرناش پہ ہر طرح کی سختی کی گئی مگر اس نے آخر وقت تک یہ نہیں بتایا کہ کنواری لڑکیوں اور کنوارے لڑکوں کو اس طرح مارنے سے اس کا اصل مقصد کیا تھا۔ ویسے عام طور پر یہی خیال کیا جا رہا تھا کہ وہ اور اس کی بیوی دونوں آدم خور تھے اور کنواروں کو صرف اس لیے اغوا کرتے تھے کہ ان کا گوشت کچھ لذیذ ہوتا ہوگا۔ بہر حال واقعاتی شہادتوں سے ایک نہ دو پورے سات افراد کو انتہائی سنگدلی سے قتل کرنا ثابت تھا۔ غرناش پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس کی طرف سے کوئی پیروی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر قانون کا منشا پورا کرنے کے لیے اسے حکومت کی طرف سے ایک وکیل دیا گیا۔

دوست محمد...... تاج الدین...... عبدالغنی...... رفیق احمد اور دوسرے بہت سے لوگوں نے اس کے خلاف گواہی دی۔ حور بانو اگرچہ صحت یاب ہو گئی تھی مگر اس کی صحت یابی سے بھی عدالت کے فیصلے پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ غرناش کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی اور پھر ایک بہت ہی حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ۱۳ ستمبر کو جب غرناش کو مقررہ وقت پر پھانسی دیدی گئی اور اس کی موت کا یقین کرنے کے بعد جلاد لاش کو نیچے اتارنے کے لیے آگے بڑھا تو اچانک لاش سے سڑاند کا ایک بھبکا سا اٹھا اور اس کا گوشت گل سڑ کر گرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں پھانسی کے پھندے سے ہڈیوں کا صرف ایک پنجر لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا جو گردن ٹوٹ جانے کے باعث فوراً ہی نیچے گر پڑا۔

یہ سنسنی خیز خبر جیل کی چار دیواری سے نکلتے ہی جیسے سارا شہر اس ڈھانچے کو دیکھنے کے لیے امڈ

جیل کے مولوی صاحب نے غرناش کو کوئی خبیث روح قرار دیتے ہوئے اس ڈھانچہ کو زمین کھود کر دفن کر دینے کا مشورہ دیا۔ مگر کچھ ماڈرن قسم کے ذہنوں نے اس واقع کو ایک تاریخی حیثیت دیتے ہوئے ڈھانچہ کو نیشنل میوزیم کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا اور آخر کار اس رائے پر عمل کیا گیا۔ پھر بھی مولوی صاحب نے اس بات پر اصرار کیا کہ دھڑ اور کھوپڑی کو الگ الگ شیشے کی الماریوں میں رکھا جائے اور جب ایک مرتبہ الماریاں بند کر دی جائیں تو انہیں دوبارہ نہ کھولا جائے۔ ان کا یہ مشورہ مان لیا گیا اور مولوی صاحب نے اپنی نگرانی میں الماریاں بند کرا کے اس پر کوئی متبرک تعویذ چسپاں کر کے میوزیم بھجوا دیں۔

یہ آخری معلومات مجھے پولیس ریکارڈ میں منسلک اخباری تراشوں سے حاصل ہوئی تھیں۔

"آپ نے ان باتوں سے کیا نتیجہ اخذ کیا۔" انسپکٹر سلیم نے پوچھا۔

"میرے ساتھ تم بھی تو دیکھ رہے تھے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تم کیا سمجھے؟"

"کیا یہ سمجھا جائے کہ غرناش سچ مچ کوئی خبیث روح تھی جو مرنے کے بعد بھی اپنی موت کے ذمہ دار افراد سے انتقام لے رہی ہے۔"

"یہ بات بھی ممکن ہے لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انتقام ہی لینا تھا تو اس کے لیے ٹھیک ایک سال تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے کہا۔ "پھر یہ کہ اگر واقعی اس کے اندر یہ طاقت تھی کہ مرنے کے بعد بھی لوگوں کو نقصان پہنچا سکے تو زندگی میں وہ اتنا بے بس کیوں ہو گیا کہ پھانسی دیدی گئی اور وہ کچھ نہ کر سکا۔"

"ان معاملات میں تو آپ ہی کوئی صحیح رائے دے سکتے ہیں۔"

"میرے خیال میں ہمیں تین باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے میں نیشنل میوزیم جا کر غرناش کے پنجر اور اس کی کھوپڑی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ وہ رسّی تمہاری کار سے بھی غائب ہو چکی ہے۔ گواہ ختم ہو چکے سرکاری وکیل کو مار دیا گیا۔ اندیشہ ہے کہ ان کے بعد کہیں جج صاحب کی باری نہ آ جائے۔ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقدمہ سیشن جج عبدالقادر صاحب کی عدالت میں پیش ہوا تھا چنانچہ احتیاط کا تقاضا ہے کہ انہیں خطرے سے آگاہ کر کے ان کی کوٹھی پر مناسب نگرانی کا انتظام کر دیا جائے۔"

"میں ابھی کچھ سادہ لباس والوں کو روانہ کئے دیتا ہوں۔" سلیم نے جلدی سے کہا۔

"ضرور بھیج دو۔ ہم رات ہونے سے پہلے ان سے ملاقات بھی کر لیں گے۔"

"وہ تیسری بات کیا تھی؟"

"مقدمہ کی پوری کاروائی کے دوران حور بانو کو کسی بھی مرحلے پر عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اس وقت تک مکمل طور پر صحت یاب نہ ہوئی ہو یا پھر ایک شریف لڑکی کی رسوائی کے خیال سے اسے دانستہ نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ لیکن اس کے باوجود پولیس کو اس سے کم سے کم وہ حالات تو معلوم کرنا چاہیئے تھے جن سے اسے غرناش کے مکان میں واسطہ پڑا تھا۔ اس سے غرناش کی حقیقت سمجھنے میں مدد مل سکتی تھی۔ اسی کے ساتھ بیگم غرناش کے معاملے میں بھی کسی خاص سرگرمی سے کام نہیں لیا گیا۔ اگر وہ بھی اپنے شوہر کی طرح تھی تو یہ انتقامی کاروائی اس کی جانب سے ہو سکتی ہے۔ بہر حال ہم اس سوال پر بعد میں غور کریں گے۔ میں پہلے نیشنل میوزیم اور اس کے بعد مرزا انور بیگ صاحب کے گھر جانا چاہتا ہوں۔" "آیئے پھر دیر کس بات کی ہے۔" سلیم نے مستعدی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

میوزیم پہنچ کر معلوم ہوا کہ سالانہ صفائی اور مرمت کے سلسلے میں اسے پندرہ دن کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ سلیم نے فوراً اس کے انچارج کو فون کیا اور اپنے خصوصی اختیارات کا حوالہ دیتے ہوئے انچارج سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر کے لئے آ جائے کیونکہ ایک اہم کیس کے سلسلے میں وہ میوزیم کا معائنہ ضروری خیال کرتا ہے۔ پندرہ منٹ کے بعد انچارج صاحب بڑے ناخوشگوار موڈ میں تشریف لائے۔ مگر جلدی ان کی ناراضگی جواب دی اور بازپرس کے خوف میں تبدیل ہو گئی کیونکہ جیسا کہ مجھے اندیشہ تھا دونوں الماریاں کھلی پڑی تھیں اور غرناش کا پنجر اور کھوپڑی غائب تھی۔

الماریوں پر جو متبرک تعویذ چسپاں تھا اسے دیکھ کر میں نے سمجھ لیا کہ ڈھانچے اور کھوپڑی کے غائب ہونے میں کسی شیطانی کوشش کو براہ راست دخل نہیں ہے۔ کیونکہ اس تعویذ کی موجودگی میں کوئی شیطان یا خبیث روح اس الماری کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ضرور کسی انسان کو بے بس کر کے اس سے مدد لی گئی ہے۔ انسپکٹر سلیم اس انکشاف سے کچھ گھبرا گیا تھا۔ مگر میں نے اسے تسلی دی کہ جو بھی شیطانی قوت ان وارداتوں کی ذمہ دار ہے۔ وہ بہر حال اگلا وار کرنے کے لیے رات کا انتظار کرے گی اور ابھی شام کے صرف ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ ہمارے پاس کام کرنے کے لیے کئی گھنٹے ہیں۔ خدا کی تائید شامل حال رہی تو ضرور کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ نکالیں گے۔

انچارج صاحب کو باقاعدہ پولیس میں رپورٹ کرنے کی ہدایت کرنے کے بعد ہم مرزا انور

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

بیگ صاحب کے مکان کی طرف چل دیئے جن کا پتہ میں نے پولیس کے ریکارڈ سے نوٹ کر لیا تھا۔ ان کے گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ ابھی چند منٹ پہلے ہی اسکول سے واپس آئے تھے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

"مرزا صاحب! ہمارا خیال ہے کہ ایک سال پہلے جو شیطانی چکر شروع ہوا تھا وہ ابھی پوری طرح ختم نہیں ہو سکا ہے۔" میں نے فوراً حرف مطلب پر آتے ہوئے کہا۔ "اور عین ممکن ہے کہ گزشتہ دو دن میں جو افسوسناک وارداتیں ہوئی ہیں وہ اسی سلسلے کی کوئی کڑی ہوں۔ مگر آپ کسی ناگوار تاثر کے بغیر ہمارے چند سوالات کا جواب دے سکیں تو ہمیں کافی مدد مل سکتی ہے۔"

"جی ہاں ضرور۔ جو کچھ میرے علم میں ہو گا بتانے سے دریغ نہیں کروں گا۔" مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"تو سب سے پہلے یہ فرمایئے کہ کیا آپ کی صاحبزادی اس حادثے کے بعد اب مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"آپ نے وہ سوال کیا ہے جو گزشتہ تین ہفتوں سے خود میرے ذہن کو پریشان کر رہا ہے۔" مرزا صاحب کچھ چونکتے ہوئے بولے۔ "واقعہ یہ ہے کہ اس کے جسمانی طور پر صحت یاب ہونے کے بعد ہم یہ خیال کر رہے تھے کہ اس ناگوار واقعہ کا کوئی اثر اس کے دل و دماغ پر نہیں رہ گیا ہے۔ مگر پچھلے بیس بائیس دن سے اس کی عجیب حالت ہے۔ وہ راتوں کو گھر سے غائب ہو جاتی ہے۔ اس وقت اس کی کیفیت بالکل کسی ایسے انسان کی طرح ہوتی ہے جو نیند میں چل رہا ہو۔ نہ اسے گرد و پیش کا کوئی احساس ہوتا ہے اور نہ اپنے آپ کا۔ میں نے کئی مرتبہ اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔

ایک قریبی اندھیری گلی میں داخل ہوتے ہی وہ خدا جانے کہاں گم ہو جاتی ہے۔ اور جب تین چار گھنٹے کے بعد واپس آتی ہے تو پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ کمزور اور زرد چہرہ دکھائی دیتی ہے۔"

"یہ اتفاق کتنی مرتبہ ہو چکا ہے؟"

"پانچ چھ مرتبہ۔" مرزا صاحب نے جواب دیا۔

"اور کیا وہ ادھر دو راتوں سے برابر باہر جا رہی ہیں۔"

"جی ہاں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا۔" مرزا صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"گزشتہ سال کے دوران کبھی انہوں نے اس بات کا کوئی ذکر کیا کہ غرناش کس طرح انہیں بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا یا پھر اس کے مکان میں پولیس کے آنے سے پہلے ان پر کیا گذری۔" میں نے مرزا صاحب کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں۔ اس کا ذکر کیا معنی' مجھے تو شبہ ہوتا ہے کہ اسے یہ بھی ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس

کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آ چکا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایک بات اور۔ کیا ان کے گھر سے باہر جانے کا کوئی خاص وقت ہے۔"

"جی ہاں میں نے نوٹ کیا ہے کہ وہ ٹھیک بارہ بجے اپنے کمرے سے نکلتی ہے"

"شکریہ" میں سلیم کو اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کے جوابات نے صورت حال کو سمجھنے میں بڑی مدد دی۔ خدا نے چاہا تو اب ہم اس شیطان کو کیفر کردار تک پہنچانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

باہر آ کر میں نے سلیم سے کہا کہ اب وہ جج صاحب کے پاس اکیلا ہی چلا جائے۔ مجھے اس درمیان میں کچھ دوسرا ضروری کام انجام دینا ہے۔ مگر یہ کہ جج صاحب سے گفتگو کر کے اور وہاں ان کی حفاظت کا ضروری انتظام کرنے کے بعد وہ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے میرے گھر پہنچ جائے ہمیں آج رات حور بانو کا تعاقب کرنا ہے۔

اس رات بارہ بجنے سے پانچ منٹ پہلے ہی میں اور انسپکٹر سلیم مرزا صاحب کے مکان کے باہر موجود تھے۔ شام کو سلیم سے رخصت ہونے کے بعد سے اب تک کا وقت میں نے کچھ ضروری تیاریوں میں صرف کیا تھا۔ جو حالات معلوم ہو چکے تھے ان سے، اپنی روحانی صلاحیت کی بنا پر۔ مجھے کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمیں آئندہ کن واقعات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اس وقت میری جیب میں ایک مخصوص ریوالور اور چاندی کی دو گولیاں موجود تھیں جنہیں ایک خاص روحانی عمل سے تیار کیا گیا تھا۔ مرزا صاحب نے بتایا تھا کہ حور بانو ایک قریبی اندھیری گلی میں داخل ہونے کے بعد غائب ہو جاتی تھی مگر مجھے اس میں شک تھا۔ غرناش اس کی گردن سے تھوڑا سا خون پینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کی شیطانی روح کے کچھ اثرات حور بانو میں منتقل ہو چکے تھے۔ یہ اثرات ہی اس کی موجودہ کیفیت کے ذمہ دار تھے۔ مگر غائب ہونے کی صفت تو میرے علم کے مطابق خود غرناش یا اس کی بیوی کو بھی حاصل نہیں تھی پھر حور بانو میں یہ کمال کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ ضرور اس گلی میں داخل ہونے کے بعد کوئی ایسی بات پیش آتی تھی جسے تاریکی کی وجہ سے مرزا صاحب دیکھنے سے قاصر رہتے تھے۔

ٹھیک بارہ بج کر ایک منٹ پر مکان کا دروازہ کھلا اور حور بانو دونوں ہاتھ آگے پھیلائے

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

آنکھیں بند کیے اس انداز میں چلتی ہوئی باہر نکلی جیسے کوئی نیند میں چل رہا ہو۔ مرزا صاحب بھی اس کے پیچھے تھے مگر ہم نے انہیں واپس کر دیا۔ حور بانو گرد و پیش سے بالکل بے خبر اس تاریک گلی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جو مرزا صاحب کے مکان سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھی۔ یہ اس قطار میں بنے ہوئے مکانات کے عقبی گلی تھی جس میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میں اور سلیم بے آواز قدموں سے حور بانو سے چند قدم کے فاصلے پر مکانات کی آڑ لیتے ہوئے چل رہے تھے۔ اچانک گلی کے وسط میں پہنچ کر وہ ایک دم نظروں سے غائب ہو گئی یا کم سے کم سلیم نے یہی محسوس کیا تھا۔

"ارے وہ کہاں گئی؟" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک مخصوص صلاحیت سے کام لیتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں کو اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل بنا لیا تھا اور جانتا تھا کہ وہ غائب نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک مکان کے عقبی دروازے سے اچانک نمودار ہونے والے ہاتھوں نے اسے بڑی صفائی سے اندر کھینچ لیا ہے۔

سلیم کا بازو پکڑے ہوئے میں تیزی سے اس مکان کی طرف بڑھا۔ دروازے کو ہاتھ لگایا۔ وہ بند تھا۔ میں نے اپنی ذہنی طاقت اس کی کنڈی پر مرکوز کر دی اور دوسرے ہی لمحے کنڈی اس طرح اپنی جگہ سے سرک گئی جیسے کسی نے اندر سے کھولا ہو۔ مکان کے اندر بھی گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

"تم اس تاریکی میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکو گے۔"

میں نے آہستہ سے سلیم سے کہا۔ "بس میرا ہاتھ پکڑے آگے بڑھتے رہو۔"

ہم اس وقت مکان کے صحن میں کھڑے تھے۔ میں نے ایک نظر چاروں طرف دوڑائی اور اندازہ کر لیا کہ مکان کی نچلی منزل میں کوئی موجود نہیں ہے۔ سامنے ہی ایک زینہ دوسری منزل کی طرف جا رہا تھا۔ مگر میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ اوپر بھی کوئی نہیں ہے۔ پھر حور بانو اور ان پر اسرار ہاتھوں کی مالک ہستی کہاں گئی۔ اچانک ایک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور آنِ واحد میں سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ حور بانو کو عقبی گلی سے اندر گھسیٹ کر وہ پر اسرار ہستی اسے صدر دروازے سے کہیں لے جا رہی تھی جہاں یقیناً کوئی کار پہلے سے تیار کھڑی ہو گی۔ میں صدر دروازے کی طرف بھاگا اور بلاشبہ وہ کھلا ہوا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک سیاہ رنگ کی کار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ پچھلی سیٹ کے شیشے سے جو منظر مجھے دکھائی دیا وہ میرے لیے نہ سہی لیکن انسپکٹر سلیم کے لیے بے حد حیرت انگیز تھا پچھلی سیٹ پر ہڈیوں کا ڈھانچہ، اپنی کھوپڑی سمیت حور بانو کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی عورت کار چلا رہی تھی۔ ڈھانچے کی کھوپڑی حور بانو کی گردن میں پیوست تھی یقیناً وہ اپنی تقویت کے لیے اس کے خون سے خوراک حاصل کر رہا تھا۔

میں جان چکا تھا کہ ان کی منزل مقصود عبدالقادر جج کی کوٹھی تھی۔ جج عبدالقادر۔ وہ آخری قربانی جس کی موت کے بعد غرناش کا ڈھانچہ دوبارہ اپنا گوشت و پوست حاصل کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں کار کے پیچھے بھاگنا حماقت تھی۔ ہم تیزی سے پلٹ کر اس جگہ واپس آئے جہاں انسپکٹر سلیم کی پولیس کار کھڑی ہوئی تھی۔

انتہائی تیز رفتاری سے شارٹ کٹ استعمال کرتے ہوئے جب ہم جج صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو سیاہ کار سے چند لمحے ہی پیچھے رہے ہوں گے۔ کیونکہ غرناش کا ڈھانچہ اس عورت کے ساتھ کار سے اتر کر کوٹھی کے پورچ تک ہی جا سکا تھا جو حور بانو کو کار میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ انسپکٹر سلیم نے اپنے آدمیوں کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھا۔ مگر کوئی نظر نہیں آیا اور میں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ غرناش کی بیوی نے اپنی شیطانی طاقت کے ذریعے کوٹھی کے اندر باہر ایک ایسی تنویمی فضا قائم کر دی تھی جس میں رہتے ہوئے کسی بھی عام انسان کا ذہن کچھ دیر کے لیے ایک سکتے جیسی کیفیت میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ اپنی اپنی پوزیشن سنبھالے کھلی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے ہوں گے مگر انہیں قطعی احساس نہیں ہو گا کہ کوئی کوٹھی میں داخل ہو گیا ہے۔

سلیم نے آگے بڑھنا چاہا مگر میں نے اسے روک دیا۔ پھر اس سے قبل کہ وہ حیران ہو کر اس کی وجہ پوچھ سکتا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں کنپٹی پر رکھ دیے ایک لمحہ نظر بھر کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اپنی قوت ارادی سے اس کے ذہن کو اس تنویمی فضا کے تاثرات قبول کرنے سے روک دیا۔

ہم تیزی سے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ غالباً انسپکٹر سلیم کی ہدایت پر کوٹھی کے تمام کمروں کے درو... اور کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں مگر یہ احتیاط بے سود رہی تھی غرناش کی بیوی اپنی قوت سے ... ریعے ہر بند دروازے کو کھولتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

جج صاحب د... انسپکٹروں کی معیت میں کوٹھی کے سب سے پچھلے کمرے میں بیٹھے تھے۔ دونوں سب انسپکٹر نہ صرف ... تھے بلکہ ریوالور ہاتھوں میں لیے کسی بھی اچانک اقدام کے لیے بالکل تیار تھے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا کہ تنویمی فضا نے انہیں بھی مسحور کر دیا تھا۔ وہ جاگ رہے تھے۔ مگر کچھ دیکھنے اور سمجھنے کے نا قابل۔

غرناش کی بیوی نے ڈھانچے کو اشارہ کیا اور اس وقت نہ معلوم کہاں سے وہی پھانسی کا پھندا ڈھانچے کی انگلیوں میں نمودار ہو چکا تھا۔ ادھر اس نے قدم بڑھایا ادھر میں نے اپنا ریوالور نکال کر فائر کر دیا۔ چاندی کی گولی ٹھیک کھوپڑی پر پڑی اور وہ ڈھانچے سے ٹوٹ کر فرش پر لڑھک گئی۔ غرناش کی بیوی نے چونک کر ہماری طرف دیکھا اس کی آنکھیں دو روشن انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اس کا سیدھا ہاتھ تیزی سے بلند ہوا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی شیطانی عمل کر سکتی میں نے ریوالور کی دوسری گولی اس پر چلا دی۔ ایک خوفناک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

دہانے نیچے گرتی چلی گئی۔ میں نے سلیم کی طرف دیکھا جو انتہائی حیرت سے غرناش کی کھوپڑی کو گھور رہا تھا جس جگہ میری گولی لگی تھی وہاں کھوپڑی میں ایک سوراخ ہو گیا تھا جس سے تازہ تازہ خون بہہ رہا تھا۔

مگر یہ منظر صرف چند لمحوں کے لیے تھا کیونکہ ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں فرش پر غرناش اور اس کی بیوی کے بجائے سفید راکھ بکھری ہوئی تھی۔

ہر چند کہ اس پراسرار داستان کے بیشتر پہلو واضح ہو چکے ہیں مگر ظاہر ہے کہ پڑھنے والے غرناش اور اس کی پراسرار بیوی کی حقیقت جاننے کے لیے بے چین ہوں گے اس سلسلے میں مجھے صرف اتنا ہی اور بیان کرنا ہے کہ دراصل غرناش اور اس کی بیوی تقریباً تین صدی پہلے کے دو عام انسان تھے جنہوں نے شیطانی ذرائع سے ساحرانہ قوت حاصل کر کے اپنی زندگی کو دائمی بنا لینے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی تھی مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر ماہ اپنی مخالف جنس کا خون پیتے رہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کن حالات اور ادوار سے گذرتے ہوئے ہمارے زمانے تک پہنچے تھے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ وہ انکشاف راز کے خوف سے کسی ایک جگہ مستقل قیام نہیں کرتے ہوں گے۔ حالات یہ بھی بتاتے ہیں کہ جس رات انہیں تازہ قوت حاصل کرنے کے لیے خون پینا پڑتا تھا اس رات کچھ دیر کے لیے ان کی ساحرانہ شیطانی قوت سلب ہو جاتی تھی۔ اتفاق سے غرناش کو اسی کیفیت میں گرفتار کیا گیا جب کہ وہ اپنی ساحرانہ قوت سے محروم تھا۔ اصل حقیقت تو خدا ہی بہتر جانتا ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ غرناش کے ڈھانچہ بن جانے کے بعد اس میں کوئی ایسی خصوصیت باقی رہ گئی تھی کہ ٹھیک ایک سال بعد اس کی بیوی اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ مگر اس کے لیے غالباً لازمی شرط یہ تھی کہ پہلے وہ شیطان کو ان لوگوں کی قربانی پیش کرے جن کی وجہ سے غرناش کی موت جیسی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہ مولوی صاحب کی پیش بندی کی وجہ سے میوزیم میں رکھی ہوئی الماریوں سے غرناش کا ڈھانچہ خود نہیں نکال سکتی تھی چنانچہ اس کام کے لیے اس نے حور بانو کو استعمال کیا جو آسانی سے اس کی طاقت کے زیر اثر آ سکتی تھی۔ حور بانو کا خون پی کر ڈھانچہ اس قابل تو بے شک ہو گیا کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ہاتھوں پھانسی دے سکے مگر ابھی اس کے پاس خود اپنی کوئی ساحرانہ طاقت نہیں تھی۔ یہ طاقت اسے اس کی بیوی نے فراہم کی جو حقیقت میں غائب نہیں ہوئی تھی ایک بوڑھی عورت کی شکل میں اسی محلے میں ایک کرائے کے

مکان میں رہنے لگی تھی جہاں مرزا صاحب رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس طرح حور بانو کے قریب رہنا چاہتی تھی تاکہ ضرورت کے وقت اس سے کام لے سکے۔ پھانسی کے پھندے کا بار بار غائب ہونا اسی کی ساحرانہ قوت کا کرشمہ تھا۔ وکیل صاحب کو پارسل پہنچانے والی عورت بھی وہی تھی۔

غرناش کو اپنی اصلی حالت پر آنے کے لیے انسانی خون کی ضرورت تو تھی ہی لیکن غالباً اس لیے کہ انتقام کا ایک پہلو بھی نکل آئے، اس نے ان لوگوں کے خاتمے کے لیے اسی رسّی کو ضروری سمجھا جس کے ذریعے اسے پھانسی دی گئی تھی۔ وہ رسّی اس کی بیوی ہی نے غائب کی تھی اور جب غائب کی تھی وہ اتفاق سے وہی وقت تھا جب فیروز کو پھانسی دی جا رہی تھی اور اسی اتفاق کے تحت غرناش کی وجہ سے ایک بے گناہ پھانسی پانے سے بچ گیا۔

اور اب آخر میں اتنا اور بتاتا چلوں کہ غرناش کے خاتمے کے بعد حور بانو بھی اپنی پراسرار بیماری سے مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تھی۔ مگر گذشتہ واقعات کے بارے میں اب بھی اس کی یادداشت کچھ بتانے سے قاصر ہے۔ اسے بالکل یاد نہیں کہ غرناش نے اسے کس طرح اپنے قابو میں کیا تھا یا اس کے مکان میں پولیس کی آمد اور غرناش کی گرفتاری سے قبل کیا واقعات پیش آئے تھے اگر وہ کچھ بتا سکتی تو شاید ہم غرناش اور اس کی بیوی کے بارے میں کچھ اور حالات بیان کر سکتے تھے ممکن ہے کہ اس ساحرانہ قوت پر بھی کچھ روشنی پڑ سکتی جس سے کام لے کر ان دونوں نے ابدی زندگی کا خواب دیکھا تھا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ قدرت نے یہ واقعات اس کے ذہن سے کھرچ کر اچھا ہی کیا۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہوتا ہے کیونکہ جب بھی کسی نے اس پردے کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی نوع انسانی کو فائدے کے بجائے نقصان ہی اٹھانا پڑا۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

بدروح

گھر کے سب افراد شادی میں شرکت کرنے جارہے تھے اور میں تنہا رہنے کے خیال ہی سے اداس ہو رہا تھا اتنے بڑے گھر میں میں پہلی بار بالکل اکیلا تھا۔

یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے ان دنوں میں آکسفورڈ سے واپس پلٹا تھا۔ اور فی الحال بے روزگار تھا اس سے قبل جب بھی گھر والے کہیں جاتے تو نوشی ہمیشہ میرے ساتھ ہوتی تھی مگر اب اس کی شادی ہو چکی تھی اور ارشی یا ثریا میں سے کوئی بھی یہ تقریب مس کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ تنہا جو میری حالت ہوئی وہ میں ہی جانتا تھا۔

"اگر آپ کسی ایک اور کو چھوڑ کر نہ گئیں امی تو میں بھی نہیں رہوں گا۔" میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"کیوں بھائی جان! کیا آپ اکیلے ڈرتے ہیں؟" ارشی نے میرا مذاق اڑایا۔

"ڈرتا تو میں نہیں ہوں۔" میں نے اس طعنے کو ناگواری سے سن کر کہا۔ "مگر میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔"

"تم لوگ ڈسکس کرلو۔ اگر کل تک مجھے تمہاری رائے نہ ملی تو میں سب کو چھوڑ جاؤں گی۔" امی بے زار ہو کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

یہ خیال میرے لیے کافی حد تک خوش کن تھا۔ صرف امی چلی جاتیں تو باقی یہیں ہوتے اس لیے میں نے جھگڑا کھڑا کرنا چاہا تاکہ کل تک ہم کوئی فیصلہ نہ کرسکیں مگر بدقسمتی میرا پیچھا کررہی

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

تھی...... مجھے میری خواہش کے برعکس تنہا چھوڑ دیا گیا۔ بصورت دیگر مجھے "بزدل" کا لیبل اپنے ماتھے پر چسپاں کرانا تھا جو مجھے کسی صورت منظور نہیں تھا۔

دن کا وقت ریکارڈ سن کر گزار دیا مگر رات ہوتے ہی ڈر اور خوف سے میری حالت غیر ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے امی وغیرہ کے آنے تک میری موت واقع ہو جائے گی سب سے پہلے مجھے خود پر غصہ آیا کہ میں تقریبات سے اتنا الرجک کیوں ہوں پھر میں نے گڑیا ارشی اور کاشی کو کوسنا شروع کر دیا اگر ان میں سے ایک آدھ میرے پاس رہ جاتا تو کیا تھا پتہ نہیں یہ تینوں ہنگاموں کے پیچھے کیوں بھاگتے رہتے ہیں!

مگر اس طرح سوچوں سے وقت گزر سکتا تو میں تین دن صرف سوچ سوچ کر ہی گزار دیتا۔ میری نظریں بار بار اندھیرے کی طرف اٹھ جاتیں دماغ میں مختلف خیالات آنے لگتے اور میں کانپنے لگتا۔

لوگ اب بھی یہ سن کر ہنستے ہیں کہ میں ۲۵ سال کا ہو کر بھی ڈرتا تھا ان کا کہنا تھا کہ مجھ میں مردانگی تھی ہی نہیں اگر ہوتی تو میں یوں نہ کانپتا۔ ان کے مفروضات اپنی جگہ لیکن میں اگر اس قدر ڈرپوک نہ ہوتا تو یہ عجیب و غریب آپ بیتی جنم ہی کیوں لیتی جسے شاید کوئی بھی حقیقت نہ سمجھے بہر حال اب میں وہ تمام واقعہ بیان کرتا ہوں جس کے لیے میں نے قلم اٹھایا ہے۔

پہلے تو آپ ہمارے گھر کا نقشہ سمجھ لیجئے۔ تمام گھر دیکھنے کی ضرورت نہیں صرف سامنے والا حصہ ہی سمجھ لینا کافی ہے۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی کھلا لان نظر آتا ہے جس کے آخری سرے پر آم اور یوکلپٹس کے بوڑھے درخت جھوم رہے ہیں۔ آگے گارڈینا ہے جس کے اندر گھاس اور پھول کے تختے لگے ہیں داہنی جانب گیراج ہے۔ گیسٹ روم کا ایک دروازہ برآمدے میں کھلتا ہے اور دوسرا لائبریری میں سامنے والی طرف ایک کھڑکی ہے جو کھلی ہو تو لان کا تمام منظر بخوبی نظر آتا ہے اسی کھڑکی کے نیچے ساتھ ساتھ دو بیڈ بچھے ہیں انہی میں سے ایک پر میں بیٹھا تھا ایک طرف نظر دوڑاتا تو تاریکی میں ڈوبا ہوا پورچ نظر آتا اور دوسری طرف نظر اٹھاتا تو لان پر نظر پڑتی۔

کچھ دیر بعد میری نظر لان کی طرف اٹھی تو میں لرز گیا۔ ایک لڑکی لان میں چہل قدمی کر رہی تھی مگر فوراً میں نے خود کو تسلی دی کہ یہ تو صرف ایک لڑکی ہے اور لڑکی سے ڈرنا کیسا؟ مگر اسی لمحے میں بھول گیا کہ اس وقت ہمارے لان میں بھلا ایک لڑکی کا کیا کام؟ میں نے سوچا کہ تمام گھر میری ذمہ داری میں ہے اس لیے مجھے خوف دور کر کے گھر کی حفاظت کرنی چاہیے یہ سوچ کر میں اٹھا خود کو تسلیاں دیں کہ میں مرد ہوں مرد ہو کر ڈرنا کیسا؟ اور یہی کچھ سوچتا باہر آ گیا۔ "او لڑکی" میں نے برآمدے میں کھڑے ہو کر زور سے آواز دی۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اس وقت میں نے اسے غور سے دیکھا اس کی آنکھیں موٹی اور پلکیں لمبی تھیں جسم چھریرا تھا۔ وہ سراپا سفید لباس میں تھی

اور سفید دوپٹا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا تاثر تھا جسے کوئی ذی ہوش سمجھنے سے قاصر تھا۔

"او ہو ہو۔" اس نے کھنکھناتا ہوا قہقہہ بلند کیا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہو اس عرصے میں میں چلتا ہوا لان تک پہنچ چکا تھا۔ میں گلاب کی جھاڑی کے پاس تھا اور وہ آم اور یوکلپٹس کے درمیان مجھے خواب کی سی کیفیت میں اس کی آواز آئی۔

اس کے ساتھ مجھے تیز خوشبو کا بھبکا آیا ایسی خوشبو میں نے پہلی بار سونگھی تھی۔ میں نے مغربی پھول دیکھے تھے۔ مشرقی بھی سونگھے تھے ہر قسم کے پرفیوم بھی سونگھ چکا تھا مگر یہ کسی اور ہی قسم کی خوشبو تھی جس نے مجھے مدہوش کر دیا اور میں اپنے آپے میں نہ رہا میں نے اس کی آواز سنی جو مجھے دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"مجھے پہچان لو میں تمہارا پیچھا نہ چھوڑوں گی۔ میں تمہاری ہوں صرف تمہاری۔ تمہاری تنہائیوں کا سامان......" اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا اور صبح تک میں بے سدھ پڑا رہا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو گھاس پر پڑا پایا رات کی تمام باتیں میرے ذہن میں چکر لگاتی رہیں اور میں سوچتا رہا وہ کون تھی؟ کون تھی؟ مگر ابھی ڈور کا کوئی سرا بھی میرے ہاتھ نہ آیا۔

میں نے سوچا اب رات میں ہرگز تنہا نہ رہوں گا یہ سوچ کر میں نے نوشی کو فون کیا۔ وہ کہنے لگی۔

"امی تو شار کی شادی میں شرکت کرنے کیلئے چلی گئی ہوں گی؟"

"ہاں امی بھی اور ارشی کاشی گڑیا وغیرہ بھی۔" میں نے جواب دیا۔

"گویا آپ کل رات اکیلے تھے......؟ ناقابل یقین"۔ نوشی نے حسب عادت بات کو مذاق میں اڑا دیا۔

"تقریباً اکیلا ہی تھا۔" میں نے ذو معنی لہجے میں جواب دیا۔

"تقریباً......؟ کیا مطلب؟" نوشی حیران ہو گئی۔

"مطلب یہ ہے کہ میرے پاس ایک لڑکی بھی تھی۔"

"لڑکی......؟" نوشی نے حیرت سے دہرایا۔ "آپ نے یہ لڑکیوں کا چکر کب سے شروع کر دیا ہے۔" وہ پھر چھیڑنے پر اتر آئی۔

"ہر کوئی تمہارے جیسا نہیں ہوتا کہ بات کو مذاق میں اڑا دے میں سیریس ہوں۔" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"آپ اور سیریس؟ ارے جانے بھی دیں۔" نوشی پھر ہنسنے لگی۔

"پلیز نوشی پہلے میری بات بھی سن لو۔" میں نے التجا کی۔

"جی فرمایئے" نوشی کے لہجے میں شوخی تھی۔

"میں چاہتا ہوں آج رات تم اور خالق بھائی میرے پاس آ جاؤ۔"

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

"کیوں؟" وہ حیران رہ گئی۔

"یہ میری درخواست ہے توشی۔ تم اسے رد بھی کر سکتی ہو۔"

"پھر میری طرف سے انکار سمجھئے۔" توشی نے بات ختم کر دی۔

"وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"دراصل ہمارے ہاں کچھ مہمان آ رہے ہیں جو چند روز قیام کریں گے اس لیے میں انہیں چھوڑ کر تو نہیں آ سکتی!" وہ کچھ دیر رکی۔ "آپ آج رات بھی اسی لڑکی کو ہی.........." اس نے ہنس کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"خدا حافظ۔" میں نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

بے بسی سے میرے آنسو نکل آئے' سچ ہے مصیبت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ تو پھر بہن تھی۔ انکار پر خود کو تسلی دی' اب مسئلہ تھا رات کا' دن تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا میں پھر سوچ میں غلطاں ہو گیا اسی فکر و تردد میں شام ہو گئی مگر وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا میں ہمت کر کے اٹھا نہایا اور وقت گزارنے کے لیے لائبریری میں چلا آیا میز پر ایک کتاب پڑی تھی۔ "چڑیلوں اور بدروحوں کے نرغے میں"

یہ عنوان پڑھ کر میں چونک گیا۔ کیا کل رات نظر آنے والی لڑکی کوئی چڑیل یا بدروح تھی مگر میں مافوق الفطرت باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ مگر وہ کون ہے؟ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے یہاں نہیں دیکھا تھا اگرچہ ان پانچ برسوں میں جو میں نے آکسفورڈ میں گزارے یہاں کئی نئے مکان بن گئے تھے اور کئی نئے لوگ آئے تھے ممکن ہے میں نے کبھی غور نہ کیا ہو مگر وہ اس کا لباس؟ وہ تو ریشمی تھا اس پہ موتی ٹانکے ہوئے تھے۔ وہ مردہ ہرگز نہ ہو سکتی تھی پھر مردہ یہاں کہاں۔ ہمارے گھر سے نزدیک ترین قبرستان تقریباً چار کلو میٹر کے فاصلے پر تھا بالفرض اگر وہ مردہ ہی تھی تو کیا اسے راستے میں اور کوئی گھر نہ ملا۔ کیا میرے پاس ہی اس نے آنا تھا؟ میں سوچوں میں الجھتا گیا سر جھٹک کر میں نے الماریوں کی طرف نظر دوڑانی شروع کر دی اٹھ کر ایک کتاب نکالی اور اس کے مطالعے میں مصروف ہو گیا مگر میں ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا ہر فقرہ یوں محسوس ہوتا گویا میرے اور اجنبی لڑکی کے جذبات کی عکاسی کر رہا ہے ہر فقرے پر سوچ بھٹک کر اس طرف جا نکلتی اور میں جھنجلا کر رہ جاتا۔

باہر دیکھا تو رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا میں نے تمام گھر کا چکر لگایا اور سب کھڑکیاں دروازے بند کر دیئے پھر خود گیسٹ روم میں آ کر بیٹھ گیا کھلی کھڑکی سے لان کا تمام منظر بخوبی نظر آ رہا تھا جوں جوں وقت گزر رہا تھا میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور اس چاندنی میں میں منظر کا شیدائی تھا اور چاندنی راتوں میں گھنٹوں بیٹھا ٹکٹکی باندھے چاند کو دیکھا کرتا تھا حتیٰ کہ چاند اپنا چہرہ چھپا لیتا مگر آج......! آج اسی منظر سے مجھے خوف معلوم ہو رہا تھا ہر چیز پراسرار اور اجنبی سی لگ رہی تھی میں یہی سوچ رہا تھا کیا وہ اب آ جائے گی۔ میرا

جی چاہ رہا تھا اب وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے اور میں کل کی بات کو اپنا خواب سمجھ کر بھول جاؤں۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میری نظریں ان دو بوڑھے درختوں پر لگی ہوئی تھیں جن کے درمیان کل رات میں نے اسے دیکھا تھا وقت بڑی آہستگی سے رینگ رہا تھا بالآخر دس بج گئے۔ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو گئیں اور دماغ سوچ سوچ کر شل ہو گیا سر میں درد سا محسوس ہونے لگا مگر میری نیم وا آنکھیں بدستور انہی درختوں پر تھیں...... اچانک آم کے بوڑھے درخت سے کوئی چیز چھم سے نیچے گری میں نے اتنی دور بیٹھے ہوئے بھی یہ آواز سن لی میری ادھ کھلی آنکھیں پوری کھل گئیں میرے خدا! یہ تو وہی تھی وہی سفید موتیوں والا سفید لباس اور لٹھے کی طرح دھلا ہوا چہرہ۔ میرا رنگ زرد ہو گیا۔ خوف سے خون رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہوا وہ بالکل کل کی طرح لان میں ٹہلنے لگی ایک لمحے بعد وہ غائب ہو گئی۔

ابھی میں اپنی سانسیں درست بھی نہ کر پایا تھا کہ مجھے وہی خوشبو آئی۔ وہی تیز خوشبو جو انسان کو مدہوش کر دیتی تھی۔ اور پھر وہی لڑکی میرے سامنے کھڑی تھی اس نے پورا منہ کھول کر فلک شگاف قہقہہ لگایا اس کے سفید دانت چمکنے لگے میں نے اتنے چمکیلے دانت کسی انسان کے نہ دیکھے تھے۔ "میں آ گئی ہوں ڈارلنگ" مجھے اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی اور پھر میں گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ "اونہہ۔ کرنے چلے تھے گھر کی حفاظت۔ ایک لڑکی کو دیکھ کر اتنا غفیل ہو گئے۔" میں نے کسی کی طنزیہ آواز سنی اور پھر سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کی صلاحیت سے بے نیاز ہو گیا۔

کال بیل کی تیز آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا میں کسی شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور گیٹ تک بمشکل پہنچا۔ کھولا تو جمیل کو سامنے پایا۔ "کم ان جمی" میں نے اپنی تمام پریشانیاں بھلا کر خود کو حیرت انگیز طور پر نارمل کر لیا اور جمیل کو اندر لا کر تمام واقعات اسے سنا دیئے پہلے تو وہ ایک لمحے کو بھونچکا ہو گیا۔ "سچ کہہ رہے ہو آشی؟" پھر ہنس کر کہنے لگا:

"مزے ہو گئے تمہارے تو بیٹھے بٹھائے ایک عدد وہ مل گئی عیش کرو آشی! بھلا ایک لڑکی سے ڈرنا کیسا؟" پھر مجھے سمجھانے لگا۔ "اس سے اس کا نام پوچھنا۔ حدود اربعہ جغرافیہ معلوم کرنا اسے بانہوں میں لے لینا اور کسی قسم کا ڈر محسوس نہ کرنا تم دیکھ رہے ہو آشی ان دو راتوں میں وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی۔ گھر کی تمام اشیاء بھی بقول تمہارے ویسے ہی پڑی رہتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا مقصد تمہیں خوفزدہ کرنا یا تمہارے گھر کی کوئی چیز غائب کرنا نہیں بلکہ وہ خلوص دل سے تمہاری تنہائیوں کا سامان ہے ورنہ تم اس کے ہاتھوں بالکل بے بس ہو وہ تمہیں جو نقصان چاہے پہنچا سکتی ہے......"

میں دیر تک اپنے جگری دوست اور لنگوٹیے یار کی تقریر سنتا رہا وہ نہایت ہمدردانہ لہجہ اختیار کیے ہوئے تھا جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

"لیکن جی یہ بات میرے بس میں کہاں ہے؟ میں تو اس خوشبو کو سونگھتے ہی غنودگی میں چلا جاتا ہوں میرا دماغ بالکل ماؤف ہو جاتا ہے۔"

"تم خود کو بیدار رکھنے کی کوشش کرو۔ تم صرف خوف سے بے ہوش ہو جاتے ہو یہ اس خوشبو کا قصور نہیں ہے تمہارے حواس کا ہے تم اسے گوشت پوست کی لڑکی اور اپنی واقف کار سمجھ لو مجال ہے جو خوف تمہارے نزدیک بھی آسکے۔" جمیل نے کہا۔

"تم تو کافی تجربہ کار معلوم ہوتے ہو؟" میں نے جمیل سے کہا۔

"تجربہ کاری کی بات نہیں۔" وہ مسکرا اٹھا۔ "یہ نفسیاتی بات ہے نفسیات سمجھو سیدھی سی بات ہے رات کا وقت تھا تم پہلی دفعہ تنہا تھے ایسے میں ایک اجنبی لڑکی اور وہ بھی کسی الٹے سیدھے لباس میں نظر آئے تو خوفزدہ ذہن بدروحوں اور چڑیلوں تک پہنچے گا۔ تو کہاں تک جائے گا رات کے اندھیرے میں تو خوف درخت کو بھی جن بھوت بنا کر پیش کر دیتا ہے چڑیلوں وغیرہ پر میرا یقین بھی پختہ نہیں اور چڑیلیں اور بدروحیں انسانوں کو اپنا جسم پیش نہیں کرتیں بلکہ نقصان پہنچانے کے درپے رہتی ہیں جہاں تک میرے مطالعے اور معلومات کا تعلق ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ان کا کوئی وجود ہے بھی تو سراپا رحم نہیں بلکہ ظلم کی حد سے بھی باہر ہے۔"

میں نے جمیل کی تمام باتوں کو بغور سنا بے شک وہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا ایسے ہمدرد دوست کی قربت سے مجھے یک گونہ سکون ملا میں نے جمیل سے کہا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم آج رات میرے ساتھ سو جاؤ صرف آج رات کی بات تو ہے کل تو امی وغیرہ آجائیں گی۔"

"نہیں" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ "دو باتیں ایک تو یہ کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری گفتگو کا تم پر کیا اثر ہوا دوسرے یہ کہ اگر وہ تمہاری واقعی خیر خواہ ہے تو کبھی بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی بشرطیکہ تم اسے مایوس نہ کرو خواہ تمہاری امی ہی کیوں نہ آجائیں۔"

شاید ابھی جمیل کچھ اور کہتا مگر میری خوفزدہ نگاہیں دیکھ کر اس نے اپنی نظریں بھی کھڑکی کی طرف کر دیں جہاں میرون کلر کے پردے پیچھے چوڑا سا کاغذ صاف نظر آ رہا تھا۔ "وہ...... وہ کاغذ...... پہلے تو...... تو یہاں نہیں تھا۔" میں نے بمشکل کہا' جمیل نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا اب کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر نمایاں تھی۔

تمہارے ہمدرد اور رازداں دوست جمیل کی تمام باتیں حرف بحرف درست ہیں!

فقط تمہاری دوست

میں نے حیرت سے جمیل کی طرف دیکھا وہ بھی حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہا تھا جمیل نے زور زور سے سانس لینا شروع کر دیئے پھر چاروں طرف گھوم کر مجھ سے کہنے لگا۔ "سونگھو آشی...... عجیب سی خوشبو کا ہلکا سا احساس ہوتا ہے۔" میں نے غور کیا تو واقعی بالکل ویسی ہی خوشبو

کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ جمیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی سے پوچھا۔

"ایسی ہی خوشبو تھی آشی۔"

"ہوں بلکہ وہ تیز بہت تھی۔" میں نے ویسے ہی سونگھتے ہوئے کہا۔

"اچھا آشی میں چلتا ہوں اگر رات تم واقعی خوفزدہ ہو گئے تو چیخنے کی کوشش کرنا میں تمہارے گھر کے باہر موجود ہوں گا اور خوفزدہ بالکل نہ ہونا۔" اس نے میری طرف دیکھ کر الماری کی طرف دیکھا اسے استعمال کرنا۔" میں نے دیکھا وہاں ابو کا کیمرہ رکھا ہوا تھا میں اس کی بات سمجھ گیا۔ اس لیے سر ہلا دیا۔

وقت بڑی آہستگی سے رینگ رہا تھا اور میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا خدا خدا کر کے شام ہوئی میں نے کیمرہ پکڑ لیا اور ریل چیک کی جو ابھی دنوں غالباً ابو نے ڈلوائی تھی۔ پھر میں کیمرہ اٹھائے باہر آ گیا۔ گو کہ میرا خیال تصویریں بنانے کا نہیں تھا تاہم جب میں نے ڈوبتے سورج کی مدہم کرنوں کو آم اور یوکلپٹس کے درمیان دیکھا تو جی چاہا کہ ایک عدد فوٹو کھینچ لوں۔

میں نے کیمرہ درست کیا اور ایک تصویر لے لی نیچے پھولوں کا تختہ تھا اور اس کے دونوں طرف آم اور یوکلپٹس کے درخت تھے سورج ڈوب رہا تھا۔

شام ہو گئی۔ کچھ کھانے کو جی نہ چاہا میں نے سب کمرے بند کیے ایک ایک جگہ کو اچھی طرح جانچا اور گیسٹ روم کے اسی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

باقی دنوں کے معمول کی طرح اس روز بھی مجھے چھم کی آواز سنائی دی میں نے کیمرہ کھڑکی میں رکھ دیا اس طرح کہ سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی تصویر بآسانی لی جا سکتی پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مترنم سی آواز میں کہا ہو۔ "مے آئی کم ان"

"کم ان ڈارلنگ" میں نے جمیل کی گفتگو ذہن میں دہراتے ہوئے کہا۔

"اوہو ہو" خوشبو کے زبردست جھٹکے کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ "تو تم نے مجھ سے دوستی کر ہی لی۔"

"جی ہاں" میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"میں واقعی بہت تنہا ہوں مجھے کسی ساتھی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔"

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اف میرے خدا اس کا ہاتھ برف کی طرح یخ تھا میرے سارے بدن میں برقی رو دوڑ گئی اور میں سر تا پا کانپ گیا۔

"تشریف رکھیے" میرے دانت یوں بجے جیسے سخت سردی میں کپڑوں کے بغیر کھڑا کر دیا گیا ہوں وہ بھی بیٹھ گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی موٹی موٹی غلافی آنکھوں سے کمرے کی چیزوں کو متجسس نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ اپنا نام تو بتایئے؟" میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

"میرا نام...... مجھے نگینہ کہتے ہیں" اس نے مسکرا کر بتایا۔

"آپ کہاں سے آئی ہیں؟ میرا مطلب ہے کہاں رہتی ہیں؟" میں گڑبڑا گیا۔

"سوچئے تو ہر جگہ۔ دیکھئے تو کہیں نہیں" اس نے مہمل سا جواب دیا۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب ہے اگر آپ سے کہوں کہ میں بوڑھے آم اور یوکلپٹس پر رہتی ہوں مگر نظر نہیں آتی تو آپ یقین نہیں کریں گے کیونکہ میں نظر نہیں آتی ہوں۔" اس نے تفصیلاً جواب دیا۔

"آپ مجھ جیسی انسان تو نہیں ہیں؟" ایک اور سوال کیا گیا۔

"جی نہیں" وہ مسکرائی۔ بعد میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ مسکراتے رہنا اس کی عادت ہے کیونکہ وہ تمام وقت مسکراتی رہتی تھی۔

"چائے پئیں گی؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں میں چائے نہیں پیتی۔" جواب ملا۔

"دودھ تو پی لیتی ہوں گی؟" میں نے پرامید نظروں سے دیکھا۔

"مجھے کھانے پینے کا مت کہیے میں ان باتوں سے بے نیاز ہوں۔" وہ الجھ گئی۔

"کیا مطلب؟ یعنی...... یعنی...... آپ بغیر کھائے پیئے زندہ رہتی ہیں؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"سنیئے۔ میری باتوں کو سنجیدگی سے سنیئے اور ان پر یقین کیجئے۔ میں آپ جیسی انسان ہرگز نہیں۔ میں بغیر کھائے پیئے زندہ رہتی ہوں اپنی مرضی سے غائب بھی ہو سکتی ہوں اور نظر بھی آ سکتی ہوں میں جس جنس سے تعلق رکھتی ہوں اس کے بادشاہ کی بیٹی ہوں اور اپنے باپ کی اجازت سے آپ سے ملنے آتی ہوں اس سے زیادہ مجھ سے کچھ مت پوچھئے۔ آپ نے تو مکمل انٹرویو لینا شروع کر دیا ہے۔" وہ بولتی چلی گئی۔

"بہت بہتر میں اب کچھ بھی نہ پوچھوں گا" میں نے آہستگی سے کہا۔

پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی تصویر آ چکی ہو گی۔

"اگر میں آپ سے ملنا چاہوں۔ یعنی رات سے پہلے...... تو" میں نے پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

"میرا خیال ہے آپ کو اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، پھر آپ جو مجھ سے کہنا چاہیں اسی وقت کہہ لیا کریں"۔ نگینہ نے تجویز پیش کی۔ "آپ ہوتی تو یہیں ہیں ناں؟" میں پوچھ بیٹھا۔

"ضروری نہیں کبھی کبھار میں حکومت کے کاموں میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹا دیا کرتی ہوں اس صورت میں میں یہاں نہیں ہوتی"۔ اس نے جواب دیا۔

"آپ بھی تو کچھ کہیں اتنی دیر سے میں یہ باتیں کیے جا رہا ہوں"۔ جب مجھے کوئی بات نہ سوجھی تو میں نے کہا۔

"میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آیا یہ کیمرہ میری تصویر لینے کے لیے رکھا گیا ہے؟" اس نے کیمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے کیمرہ ہاتھوں میں لے لیا۔ "لیکن اگر آپ پسند کریں تو میں کھینچ لوں۔"

"اوہ نو! اس کی خاص ضرورت نہیں۔" اس نے مخصوص انداز میں کہا۔

"آپ غالباً ہر کام ضرورت کے تحت کرتی ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "اشعر! آپ پھر میری ذات کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔" وہ کچھ ناراض معلوم ہوتی تھی۔

"سوری۔ میں بھول گیا تھا۔"

مجھے حیرت تھی کہ آج میں نارمل کیوں ہوں۔ میں بے ہوش کیوں نہیں ہو گیا۔ وہی خوشبو میرے چاروں طرف پھیلی تھی۔ وہی لڑکی میرے پاس تھی مگر آج میں مکمل ہوش و حواس میں تھا جمیل کا کہنا تھا کہ میں اسے گوشت پوست کی لڑکی سمجھ لوں تو ڈروں گا نہیں لیکن اس نے خود اقرار کیا تھا کہ وہ انسانوں میں سے نہیں پھر بھی میں مطمئن کیوں تھا میں خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"کوئی بات تو کیجئے۔" نگینہ کی آواز سے سوچ کا سلسلہ دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا۔

"میں کیا بات کروں۔ بولنے لگوں تو آپ کی ذات تک جا پہنچتا ہوں۔ کھانا پینا آپ پسند نہیں فرماتیں۔ آپ ہی کوئی بات کیجئے۔" میں نے اس کی خواہش اسی کو واپس لوٹا دیا۔

"اچھا پھر آپ لیٹ جائیں۔ غالباً آپ کو نیند آ رہی ہے۔" نگینہ نے اپنے خیالوں کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے کہا۔

میں لیٹ گیا وہ میرا سر دبانے لگی جونہی اس کا ہاتھ میری پیشانی سے مس ہوا میں کانپ گیا پورے جسم میں سردی اور بجلی کی شدید لہر دوڑ گئی۔ آہستہ آہستہ میں غنودگی میں چلا گیا۔

مجھے زبردست جھٹکا لگا اور میں حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گیا کمرے میں میں تنہا تھا گیسٹ روم کا دروازہ کھلا تھا صبح کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ بیل نے مجھے متوجہ کر لیا۔ گیٹ کھولا تو جمیل کھڑا تھا اس نے میری طرف دیکھتے ہی پوچھا "رات کیسی گزری آشی؟"

"اب میری بھی سنو آشی۔" جمیل نے کہنا شروع کیا۔ "رات میں دس بجے کے قریب تمہارے گھر آیا تھا ابھی میں گیٹ کے قریب بھی نہیں پہنچا تھا کہ میرے منہ پر کسی کا زوردار تھپڑ پڑا میں نے مڑ کر دیکھا تو سرخ رنگ کا لبادہ اوڑھے ایک بدصورت عورت کھڑی تھی۔ اس کے گلے میں ننھی ننھی کھوپڑیوں کا ہار تھا اور وہ غضبناک نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔"

جمیل چپ ہو گیا۔ میں سوچوں میں کھو گیا جمیل کی آواز نے مجھے جلدی ہی سوچوں سے نجات دلا دی۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

"چلو آشی۔ ٹیکنیو ایکسپوز کرالیں۔"

میں نے کیمرہ اٹھالیا۔ ریل نکالی اور جمیل کے ساتھ چل پڑا۔ اچھرے کا ایک فوٹوگرافر جمیل کا دوست تھا۔ جمیل نے ریل اسے دے دی۔

میں گھر آگیا میرا خیال تھا امی آگئی ہوں گی مگر مجھے حیران ہو جانا پڑا کہ گھر بالکل سنسان تھا۔ ابھی میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ امی کیوں نہیں آئیں کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ہیلو اشعر سپیکنگ!" میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

"ہیلو اشعر خیریت سے گزر رہی ہے؟"

میں آواز پہچان گیا۔ وہ امی تھیں۔

"جی ہاں امی۔ آداب!"

"سنو اشعر نثار کی دلہن کے نانا کا انتقال ہو گیا ہے اب اس کی شادی ایک ماہ بعد ہو گی اگر تم چاہو تو ہم یہ ایک ماہ یہیں رہ لیں۔" امی مطلب پر آئیں۔

"جی امی میری طرف سے آپ بے شک دو ماہ رہیں مگر آپ اتنا عرصہ وہاں کیا کریں گی بہتر یہی ہے کہ واپس ہی آجائیں۔" میں نے رائے دی۔

"کراچی دور سے روز روز آیا بھی تو نہیں جاتا۔" امی نے کہا "چلئے پھر جو آپ کی مرضی" اور میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اس رات پھر خوشبو کے ساتھ نگینہ آئی۔ ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ رات گزر گئی اور میں بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ مجھے سمجھ نہ آتی تھی کہ میں نگینہ کے جانے سے پہلے سو کیوں جاتا ہوں۔ وہ میری موجودگی میں کیوں چلی نہیں جاتی؟؟...... نگینہ بلاشبہ بے حد خوب صورت تھی اس کا لباس بھی زیادہ قابل اعتراض نہیں تھا بس صرف اس کی موجودگی میں مجھے ایک بات سے الجھن ہوتی تھی کہ اس کا جسم بہت سرد تھا اگر کبھی وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی تو میرے بدن میں سردی کی شدید لہر دوڑ جاتی اور میرے لیے خود کو نارمل رکھنا دشوار ہو جاتا۔

صبح ہی صبح جمیل آگیا۔

"میرے ساتھ فراڈ کرتے ہو۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا اور پھر ایک لفافہ میری طرف پھینک دیا یہ تصویروں والا لفافہ تھا میں نے کھول کر دیکھا۔ کچھ تصویریں ابو نے کھینچی تھیں ایک ڈوبتے سورج کی تصویر تھی۔ اور آخری تصویر...... آخری تصویر میں گیسٹ روم کا ایک بیڈ تھا۔ دو کرسیاں تھیں۔ دیوار پر لگی سینریاں اور کیلنڈر تھے مگر نگینہ نہیں تھی میں پریشان ہو گیا۔

"یقین کرو جمی میں نے خود تصویر کھینچی تھی یہ میرے بیڈ کے پاس سفید دھبہ دیکھ رہے ہو نا! یہیں وہ بیٹھی تھی اب کیمرے کی آنکھ میں نہیں آئی تو میرا کیا قصور؟" میں نے بڑی بے چارگی سے کہا۔

جمیل روٹھا روٹھا کھڑا ہوا۔

رات کو حسب معمول نگینہ آگئی۔

"آج ہم تصویریں کھینچیں گے۔" میں نے کیمرا پکڑ کر کہا۔

"بے فائدہ ہو گا اشعر میں کیمرے کی نگاہوں میں نہیں آسکوں گی۔" نگینہ نے کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"کیوں؟" مجھے اچنبھا ہوا۔

"تم دھوئیں کی تصویر لے سکتے ہو؟" نگینہ "مگر میری بد قسمتی دیکھو کہ تمہاری تصویر نہیں آئی۔" میں نے سر پٹک کر کہا۔

"چھوڑو اس ذکر کو اشعر! یہ سب بے کار ہے۔" وہ ایک ادا سے بولی۔

نگینہ نے اسے بے کار کہا تو میں نے جمیل کا واقعہ سنا دیا اور پوچھا۔ "کیا تم اس سرخ لبادے والی ڈائن کو جانتی ہو؟"

"اسے ڈائن مت کہو اشعر۔ وہ میری گارڈ تھی"

نگینہ مسکرائی۔ دن بے رونق اور راتیں نگینہ کی قربت میں گزرتی گئیں۔ جمیل اس دن کے بعد نہیں آیا تھا۔ میں نے اس کے گھر فون کیا تو پتہ چلا وہ کراچی چلا گیا ہے۔

'مجھ سے ملے بغیر، میں بڑبڑایا' مجھے بتائے بغیر...... وہ یقیناً مجھ سے ناراض ہو گا...... ورنہ یہ کیسے ممکن ہے، میں سوچتا گیا۔

اس رات نگینہ نے مجھے بتایا۔

"جمیل کو بھول جاؤ اشعر وہ اب کبھی نہیں ملے گا۔ دنیا کے کسی کونے میں کسی گوشے میں جمیل کا وجود نہیں میں اپنی راہ میں ٹانگ اڑانے والے کا یہی حشر کرتی ہوں اور تم...... تمہیں تو میں نے خود منتخب کیا ہے۔"

میں اس کے یہ فقرے کبھی بھول نہیں سکا اور نہ بھول سکوں گا جمیل کی یاد کے ساتھ ہی مجھے اپنی ذات پر بوجھ سا محسوس ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں میں جمیل کا قاتل ہوں کیونکہ اس کے بعد واقعی جمیل مجھے کہیں نظر نہیں آیا اس کے والدین چیختے چلاتے ملک کے کونے کونے میں پھر سے اور آخر کار میرا اور ان کا رابطہ منقطع ہو گیا میرا جگری یار۔ میرا مخلص دوست میری وجہ سے چھن گیا وہ میری خاطر جان پر کھیل گیا اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔

ایک دن نگینہ کہنے لگی۔

"اشعر مجھے یقین نہیں تھا کہ تم والدین کی آمد کے بعد بھی مجھ پر توجہ دو گے اس لیے میں نے شادی رکوا دی تاکہ وہ زیادہ عرصہ وہاں رہیں اور اس مدت میں تم مجھے سمجھ لو۔"

راتیں دنوں میں تبدیل ہوتی گئیں اور دن رات کے قالب میں ڈھلتے گئے۔ ایک ماہ کے

Uploaded By Muhammad Nadeem ندیم

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا اور امی آ گئیں۔ رات کو سب بہن بھائی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے نوشی اور خالق بھائی بھی تھے اور ابو بھی اس دن ٹور سے واپس آئے تھے امی کہنے لگیں۔

"ہے ہے کیسی بری موت تھی اس بڈھے کی۔"

"کون سا بڈھا؟" میں نے پوچھا۔

"ارے وہی دلہن کا نانا۔" امی نے بتایا۔

"کیوں کیا ہوا؟" مجھ سے رہا نہ گیا۔

"بس رات کو بستر سے اٹھا ممکن ہے چکر آ گیا ہو وہیں گر گیا۔ کمزور سا تو تھا۔ وہیں سر [illegible] ہو گیا۔ شکل نہ پہچانی جاتی تھی" امی نے تفصیلاً بتایا۔

"ممکن ہے اسے کسی نے دھکا دیا ہو۔" میں نے غور سے امی کی طرف دیکھا۔

"ہاں ہاں! تو ہی تو گیا تھا دھکا دینے۔" امی چڑ گئیں پھر بات پلٹ کر بولیں "آشی! اس ایک مہینہ میں تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"کیوں مجھے کیا ہوا؟" میں نے اپنے سراپا پر نگاہ ڈالی۔

"میں تو تجھے دیکھ کر بڑی حیران ہوئی ہوں حلیہ تو دیکھو اپنا۔"

میں نے اس دن پہلی مرتبہ آئینے کے سامنے خود کو ہر زاویے سے جانچا امی کی حیرانی بجا تھی بال بے حد بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخ تھیں جو بے خوابی کی چغلی کھا رہی تھیں اور شیو بھی بڑھا ہوا تھا۔

صبح میں اپنا حلیہ درست کرنے لگا۔ شیو کرنے کی غرض سے شیور اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ پھر سرگوشی سے کہا۔ "چھوڑیں اشعر۔ آپ یونہی خوب صورت لگ رہے ہیں۔"

میں سمجھ گیا۔ وہ نگینہ تھی۔

اور پھر جیسے میں پاگل ہو گیا شیو کرنا چھوڑ دیا ہر کسی کی طرف سرخ آنکھوں سے گھورا کرتا اور وہ ڈر جاتا ابو ہر بڑے ڈاکٹر، حکیم، پیر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا اس کے دماغ میں رسولی ہے حکیموں نے کہا جگر پر ورم ہے۔ پیروں نے بتایا کہ کسی جن کا سایہ ہے۔

مگر میں ان سب باتوں کو غلط سمجھتا رہا۔ میرا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ آم اور یوکلپٹس کے درختوں سے مجھے عشق ہو گیا۔ سارا وقت انہی کے نیچے بیٹھا نگینہ سے باتیں کرتا رہتا وہ کبھی جواب دیتی کبھی نہ دیتی مگر میں مسلسل بولتا چلا جاتا۔

پھر ایک دن میں نے ارشی اور کاشی کو بلایا۔ کہا۔

"ارشد۔ کاشف۔ میری باتیں غور سے سنو۔ ڈاکٹروں پیروں اور حکیموں کی باتوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دو۔ فوق الفطرت اور ماورائی انسانوں کے وجود پر یقین رکھو۔ آج کل نگینہ نام کی ایک نہ

نظر آنے والی لڑکی میری دوست ہے اس کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتے ہو تو گیسٹ روم کے بائیں کونے سے اس کی مخصوص خوشبو سونگھ لو۔"

ارشی اور کاشی چپکے سے اٹھ کھڑے ہوئے صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے میری باتوں پر یقین نہیں کیا۔

اور اب تو امی۔ گڑیا۔ کاشی۔ ارشی سب کا یہی خیال تھا کہ میں کسی ماورائی طاقت کے چنگل میں پھنس گیا ہوں امی نے خود کو مورد الزام ٹھہرایا۔

"کاش میں آشی کو تنہا نہ چھوڑ کر جاتی۔"

پھر ابو نے کسی ایسے شخص کو بلایا جو اس بات کا دعوے دار تھا کہ جن بھوت اتار سکتا ہے اس نے میرے بارے میں ساری باتیں سنیں تو فیصلہ دے دیا کہ دونوں بوڑھے درختوں کو کٹوا کر وہاں پورا ایک ماہ تک لوبان سلگائے رکھا جائے اور مجھے ان کے قریب نہ جانے دیا جائے۔

ابو نے اگلے ہی روز لکڑ ہارے بلوا لیے جنہوں نے درخت کاٹنے شروع کر دیے۔ اچانک میرے نتھنوں سے وہی خوشبو ٹکرائی اور پھر نگینہ کی سرگوشی سنائی دی۔ "میں تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں اشعر تم نے اپنی آنکھوں کے سامنے میرا ٹھکانہ کٹوا دیا ہے اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے"

اس بات کو سن کر میں جیسے پاگل ہو گیا دوڑ کر ابو کو گریبان سے پکڑ لیا اور زوردار دھکا دیا۔ ارشی اور کاشی قریب کھڑے تھے ارشی کو ایک ٹھوکر رسید کی وہ الٹ کر گرا۔ کاشی کے منہ پر گھونسوں کی بارش کر دی وہ بھی تیورا گیا۔ یہ سب کچھ اتنا فوری ہوا کہ کسی کو کچھ سوچنے کی مہلت نہیں ملی ابو کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور ایک طرف ارشی اور کاشی گرے پڑے تھے۔

کاش میں باپ کی شان میں گستاخی نہ کرتا مگر میں تو اس وقت جنونی ہو رہا تھا مجھے اردگرد کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں حلفاً کہتا ہوں کہ مجھ پر کسی جن وغیرہ کا سایہ نہیں تھا میں نے جو کیا اس میں کسی کی مرضی کا دخل نہیں تھا لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے کہ مجھ پر جن سوار تھا اور وہی مجھ سے یہ کام کروا رہا تھا اگر یہ بات تھی تو مجھے یاد کیوں ہے میں نہ صرف مکمل ہوش و حواس میں تھا بلکہ سب بخوبی دیکھ بھی رہا تھا میں اپنی اس جنونی کیفیت کو آج تک کوئی نام نہیں دے سکا۔

جب میں نے کسی کو مقابلے پر نہ پایا تو ایک بڑھئی کو زور سے جھٹکا دیا۔ اور اس پر تابڑ توڑ مکے رسید کیے پھر دوسرے بڑھئی سے آری چھین لی اور اس پر بھوکے شیر کی طرح جھپٹا وہ آری چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

اتنے میں امی بھی اندر سے آ گئیں اور ارشی۔ کاشی اور ابو بھی اٹھ کھڑے ہوئے چاروں نے یک لخت مجھ پر حملہ کر دیا اور میں ان کے قابو میں آ گیا۔

پھر سب نے مل کر مجھے رسیوں سے جکڑ لیا۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اف کس قدر تکلیف دہ لمحات تھے وہ۔ میری آنکھوں کے سامنے نگینہ کا نشیمن تباہ کیا جا رہا تھا اور میں رسیوں میں جکڑا ہوا غضبناک نگاہوں سے سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سرسبز گھاس مجھے کانٹوں کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ میرے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آنکھیں انتہائی سرخ تھیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ مکمل مجذوب تھا۔ کربناکی کا ایک ماہ گزر گیا یہ ایک ماہ کئی صدیوں پر محیط تھا سارے گھر میں ہر وقت لوبان کی بو رچی رہتی ابو سر پر پٹی باندھے اس کی ہمہ وقت نگرانی کرتے اور میں رسیوں میں بندھا پیچ و تاب کھاتا رہتا۔

اور پھر مجھے آزادی مل گئی مسلسل جکڑے رہنے کی وجہ سے میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ رسیوں کے نشانات جلد میں کھب گئے تھے اور سوجن بھی بہت تھی۔

نگینہ اس دن کے بعد نہیں آئی۔

میری مجنونانہ سرگرمیاں بھی بتدریج کم ہوتی چلی گئیں اور جب میں مکمل ہوش میں آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ابو کا انتقال ہو چکا ہے اور ارشی کی شادی ہو چکی ہے۔ کاشی امریکہ جا چکا تھا بس گھر میں صرف امی اور گڑیا ہی رہ گئیں وہ بھی مجھ سے ڈری ڈری رہتی تھیں۔

جب مجھے اپنی زیادتیوں کا احساس ہوا تو میں نے ندامت محسوس کی۔ امی سے معافی مانگی ارشی کے گھر گیا اور اس کے قدموں پر گر پڑا۔ ابو کی قبر پر بیٹھا گھنٹوں روتا رہا جیسے وہ آج مجھے چھوڑ کر گئے ہیں۔

امی نے مجھے معاف کر دیا مگر حالات معمول پر نہ آسکے میں نے حصول ملازمت کے لیے بہت دھکے کھائے مگر شنوائی نہ ہوئی۔

ایک روز میں تشویشناک حالت میں بیٹھا تھا۔ وہی گیسٹ روم تھا۔ وہی اشیاء کی ترتیب تھی مگر پردے میرون کی بجائے نیلے رنگ کے تھے انہی رنگ کے پردوں کے پیچھے مجھے ایک کاغذ چسپاں نظر آیا میں نے پردہ ہٹا دیا۔ لکھا تھا۔

> تم نے کیا مجنونانہ حالت بنا رکھی ہے میں نگینہ ہوں مجھ سے تمہاری حالت نہیں دیکھی جاتی اس لیے اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں اپنی دنیا میں لے جاؤں جہاں نہ تمہارا کوئی بھائی ہو نہ ماں اور نہ ہی بہن۔ بس میں ہوں اور تم! اپنی رائے سے جلد آگاہ کرنا۔
>
> فقط تمہاری دوست

خط پڑھ کر میں دیر تک سوچوں میں غلطاں رہا میں نے تصور میں خود کو جنوں کے ہاتھ دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں گلیوں بازاروں میں تنہا پھر رہا ہوں میرے پیچھے نگینہ ہے۔ مکانات ہیں مگر ان میں رہنے والے غائب ہیں۔ بازار اشیاء سے بھرے پڑے ہیں مگر کوئی دکاندار نظر نہیں آتا۔ دراصل وہ سب غائب تھے چند لمحوں بعد نگینہ بھی غائب ہو گئی اور میں اکیلا رہ گیا۔

"نہیں نہیں میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ یہاں میں بہن بھائیوں اور ماں باپ کے ہوتے ہوئے اکیلا ہوں وہاں بھی اکیلا ہوں گا میں یہیں ٹھیک ہوں" میں نے فیصلہ کر لیا۔ اور پھر میں نگینہ کو رائے سے آگاہ کیسے کروں گا یہ تو ناممکن ہے کہ میں بھی اسی طرح کا ایک کاغذ پردے کے پیچھے رکھ دوں اور وہ پڑھ لے۔

جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں بھائیوں کے ٹکڑوں پر پڑا ہوں اعلیٰ ڈگریاں تو ابو کی زندگی اور ہوشمندی کی حالت میں حاصل کر لی تھیں مگر کوئی معقول ملازمت ملنے کی سبیل نظر نہ آتی تھی چنانچہ میں نے سوچا کوئی کری پڑی ملازمت کر لی جائے تاکہ اپنا بوجھ تو خود سہار سکوں بس یہی سوچ کر میں نے آپ کے آفس میں کلرک بننے کی درخواست دے دی اور خدا کی قدرت دیکھئے کہ میری درخواست چند روز بعد قبول ہو گئی مگر اب میرا کسی بات میں جی نہیں لگتا۔

فائل اٹھاتا ہوں تو بغیر دیکھے رکھ دیتا ہوں دیکھئے کب تک اس طرح گزر بسر ہوتی ہے۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

منحوس کھوپڑی

میں اور جمیل کلاس فیلو تھے۔ تعلیم ختم ہونے کے فوراً بعد وہ بے روزگاری سے تنگ آ کر شیلانگ چلا گیا جہاں اس کو بنک میں ملازمت مل گئی لیکن میں اپنی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا جس کی ممتا میری ترقی کے راستوں میں زبردست رکاوٹ تھی۔

۱۹۵۰ء میں جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا اور میں نہایت دل برداشتہ اور آزردہ خاطر رہنے لگا تو انہی دنوں جمیل کا خط آیا۔ گویا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلا بھیجا کیونکہ اس کے ماتحت بنک میں ایک جگہ خالی تھی۔ میں نے آسام جانا ہی مناسب سمجھا اور اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر جمیل کے پاس چلا گیا۔

مجھے اپنی نوکری پر بحال ہوئے تین مہینے گزر گئے جمیل میری ہمدردی اور دل جوئی میں برادرانہ الفت کا ثبوت دیتا رہا۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے تاہم میری اداسی دور نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ جمیل کی آسامی بیوی بانو تھی۔

بانو نہایت بد مزاج اور تند خو عورت تھی۔ وہ میری اور جمیل کی دوستی سے بد ظن تھی۔ لہٰذا میرے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتی۔ گو جمیل اس کی باتوں کو کچھ اہمیت نہ دیتا اور ہر ممکن طریقے سے مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا مگر ہر وقت کی خانہ جنگیوں سے میں اکثر گھبرا جاتا اور اپنا دل بہلانے کے لیے شہر سے باہر دور تک نکل جاتا جہاں نشیب زاروں کی خوشگوار تنہائیوں، پرسرور خاموشیوں اور سحر آمیز یکسوئیوں میں بیٹھ کر، ہری بھری وادیوں کے قدرتی حسن سے حظ اٹھاتا اور پان کی بیلوں سے لدی ہوئی خوبصورت جنگلی پھلواریوں میں سکون روح تلاش کرتا۔ ساگوان کے تناور اشجار اور سپاری کے طرح وار درخت میرے ساتھی ہوتے اور میں اس وقت سبزہ کی نرم نرم آغوش کو آغوش مادری سمجھ کر ایک غیر فانی سکون محسوس کرتا۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

سوء شلانگ سے اٹھارہ کوس پرے ایک خوب صورت گاؤں تھا۔ یہ جگہ مجھے تمام تفریحی مقامات سے زیادہ پسند تھی۔ یہ مقام گویا حسن و تجلیات کا مرقع تھا۔ یہاں کا ذرہ ذرہ نمود قدرت کا آئینہ دار تھا۔ اس کے اطراف و جوانب میں کوسوں تک سبزہ کی روئیدگی لمبے چوڑے دامن پھیلائے بشاشت ریز تھی جھیل نما چمکتی دمکتی دلدلیں رنگین شعاعوں سے ہولی کھیلتی ہوئی سحر آفریں رنگینیاں بکھیرتی تھیں جن کے کناروں پر لمبی لمبی تر و تازہ گھاس میں چمکیلے پروں والے جنگلی مرغ اپنے شوخ رنگ سینہ کو تان کر نہایت خوش الحانی سے اذانیں دیتے اور کبھی یونانی دیوتاؤں کی طرح حسین پروں کو پھیلا کر ہوا میں اڑنے لگتے۔ میں اکثر اتوار کو یہاں آتا تو اس رومانی سرزمین اور رشک ارم خطہ میں تنہا بیٹھ کر صنائع قدرت کی کاریگری کا مطالعہ کیا کرتا۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب آسامی لوگوں میں مردہ گاڑنے یا جلانے کا رواج نہ تھا۔ یہ لوگ مردہ کو آخری رسوم کی ادائیگی کے بعد کسی خوب صورت دلدل یا کسی خوشنما گھنے پیڑ کے نیچے رکھ آتے جہاں وہ جنگلی جانوروں کی خوراک بن جاتا تھا۔

ان دلدلوں کے کنارے پر اکثر انسانی ڈھانچے، بکھرے ہوئے پنجر اور شکستہ کھوپڑیاں پڑی ہوئی ملتی تھی ایک دن میں ایک خوب صورت دلدل کے کنارے بیٹھا جھیل کے بچوں کے لیے مرغوں کے رنگین پر جمع کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک کہنہ کاسہ سر پڑا تھا جسے میں نے اٹھا لیا اور پروں کو اس میں بھرتا رہا۔

لیکن جب میں نے اس شغل سے فارغ ہو کر کھوپڑی سے پر نکالے تو مجھے خیال آیا کہ یہ بھی میرے جیسے کسی انسان کا سر ہے نہ جانے زندگی میں وہ اس سر کو کس قدر بلند کر کے چلتا ہوگا۔ اور نہ معلوم اس کے دماغ میں کیا کیا جوہر بھرے ہوں گے۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ سامنے آ گیا۔ آہ انسانی زندگی کا ایسا پر درد انجام! میرا دل بجھ گیا۔ اور دیر تک اس کاسہ سر کو پکڑے اسرار ہست و بود پر غور کرتا رہا۔

دفعتہً مجھے ایک عجیب خیال آیا۔ میں نے بچپن میں اسی جان سے سن رکھا تھا۔ کہ ہر ایک انسان کی پیشانی کی ہڈی پر قسمت کا حال لکھا ہوتا ہے۔ اور اس خدائی تحریر کو کوئی انسان نہیں پڑھ سکتا۔ اسی خیال کے ماتحت میں نے پیشانی کی ہڈی کو بغور دیکھا۔

سچ مچ پیشانی کی ہڈی پر کچھ حروف کندہ تھے۔ اور یہ حروف جو ڈھائی سطروں میں مرقوم تھے کسی نامعلوم زبان میں لکھے ہوئے تھے میں نے سوچا شاید یہ لکیریں ہڈی کے ترخ جانے سے بن گئی ہوں، تحریر وغیرہ کچھ نہ ہو' لہٰذا اسی تحقیق کے لیے میں نے دو اور کھوپڑیوں کا معائنہ کیا تو ان پر بھی پہلی کھوپڑی کی طرح ڈھائی ڈھائی سطریں مرقوم تھیں۔ سب کا انداز تحریر ایک ہی تھا۔ مگر حروف ہر ایک کے جدا تھے۔

میں ان تینوں کھوپڑیوں کو ساتھ لے آیا اور روزانہ رات کے وقت تنہائی میں بیٹھ کر ان

تحریروں پر دماغ سوزی کرنے لگا۔ میں نے اپنے کئی دوستوں کو بھی اس طرف توجہ دلائی لیکن وہ بھی کچھ نہ سمجھ سکے۔

اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ اسی دوران میں میری ملاقات فیض سے ہوئی۔ فیض ایک پچیس سالہ ہندوستانی نوجوان تھا۔ اس کا باپ یہاں سوداگری کرتا تھا۔

فیض پہلے محکمہ سراغرسانی میں ملازم تھا اور ایک قابل سراغرساں خیال کیا جاتا تھا لیکن کچھ عرصے سے وہ تپ دق میں مبتلا ہو کر ایک سال کی رخصت پر اپنے باپ کے پاس چلا آیا۔

ڈاکٹروں نے اس کی صحت کے لیے سوء کی آب و ہوا مفید قرار دی تھی۔ اس لیے اس کے باپ نے موضع سوء سے قریباً ایک میل کے فاصلہ پر خودرو پھولوں کے ایک خوب صورت جنگل کے درمیان ایک فراخ اور دیدہ زیب جھونپڑا ہموار کھا تھا جہاں وہ اپنی ماں اور دو ملازموں کے ہمراہ رہتا تھا۔

فیض اکثر دلدلوں پر مرغ کا شکار کرنے آیا کرتا تھا۔ وہیں میری اور اس کی ملاقات ہوئی اور یہی معمولی ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے اس سے بھی اپنے خبط کا ذکر کیا۔ اس نے مجھے صلاح دی کہ چند کھوپڑیاں کسی مردہ زبانوں کے ماہر کے پاس بھیجنی چاہئیں۔ چنانچہ اسی ہفتے میں نے چند کھوپڑیاں پروفیسر ہیری کو بھیج دیں۔

بوڑھا پروفیسر ہیری میرا کالج کے زمانے کا واقف تھا اس کی عمر کا بیشتر حصہ مردہ زبانیں سیکھنے میں بسر ہوا تھا اور مجھے یقین کامل تھا کہ اس کام میں پروفیسر ہیری سے بہت مدد ملے گی۔ لہٰذا بہت بے صبری سے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

آخر خدا خدا کر کے دو مہینے کے بعد پروفیسر کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس نے اپنی عمر میں پہلی بار ایسی تحریر دیکھی ہے۔ یہ زبان نہ تو دنیا میں موجود ہے اور نہ کبھی تھی۔ بہر حال اس کے پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ آج میں ذرا سویرے ہی گھر سے روانہ ہوا اور دس بجے کے قریب دلدل کے کنارے پر پہنچ گیا۔

فیض کا مکان یہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ ہمیشہ بارہ بجے دلدل پر آیا کرتا تھا۔ میں اس کے انتظار میں ایک درخت کے سہارے سبزے کے مخملیں فرش پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا جہاں سامنے ہی ایک کھوپڑی پڑی تھی۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

یہ کھوپڑی جسامت میں دوسری کھوپڑیوں سے کچھ بڑی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ کھوپڑی ضرور کسی عالی دماغ شخص کی ہوگی مگر اس کی شکستگی اور زبوں حالی سے میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں، میں نے اسے اٹھالیا اور پاگلوں کی طرح اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

”اے دوست! تم کیوں اتنے خستہ اور بے بس ہو رہے ہو وہ کونسی ایسی زبردست طاقت ہے جس نے تمہیں اس قدر پسپا کر دیا۔ آہ! تم موت کا زہریلا جام چکھ چکے ہو۔ کیا مجھے نہ بتاؤ گے کہ اس کا ذائقہ کیسا تھا۔“

عین اسی وقت ایک آبی پرندہ نہایت رقت آمیز آواز سے بے اختیار چیخ اٹھا ”تلخ تلخ تلخ“۔

میں یک دم کانپ گیا اور حیات فانی کی بے مائیگی پر بے اختیار رونے لگا۔

فیض کے آنے کا وقت قریب تھا۔ میں نے کھوپڑی کو پھینک دینا چاہا مگر میری قوت زائل ہو چکی تھی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ کھوپڑی مجھے اپنے اندر جذب کر رہی ہے۔

دوپہر کا وقت سنسان سبزہ زار، خاموش اور وسیع دلدل، بے حس و حرکت اشجار، کپکپاتی ہوئی خفیف سی کمزور ہوا مکمل تنہائی اور اس پر شکستہ کھوپڑی کا مس! مجھے سخت سردی محسوس ہونے لگی۔ ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے۔ خون کی گردش کم ہو گئی، دل بیٹھ گیا۔ سانس رک رک کر چلنے لگا، گو میری آنکھیں کھلی تھیں مگر بینائی ہر لحظہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ مجھ پر ایک لاہوتی نیند مسلط ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نرم نرم مشکیں گھاس پر دراز تھا اور میرا سر فیض کے زانو پر تھا جو ایک سیپے کا چمچہ بنا کر میرے منہ میں پانی ڈال رہا تھا۔

جب میرے اکڑے ہوئے جبڑے ذرا نرم ہوئے تو میں نے نقاہت سے پوچھا ”میں کہاں ہوں“

مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور محبت سے بولا۔

”خدا کا شکر ہے کہ تمہاری جان بچ گئی اگر میں وقت پر نہ آتا۔ تو زندگی محال تھی۔ خدا کے لیے ان منحوس کھوپڑیوں کا خیال چھوڑ دو ورنہ تم آسیب زدہ ہو جاؤ گے۔

اس وقت تو میں خاموش رہا۔ لیکن واپسی پر اس کی نظر بچا کر وہ کھوپڑی جس کے طلسمی اثر سے تھوڑی دیر پہلے میں بے ہوش ہوا تھا، اٹھا کر اپنے اٹیچی کیس میں ڈال لی، اور گھر چلا آیا۔

میں نے دوسرے دن رات کو نیم خوابی کی حالت میں اپنے کمرے کے اندر ایک سایہ چلتا پھرتا دیکھا۔ خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اس کھوپڑی کے متعلق واہمہ پیدا ہوا لہٰذا اسے باہر پھینکنے کے ارادے سے اٹیچی کیس کھولا۔ لیکن میں فوراً ہی دھک سے رہ گیا۔ کھوپڑی غائب تھی!!

پریشانی سے تمام رات میری آنکھ نہ لگی صبح میں نے کسی ضرورت سے اٹیچی کیس کھولا تو کھوپڑی موجود تھی۔ سوچنے کے بعد اس فیصلہ پر پہنچا کہ رات کو شاید گھبراہٹ کی وجہ سے اچھی طرح نہیں دیکھا یا واہمہ کے اثر سے اس پر نظر نہ پڑ سکی۔

میں تمام دن اسی خیال میں کھویا رہا۔ رات کو پھر میرے ساتھ وہی معاملہ پیش آیا۔ میں نے اپنا شک رفع کرنے کی غرض سے فوراً اٹھ کر اٹیچی کیس کھولا۔ کھوپڑی پھر غائب تھی۔ رات جوں توں کر کے گزری۔ صبح جونہی آزمائش کے لئے میں نے اٹیچی کیس دیکھا تو کھوپڑی بدستور موجود تھی میں بہت ڈرا۔ اور اسے اٹھا کر مکان کے پچھواڑے بدھ کے شکستہ مندر کی طرف پھینک دیا مگر اس کے بعد بھی وہ سایہ نہ ٹلا۔ میں بہت متفکر ہوا لیکن کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔

آخر ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ آدھی رات کے وقت بانو کی خواب گاہ سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ میں ننگے پاؤں دوڑتا ہوا بدحواسی سے اس کی خوابگاہ تک پہنچا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور جمیل بانو کو سنبھالنے میں مصروف تھا بانو بستر پر پڑی بے تحاشا چیخ رہی تھی۔ اس کا بدن برف کی طرح سرد تھا۔

کچھ دیر بعد اس کی حالت درست ہوئی۔ وہ بہت خوفزدہ تھی اس نے بتایا کہ نیند کی حالت میں یک دم اسے خون کو منجمد کر دینے والی سردی محسوس ہوئی۔ اس نے کپکپا کر آنکھ کھولی تو ایک سایہ اس پر جھکا ہوا تھا۔

میں رات بھر اس واقعہ پر غور کرتا رہا کہ اس سایہ سے کیسے چھٹکارا حاصل ہو چونکہ اب کھوپڑی کو بھی پھینک چکا تھا۔ جس کا اس واقعہ سے کچھ تعلق خیال کیا جا سکتا تھا۔

غرضیکہ صبح تک میں اسی الجھن میں گرفتار رہا اور ابھی بستر سے اٹھا بھی نہ تھا کہ جمیل میرے کمرے میں آیا۔ وہ کچھ مغموم دکھائی دیتا تھا اور مجھے مخاطب کر کے سراسیمگی سے کہنے لگا۔ ”رات والے واقعہ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔“

میں نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ ”کچھ بھی نہیں بانو یونہی ڈر گئی تھی۔“

جمیل نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مگر صرف بانو کے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوا بلکہ مجھے بھی یہ واقعہ پیش آ چکا ہے۔ لیکن میں نے اسے واہمہ خیال کرتے ہوئے اب تک اہمیت نہ دی تھی۔“

میں خاموش رہا کیونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا۔ کہ یہ سب مصیبت اسی کھوپڑی کی وجہ سے نازل ہو رہی ہے۔ پھر جمیل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں اس مکان کو چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ مکان ضرور آسیب زدہ ہے۔ اور میں تو فوراً مکان تبدیل کر لیتا لیکن آج کل کام کی بھرمار ہے اس لیے کچھ دن اور یہاں رہنے پر مجبور ہوں۔ مگر بانو کی بابت میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے میکے بھیج دوں اور جب تک مکان تبدیل نہ ہو۔ وہ وہیں رہے۔“

میں نے اس کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا۔ اور اسے تسلی دینی چاہی تاہم اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس واقعہ کے دوسرے تیسرے دن ملازمین بھی اس سرد سایہ کی شکایت کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ تمام گھر میں اداسی کی لہر دوڑ گئی اور سب چھوٹے بڑے سہمے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ایک دن اتفاقاً پھر میں نے اٹیچی کیس کھولا تو خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ وہ کھوپڑی پھر اٹیچی کیس میں موجود تھی۔ شاید پھر کسی نے لا کر یہاں رکھ دی تھی مگر لانے والا کون تھا۔

بانو موضع پتنگ کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ موضع پتنگ شیلانگ سے سات میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ جمیل صبح بیوی اور بچوں کو لے کر پتنگ جا رہا تھا۔ سر شام ہی اسباب وغیرہ بندھ گیا تھا اور رات کو تمام لوگ سکھ کی نیند سوتے رہے لیکن صبح سویرے ہی جب بانو بیدار ہوئی تو اس نے دیکھا کہ الماری کھلی پڑی ہے چابیوں کا گچھا تالے میں لٹک رہا ہے۔ اور اس کے زیور کا ڈبہ غائب ہے۔

فوراً ہی گھر میں شور مچ گیا۔ کچھ دیر ملازموں سے پوچھ گچھ ہوتی رہی پھر پولیس میں اطلاع کی گئی پولیس نے موقع دیکھا اور ابتدائی تحقیقات کی مگر چور کا کچھ پتہ نہ چلا۔

بانو مایوس ہو کر میکے چلی گئی۔ جمیل ہر ہفتے کی شام کو پتنگ چلا جاتا۔ اور اتوار کا دن گزار کر پیر کی صبح وہاں سے واپس آتا۔ چونکہ پولیس کی تحقیقات ابھی جاری تھی اس لیے جمیل کی غیر موجودگی میں میرا گھر رہنا ضروری تھا۔ چنانچہ اسی مصروفیت کی وجہ سے کئی اتوار میں فیض کو ملنے نہ جا سکا۔

آخر ایک اتوار کو مجھے بڑی مشکل سے موقعہ ملا۔ اور میں سیدھا فیض کے گھر جا پہنچا۔ مگر آہ! اسے دیکھ کر میں بہت گھبرا گیا۔ وہ بالکل پہچانا ہی نہ جاتا تھا۔ اس کا جسم سوکھ کا کانٹا ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر غیر معمولی رونق دکھائی دیتی تھی۔

اس نے مجھے بتایا۔ کہ ایک سنیاسی کی دوا سے اس کا بخار اتر گیا ہے اب اسے بھوک وغیرہ بھی اچھی طرح لگتی ہے۔ صرف کمزوری باقی ہے سنیاسی کہتا ہے کہ ایک ہفتے تک وہ بالکل صحت یاب ہو جائے گا۔

میں تمام دن اس کے پاس رہا۔ دوران گفتگو میں نے اسے جمیل کی چوری کا حال سنایا۔ اس نے میرا غ رسانہ انداز سے تمام واقعہ سنا اور دیر تک کسی گہری فکر میں ڈوبا رہا۔ پھر آہ سرد بھر کر کہنے لگا۔

"کاش آجکل میں تندرست ہوتا تو چٹکیوں میں سراغ لگا لیتا۔ پولیس بیچاری ان باتوں کو کیا جانے اچھا دعا کرو کہ میں جلد اچھا ہو جاؤں تو فوراً مال مسروقہ برآمد کرا دوں گا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔"

اس نے مجھے کئی پر اسرار چوریوں کے واقعات سنائے۔ جن کے اس نے سراغ لگائے تھے

باتوں ہی باتوں میں وقت کٹ گیا اور شام کے قریب میں وہاں سے واپس آ گیا۔

فیض کی ملاقات کے پورے سات دن بعد یعنی ہفتے کی شام کو جمیل اپنی بیوی کے پاس پتنگ چلا گیا۔ میں اکیلا تھا۔ کام سے فارغ ہوتے ہی گھر آ کر بستر پر لیٹ گیا اور ایسی گہری نیند سویا کہ رات کے دس بجے تک بے خبر سوتا رہا۔ اب بھی اگر ملازم کھانے کے لیے بیدار نہ کرتا تو شاید دوسری صبح آنکھ کھلتی۔

کھانا کھا کر میں کھلی کھڑکی کے سامنے بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ مشکیں ہوا کے لطیف جھونکے روح کو تازگی بخش رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک بج گیا۔ ملازم بھی میٹھی نیند سو گیا۔ تمام گھر ویران اور ہر طرف سناٹا غالب تھا۔

دفعتاً مجھے ہوا کے جھونکوں سے ملی جلی خفیف سی ایک آواز سنائی دی جیسے کسی نے میرا نام لے کر پکارا ہو۔ میں فوراً نیچے اترا اور دروازہ کھول کر دیکھا تو وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ میں دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں واپس جانے لگا تو پھر ایک خفیف سی کھڑ کھڑاہٹ ہوئی۔

یہ آواز مکان کے پچھواڑے کسی دروازہ پر دستک دینے کی تھی میں نے مکان کے پچھلے حصے کا آخری دروازہ کھولا۔

ہمارے مکان کے پچھواڑے بدھ کا ایک ویران اور شکستہ مندر تھا۔ جس کے بیرونی احاطے میں گنجان درخت اور بے ترتیب اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔

گو چاندنی رات تھی، مگر آسمان پر ہلکے ہلکے چتکبرے بادل چھیلے ہوئے تھے جن کے دھندلے سائے چاندنی کی اجلی ردا کو جا بجا داغدار بنا رہے تھے ہر چہار طرف پر ہیبت خاموشی طاری تھی۔ آس پاس کی تمام آبادی سکوت اور نیند کے نشے میں مدہوش تھی۔ یہاں بھی دروازے پر کوئی موجود نہ تھا۔ البتہ مندر کے احاطے کی شکستہ منڈیر پر ایک سفید سا سایہ دکھائی دیا۔ میں پھر دروازہ بند کرنے ہی کو تھا۔ کہ کسی نے دوبارہ میرا نام پکارا۔

اف یہ آواز ایسی بے رس، بھگوار کھوکھلی تھی۔ جیسے قبر کی تہوں سے نکلی ہو یا کنوئیں کی گہرائی سے کسی نے پکارا ہو۔ میں پہلے تو لرز گیا۔ لیکن پھر حوصلہ کر کے پوچھا۔

"کون ہے۔"

اس کے جواب میں اسی خوفناک آواز میں کسی نے کہا۔

"میں ہوں فیض"

خوف اور تعجب کے ملے جلے احساس سے میں کانپ گیا۔ تاہم مروت کے خیال سے آگے بڑھنا پڑا لیکن اس کے قریب جانے کی جرأت نہ ہوئی۔

آواز دینے والا شخص سچ مچ فیض ہی تھا۔ میں نے بمشکل اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے۔ "یار تم اس وقت یہاں کیسے آ گئے"۔

Uploaded By Muhammad Nadeem ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اس نے کچھ رکتے ہوئے جواب دیا۔ "مال مسروقہ برآمد کرانے۔ کیونکہ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ صحت یاب ہو کر پہلے یہی کام کروں گا۔"

میں نے نرم لہجہ میں دریافت کیا۔ "تم سیدھے راستے سے کیوں نہیں آئے"

وہ خاموش رہا۔ جس پر میں نے رسماً کہا۔

خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے۔"

وہ کافی وقفہ کے بعد کہنے لگا۔

"آہ! آج جو دوا مجھے دی گئی وہ اس قدر کڑوی اور پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گرم تھی کہ اس کی گرمی نے میرے تن بدن کو پھونک دیا اور اسی کے اثر سے میری آواز بھی بدل گئی ہے۔ اف اس کے تلخ اور ناگوار ذائقہ کا اثر اب تک میری زبان پر موجود ہے"۔

گو فیض کی بے وقت آمد مجھے ناگوار گزر رہی تھی، تاہم میں نے اخلاقاً اسے اندر چلنے کی دعوت دی۔ مگر اس نے اداسی سے کہا۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں، کیونکہ مجھے پو پھٹنے سے پہلے واپس جانا ہے۔"

میں نے کہا "خوب شاید تم گھر والوں سے چوری چوری آئے ہو"۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر کہا۔

"تو کیا تم ابھی واپس چلے جاؤ گے۔"

اس نے ست انداز سے کہا۔ "ہاں مگر پہلے ذرا میرے ساتھ چلو"

نہ جانے کیوں مجھ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس نے میری حالت کو بھانپ کر افسوسناک لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں مجھ سے کسی خطرے کا اندیشہ ہے۔"

میں نے دل کڑا کر کے "نہیں دوست۔ لیکن جانا کہاں ہو گا"

اس نے کہا۔ "چلو تو سہی تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔"

میں لاجواب ہو گیا اور طوعاً کرہاً اس کا ساتھ دینا پڑا۔

بدھ کا شکستہ اور غیر آباد مندر اپنی کہنگی اور قدامت کے لحاظ سے مافوق الفطرت خیال کیا جاتا تھا۔ لوگ اسے بھوت پریت کا مسکن سمجھتے تھے۔ اور اس کے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور تھیں۔ اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ مندر کے نیچے خزانہ دفن ہے اور ایک بہت بڑا سانپ اس پر بطور نگہبان بیٹھتا ہے۔ اگر کوئی شخص وہاں چالیس دن تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہے تو سانپ مہربان ہو کر

اسے مالا مال کر دیتا ہے، کئی لوگ کہتے تھے۔ کہ یہ مندر کسی راجہ نے بدھ مت کے جنوں کے لیے بنوایا تھا۔ اور اب تک جن اس میں عبادت کرتے ہیں اور ان کا حلفیہ بیان تھا کہ اس مندر کے احاطہ میں ان کے بزرگوں نے دن دہاڑے درختوں پر چراغ جلتے دیکھے تھے اور کئی ایک یہ بھی کہتے تھے کہ اس مندر میں ایک چڑیل رہتی ہے۔ جو حسین عورت کا روپ دھار کر اکثر رات کو احاطے کی منڈیر کے قریب کھڑی ہو کر راہگیروں کو پکارتی ہے اور ان کو پوری حلوا دیتی ہے۔ لیکن راہگیر جب اس حد سے نکل کر آگے بڑھتا ہے تو وہ پوری حلوا گندگی بن جاتا ہے۔

میں نے ہمیشہ ان روایات کا مذاق اڑایا تھا لیکن اس وقت جب کہ فیض مندر کے احاطہ میں داخل ہو رہا تھا تو وہ تمام روائتی نقوش پردۂ ذہن پر ابھر ابھر کر پائے استقلال کو لڑکھڑا رہے تھے۔ قریب تھا کہ میں بھاگ جاؤں مگر فیض کی پھٹی ہوئی آواز سنائی دی "بڑھتے آؤ"

مندر کے احاطہ میں درختوں کی کثرت، جھاڑیوں اور بیلوں کی افراط سے سخت اندھیرا تھا۔ اونچی اونچی گھاس میں جو قد آدم تھی چلنا سخت دشوار تھا۔ فیض اس مقام پر بغیر کسی رکاوٹ کے چل رہا تھا لیکن میں اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور بری طرح قدم اٹھاتا ہوا چلنے لگا۔ جھاڑیوں کی رگڑ سے میرے کپڑے پھٹ گئے ہاتھوں اور منہ پر بھی خراشیں آ گئیں۔ کبھی کبھی میں ایسی بری طرح جھاڑیوں کے ساتھ ٹکراتا کہ جنگلی پرندے خوفزدہ ہو کر پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے گھونسلوں سے باہر نکل آتے۔ آخر ایک جگہ فیض بالکل میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یکایک چیخوں کی آواز بلند ہوئی۔ یہ آواز نہایت دل خراش اور لرزہ خیز تھی جیسے کسی متورم گلے سے نکل رہی ہو۔ میرا دل دہل گیا مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور بڑھتا گیا۔ آخر کچھ دور آگے مجھے صاف زمین دکھائی دی۔ یہاں پتھر کا فرش تھا جس کے درمیان بوسیدہ مندر کھڑا تھا۔

عین اسی وقت چاند نے بھی نقاب کا گوشہ سرکایا تو اس کپکپاتی اور تھرکتی ہوئی چاندنی میں میں نے دیکھا کہ فیض ایک تناور درخت کے قریب کسی سے دست و گریباں ہے میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ پاؤں زمین نے پکڑ لئے کیونکہ چیخوں کی آواز انتہائی حد تک خوفناک تھی گویا کوئی خبیث روح آتشیں زنجیروں میں جکڑی ہوئی چیخ رہی تھی یا کوئی دوزخی کتا بھونک رہا تھا۔ میں آگے نہ جا سکا۔

تھوڑی دیر بعد فیض کا حریف چیختا چلاتا بھاگ گیا۔ فیض نے درخت کی کوکھ میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا اور بجلی کی سی سرعت سے واپس چلنے لگا جب ہم لوگ مندر کے احاطے سے باہر آئے تو اس نے ایک ڈبہ میرے ہاتھ میں دے دیا جو زیورات سے پر تھا۔

فیض نے کہا۔ "لو میں جاتا ہوں"

میں نے بے چینی سے پوچھا۔ "مگر پہلے یہ بتاؤ کہ چور کون تھا"۔

اس نے کہا۔ "تمہیں کیا مطلب"۔

میں نے کہا۔ "یہ نہایت ضروری ہے"۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

وہ دیر تک سوچنے کے بعد بولا۔

اچھا سنو! آج سے چند سال پیشتر موضع پنگ میں ایک حسین لڑکی رہتی تھی۔ بدقسمتی سے ایک نوجوان اس سے محبت کرنے لگا۔ یہ نوجوان گو ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ تھا مگر بالکل مفلس تھا اس لیے وہ لڑکی اس کی محبت کو بے حقیقت اور بے قیمت سمجھتی تھی۔ وہ نوجوان بار بار ذلت اٹھانے کے باوجود اس پر جان دیتا تھا۔ آخر لڑکی نے تنگ آ کر ایک دن اس سے کہا کہ اگر تم ایک کثیر رقم میرے نام بنک میں جمع کرا دو گے تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔

نوجوان نے مطلوبہ رقم مہیا کرنے میں خون پانی ایک کر دیا لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔ ان پے در پے ناکامیوں سے اس کے خیالات باغیانہ ہو گئے۔ اس لیے چوری و رہزنی کا پیشہ اختیار کیا اور ایک بڑے آدمی کے گھر ڈاکہ ڈال کر اسے قتل کر دیا مگر اسی سلسلہ میں وہ گرفتار ہو گیا اور قتل کے جرم میں اسے سزائے موت ملی۔

اس حسین لڑکی کی دوسری جگہ شادی ہو گئی۔ انقلاب زمانہ نے اس خونیں واقعہ کو لوگوں کے دلوں سے محو کر دیا لیکن محبت مٹ کر بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکی یعنی کسی شخص کو اتفاقاً اس نوجوان کی کھوپڑی مل گئی اور وہ اسے گھر لے گیا۔ یہ گھر وہی تھا جس میں اس کھوپڑی کے مالک نوجوان کی محبوبہ رہتی تھی۔

نوجوان کی روح اپنی کھوپڑی کی تلاش میں اس جگہ گئی اور اپنی محبوبہ کو وہاں دیکھا تو اس کے مجرمانہ خیالات پھر عود کر آئے (کیونکہ مرتے وقت جو خیالات انسانی دماغ میں ہوں۔ موت کے بعد بھی روح پر ہمیشہ ان کا اثر رہتا ہے) چنانچہ اس دن سے وہ آوارہ روح چوری کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگی۔ روح ایک دن اپنی محبوبہ کے کمرے میں منڈلا رہی تھی۔ اسے کسی طرح چابیوں کا گچھا نظر آ گیا لہٰذا وہ چوری پر مجبور ہو گئی اور چوری کے بعد مال مسروقہ اس نے پرانے مندر کے احاطے میں درخت کے اندر چھپا دیا۔ اب اسی آوارہ اور چور روح سے میں نے یہ صندوقچہ چھینا۔"

میں نے سہم کر پوچھا۔ "تو کیا تم اس وقت روح سے دست و گریباں ہو رہے تھے"۔

فیض نے جواب دیا۔ "ہاں"

میں نے کہا۔ "روح تو لطیف چیز ہے۔ ان سے کون لڑ سکتا ہے"۔

فیض نے اکتا کر کہا۔ "روح کی لطافت و کثافت نیکی اور بدی پر منحصر ہوتی ہے۔ گنہگار کی روح کثیف اور بوجھل ہوتی ہے جو خدا سے دور رہتی ہے۔ اور مقام ماموریت تک نہیں جا سکتی۔"

میں نے بے اعتباری سے کہا۔ "لیکن تمہیں یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔"

اس نے جواب دیا۔ "سراغرساں کے لیے یہ کچھ مشکل نہیں۔ اگر اس وقت وہ کھوپڑی موجود ہوتی۔ جس کے اثر سے تم ایک دفعہ دلدل کے کنارے بے ہوش ہوئے تھے تو میں اس پیشانی کی تحریر پڑھ کر تمہیں مطمئن کر دیتا۔"

میں نے انتہائی حیرت سے کہا۔ "کیا ان تحریروں کا راز بھی تم نے پا لیا ہے۔"

فیض نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں سخت متحیر تھا۔ میری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت مجھے ایسا لاغر اور خوفناک معلوم ہوا کہ میرا خون خشک ہو گیا۔ فیض نے میری بگڑی ہوئی حالت کا اندازہ کر کے اداسی سے کہا۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ بغیر مصافحہ کئے روانہ ہوا اور بہت جلد میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد مجھ پر ایک لرزہ خیز خوف طاری ہو گیا۔ اور خدا جانے میں کس طرح اپنے کمرے تک واپس آیا۔

شب کا سحر ٹوٹتے ہی صبح کے اجالے نے دامن کائنات کو نور سے بھر دیا۔ نسیم سحر کے تر و تازہ جھونکوں نے میرے سوئے ہوئے دماغ میں نئی روح پھونک دی اور میں ایک طویل بے ہوشی سے ہوشیار ہوا۔ میرا بدن تکان سے چور چور تھا اور بے حد درد کر رہا تھا۔

یکے بعد دیگرے مجھے رات کی سب باتیں یاد آنے لگیں گو یہ سب واقعہ خواب معلوم ہوتا تھا لیکن جب میری نگاہ زیور کے ڈبے پر پڑی تو مجبوراً یقین کرنا پڑا۔ اتنے میں ملازم چائے لے کر آ گیا۔ جس کے پینے سے دماغی انتشار میں کچھ کمی واقع ہوئی اور میں نے وہ ڈبہ بکس میں رکھا۔ بعد ازاں فیض سے مفصل حالات دریافت کرنے کے اشتیاق میں موضع سوہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

برسات کی وجہ سے راستے بہت خراب ہو رہے تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ زمین اور دلدل میں تمیز دشوار تھی۔ بدبو جھل ہوا گندے پانیوں میں سڑی ہوئی گھاس اور مچھلی کے انڈوں کی بساند طبیعت کو مکدر کر رہی تھی۔ مینڈکوں کے بے کیف شور و غل نے تمام وادی سر پر اٹھا رکھی تھی۔

میں بہ دقت تمام فیض کے گھر تک پہنچا۔ احاطے میں داخل ہوتے ہی مجھے یہاں کا نقشہ بدلا ہوا دکھائی دیا۔ بیل پوش منڈیریں ننگی ہو رہی تھیں سبزہ پامال ہو چکا تھا کثرت بارش سے پھول دار پودے زمین پر لمبے لیٹے ہوئے تھے۔

بدشگونیوں کے آثار دیکھ کر میں سخت بدحواس ہوا اور حالت اضطراری میں جھونپڑے کی طرف دوڑا مگر جھونپڑا بالکل اجاڑ تھا۔ جیسے یہاں کبھی کسی انسان کا گزر ہی نہ ہوا تھا۔ ہر طرف موت

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کی سی خاموشی اور قبر کا سا سکوت تھا۔ تمام کمرے بند تھے اور بڑے کمرے کے دروازے پر باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔

میں کنڈی کھول کر اندر گیا۔ تو ہال کمرے میں ایک بڑی سی قبر دکھائی دی جو بالکل تازہ ہی ہوئی تھی۔ اس قبر کو دیکھ کر میں کانپ گیا۔ طرح طرح کے منحوس وسوسے پیدا ہونے لگے۔ دماغ پریشان اور بھاری ہو گیا۔ یکایک سامنے سے اس کا بوڑھا ملازم آتا دکھائی دیا۔ جس کی آنکھیں کثرت گریہ سے سوجی ہوئی تھیں اور گلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مغموم آواز میں کہا۔

"حضور میرے آقا انتقال کر گئے"۔

میں نے گھبرا کر پوچھا "کب۔"

اس نے جواب دیا "کل شام کے بعد اور آج صبح ان کو دفن کر دیا گیا ہے۔ یہ انہیں کی قبر ہے۔ ان کی والدہ اس صدمے سے یکلخت بیمار ہو گئی تھیں۔ اس لیے بڑے آقا ان کو شہر لے گئے ہیں۔ اب میں ہی صرف قبر کی نگہبانی کے لیے یہاں رہ گیا ہوں"۔

اراولی کی چڑیل

جون ۱۹۲۰ کی ایک شام کا ذکر ہے میں اجمیر شریف کے جنوب میں کوہ اراولی کے دامن میں پہنچا۔ اس وقت کیمپ میں انگریز شکاری مسٹر براؤن نہیں تھے۔ کچھ دیر بعد وہ پہاڑ کی طرف سے آئے تو میں نے ان سے کہا کہ میں کوہ آبو سے آیا ہوں میرا نام امداد خاں ہے، میں سیکنڈ رائل لانسر میں رسالدار ہوں۔ مجھے ایجنٹ برائے گورنر جنرل راجپوتانہ نے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔ مسٹر براؤن نے کہا۔ "میں تھکا ہوا ہوں، آپ کھانا کھا کر سو جائیں صبح شکار گاہ میں چل کر آپ کو تمام واقعات سناؤں گا" مسٹر براؤن اپنے خیمے میں چلے گئے۔ میں نے کھانا کھایا اور چاندنی رات میں پہاڑی مناظر دیکھنے لگا۔ مسٹر براؤن کا شکاری کیمپ کوہ اراولی کی بلند و بالا چوٹی کے نیچے ایک خوفناک مقام پر تھا۔ کیمپ کے سامنے گھنے درختوں کا تاریک جنگل تھا۔ پہاڑ کو چیرتی ہوئی نشیب میں ایک ندی بہہ رہی تھی اور وہاں کی زمین سیاہ اور چکنی تھی۔ کچھ دیر بعد جب چاند چھپ گیا تو ملازموں نے کیمپ میں آگ کے الاؤ روشن کئے اور بندوقوں سے مسلح ہو کر باری باری پہرہ دینا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں سو گیا۔ صبح اٹھا تو ملازموں نے مجھے اکیس مرے ہوئے سانپ دکھائے جو انہوں نے رات کو کیمپ کے آس پاس ہلاک کئے تھے۔ میں سانپوں کے ڈر کی وجہ سے فل بوٹ پہنے ہوئے تھا لیکن میں وہ منظر دیکھ کر لرز گیا کیونکہ سانپ اور موٹر ایکسیڈنٹ میری دو سب سے بڑی کمزوریاں ہیں تاہم میں نے کسی کو پتہ نہ چلنے دیا کہ سانپوں کی لاشیں دیکھ کر میں ڈر رہا ہوں اور میرا دل دھڑک رہا ہے۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اتنے میں مسٹر براؤن آ گئے۔ ہم نے کھانا کھایا پھر انہوں نے قریب کے خیمے سے سجان سنگھ کو بلایا اور مجھے اور سجان سنگھ کو ساتھ لے کر ایک پہاڑی درے میں پہنچے۔ درے کے سامنے گھنے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس میں ایک چشمہ تھا۔ چشمے کے کنارے ایک بہت گہرا غار تھا۔ غار کے سامنے ایک اونچے درخت کے نیچے پہاڑی چٹان پر ایک پتھر رکھا تھا۔ سجان سنگھ نے پتھر ہٹایا۔ وہ چٹان خشک خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

مسٹر براؤن بولے۔ "امداد خان یہ میرے دوست مسٹر رابرٹ کا خون ہے۔ جب تک میں رابرٹ کے قاتل سے انتقام نہیں لے لیتا مجھے سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ دو ماہ ہوئے میں اور رابرٹ سیر و شکار کی غرض سے کوہ آبو آئے۔ کوہ آبو میں کوہ اراولی پر ایک آدم خور کی خونخواری کا بہت چرچا تھا۔ ہم سجان سنگھ کے بھائی ایشر سنگھ کے ساتھ یہاں آ گئے۔ اس درخت پر مچان بندھوایا۔ رات کو میں مچان پر تھا۔ رابرٹ اور ایشر سنگھ میرے لیے کھانا لے کر آئے۔ مسٹر رابرٹ آگے اور ایشر سنگھ پیچھے تھا۔ اچانک آدم خور نے رابرٹ کو اس چٹان پر دبوچ لیا۔ ایشر سنگھ چلایا۔ میں نے سامنے بندھے ہوئے بھینسے کی طرف دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں مچان سے نیچے اترا۔ چاند کی چاندنی میں ایک شیر چٹان پر بیٹھا رابرٹ کی گردن کا لہو پی رہا تھا۔ یہ وحشت خیز منظر دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا۔ میں گھبراہٹ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ رابرٹ کے گولی لگنے کا ڈر تھا۔

"میں نے اور ایشر سنگھ نے تلواریں سونت لیں اور شیر پر حملہ کر دیا تھا۔ معاً شیر نے رابرٹ کو چھوڑ کر ایشر سنگھ کے دو ہتڑ مارا۔ ایشر سنگھ گرانڈیل جوان اور پیشہ ور شکاری تھا لیکن آدم خور کے ایک ہی دو ہتڑ میں وہ گر پڑا۔ میں نے شیر پر تلوار کا وار کیا۔ وار خالی گیا تلوار چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ شیر نے ایشر سنگھ کو منہ میں دبایا اور اس غار میں گھس گیا۔ میں جوشِ انتقام میں بندوق لیے ٹارچ روشن کر کے غار میں داخل ہو گیا۔ آگے غار اتنا تنگ تھا کہ اس میں شیر کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "یہ شیر تھا یا آسیب؟"

میں بری طرح ڈر گیا۔ شیر ایشر سنگھ کو لے کر میری آنکھوں کے سامنے غار میں گھسا تھا۔ غار کے دہانے پر ایشر سنگھ کا تازہ لہو پڑا تھا۔ اسی لمحہ مجھے مسٹر رابرٹ کا خیال آیا۔ میں چٹان پر پہنچا۔ رابرٹ مر چکا تھا۔ شیر کے تیز دانتوں نے اس کی گردن اور سر کے کرچے کرچے کر دیئے تھے۔ بڑا وحشت ناک منظر تھا۔ دن نکلا تو مسٹر رابرٹ کی لاش لے کر میں کوہ آبو پہنچا اور پھر چوتھے دن سجان سنگھ کو ساتھ لے کر واپس یہاں آ گیا۔ مجھے رابرٹ کی موت کا جس قدر غم تھا اس سے زیادہ سجان سنگھ کو اپنے بھائی ایشر سنگھ کے مرنے کا دکھ تھا۔ ہم دونوں انتقام کی آگ میں بری طرح جل رہے تھے۔

ایک روز شیر نے گراسیہ قبائل کے سردار کا اکلوتا بیٹا ہلاک کر کے اس کی گردن کا خون پیا اور پھر لاش کو گھسیٹتا ہوا ندی کی طرف پہاڑوں میں لے گیا۔ دوسرے دن اس لڑکے کی لاش ندی میں

بہتی ہوئی دیکھی گئی۔ بڑی کوشش کی مگر ندی سے لاش برآمد نہ ہو سکی۔ بھیل اور گراسیہ قبائل میرے پاس آ کر زار و قطار رونے لگے۔ میں نے پہلے انہیں تسلی تشفی دی اور پھر آدم خور کے متعلق تفصیلات معلوم کیں تو ان میں سے ایک شخص نے بید کی طرح کانپتے ہوئے کہا۔ "صاحب! ہمارے قبیلے صدیوں سے ان پہاڑوں میں آباد ہیں۔ خونخوار درندوں کو ختم کرنا ہمارے لیے معمولی بات ہے لیکن یہ آدم خور، شیر یا چیتا نہیں کوئی جن یا مافوق البشر چیز ہے۔ یہ آسیب درندے کا روپ دھار کر چھ مہینے میں ہمارے پچاس افراد ہلاک کر چکا ہے۔ یہ بلا انسان کی گردن کا لہو پی کر پھر ایک حسین و جمیل عورت کا روپ دھار کر انسان کی برہنہ لاش کے سینے پر بیٹھ کر نہاتی ہے اور پھر لاش کو ندی میں بہا دیتی ہے۔ یہ تمام پہاڑ اور غاریں آسیب زدہ ہیں۔ آسیب کا علاج بندوقوں سے نہیں ہو سکتا صاحب! آپ کسی روحانی عامل کو تلاش کریں، ہم آپ کو جان و مال کی دعائیں دیں گے۔

"امداد خاں! آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ داستان پراسرار اور سنسنی خیز ہے لیکن میں توہم پرست نہیں بلکہ دلیر آدمی ہوں میں نے اور سجان سنگھ نے ان پہاڑوں اور جنگلوں کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا اور جس وقت میں نے ایک برہنہ لاش کو ندی میں بہتے دیکھا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سجان سنگھ، ایشر سنگھ جیسا بہادر اور نامور شکاری نہیں ہے اس لیے میں نے ایجنٹ برائے گورنر جنرل راجپوتانہ کو لکھا کہ میری مدد کے لیے کوئی تجربہ کار فوجی شکاری بھیج دیجئے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے جو آپ تشریف لے آئے۔ میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ اب آپ جو چاہیں وہ کریں۔"

مسٹر براؤن کی زبانی یہ غیر معمولی روداد سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کیونکہ میں آسیب بھوت اور چڑیلوں کا قائل نہیں ہوں مگر یہ سنسنی خیز واقعات سن کر میرا ذہن ڈول گیا۔ ہم واپس کیمپ میں آئے تو شام ہو گئی۔ صبح ندی کے منبع کی طرف جانے کا پروگرام بنایا اور پھر اپنے اپنے خیمے میں جا کر سو گئے۔ رات کو دو بجے اچانک ایک پہرے دار بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اور اس کے قریب ہی چھ فٹ لمبا ایک سیاہ رنگ کا سانپ مرا پڑا تھا۔ مسٹر براؤن نے بتایا کہ چاند چھپ گیا تھا۔ پہرے داروں کی غفلت سے الاؤ کی آگ بجھ گئی۔ گھپ اندھیرے میں اس پہرے دار کا پاؤں ناگ پر پڑا اور ناگ نے ڈس لیا۔ اسی ٹارچ کی روشنی میں میرے ملازم محبوب خان نے دم پکڑ کر سانپ کو زمین سے اٹھایا اور پھر جھٹکا دے کر ناگ کو بیچ سے توڑ دیا۔ ناگ بہت دیر زمین پر پڑا رہا۔ اب میرے آنے کے بعد محبوب خان نے سانپ کا سر کچل کر اسے ہلاک کر دیا۔ محبوب خاں ساتھیوں کا بہترین شکاری ہے اور ناگ کے ڈسے کا ماہر طبیب ہے۔ محبوب خاں نے خون کا دورہ روکنے کے لیے پہرے دار کے پاؤں میں کپڑا باندھا اور پھر آگ کے دہکتے ہوئے انگارے سے ڈسی ہوئی جگہ کو جلا دیا۔ اب زخم میں دوا بھر کر پٹی باندھ دی ہے۔ "اے اللہ تو دلوں کا مالک ہے مجھے ہمت جرات دے۔" کچھ دیر بعد دن نکل آیا۔ واقعی محبوب خاں کا علاج کامیاب ثابت ہوا۔ پہرے دار پر زہر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ صرف جلے ہوئے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

پاؤں کی تکلیف کا رونا رو رہا تھا۔ محبوب خاں نے اسے اور دوا پلائی اور زخم پر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ جب اسے سکون ہو گیا تو ہم نے کھانا کھایا۔ پھر میں مسٹر براؤن اور سجان سنگھ دو ملازموں کو ساتھ لیکر ندی کی طرف روانہ ہوئے پہلے تاریک اور پھر گھنا جنگل آیا اس جنگل میں بڑے بڑے درختوں اور ان کی لمبی لمبی شاخوں سے دہشت ہوتی تھی اور اس جنگل میں زمین کی سطح سورج کی کرنوں سے محروم تھی بہت دل گھبرایا خدا خدا کر کے آگے چھدرا جنگل آیا اور پانی کے خوفناک شور سے ایسا محسوس ہوا جیسے ندی قریب ہے۔

"اف میرے بھگوان۔" سجان سنگھ نے ایک اونچے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ہم نے درخت کی طرف دیکھا سیاہ رنگ کا ایک بہت بڑا خوفناک سانپ اس درخت کے تنے پر لٹکا ہوا تھا میں سہم گیا لیکن میں نے ہمت کر کے مسٹر براؤن اور سجان سنگھ کے ساتھ اپنی بندوق سے گولی چلا دی تین گولیوں کے دھماکے سے جنگل گونج اٹھا اور ساتھ ہی سانپ زمین پر آ پڑا۔ وہ غصے میں اپنا پھن زمین پر مارنے لگا۔ اسی وقت محبوب خاں نے اپنا برچھا اس کے پھن میں گھونپ دیا۔ وہ وہیں تڑپ کر مر گیا۔ اس کا خون اس طرح پڑا تھا جیسے وہاں کئی بکرے ذبح کئے گئے ہوں۔ وہ پندرہ فٹ لمبا اور انسانی ران جیسا موٹا اژدھا تھا۔

اژدھے کی لاش کو وہیں چھوڑ کر ہم آگے بڑھے اور سامنے ندی پر جا پہنچے۔ ندی پہاڑ سے چل کر نشیب کی طرف بڑے زور سے بہہ رہی تھی۔ ہم ندی کے کنارے کنارے پہاڑ کی طرف چل پڑے۔ آگے ندی کے گھاٹوں میں بھیل اور گراسیہ قبائل کی جھونپڑیوں میں پہنچے تو بھیل سردار نے ہمارا استقبال کیا اور کہا کہ " آپ لوگ پہاڑ کی سمت ندی کے منبع پر نہ جائیں کیونکہ وہ جگہ بھوتوں اور چڑیلوں کا مسکن ہے۔ ایک خوبرو چڑیل چیتے کا روپ دھار کر انسان کو ہلاک کرتی ہے اور پھر اس کی برہنہ لاش پر بیٹھ کر غسل کرتی ہے اور پھر اس کے بعد لاش کو ندی میں بہا دیتی ہے۔ اگر آپ لوگ چڑیلوں کی خونخواریاں دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو دو چار دن ہماری جھونپڑیوں میں قیام کریں۔"

بھیل سردار کے پاس ہمیں چھ روز گزر گئے لیکن ان دنوں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔

ساتویں دن سنیچر تھا۔ بھیل سردار بولا کہ ہماری جھونپڑیوں سے ایک میل دور گراسیہ قبائل کی جھونپڑیاں ہیں۔ آج صبح ان جھونپڑیوں سے چڑیل ایک نوجوان عورت کو ہلاک کر کے گھسیٹتی ہوئی اپنی قیام گاہ کی طرف لے گئی۔ آج شام کو چڑیل اس عورت کی لاش پر بیٹھ کر نہائے گی اور پھر لاش کو ندی میں بہا دے گی۔

میں نے کہا۔ "ہم ندی میں بہتی ہوئی لاش دیکھنے کا اشتیاق نہیں رکھتے ہمیں تو اس چڑیل کی قیام گاہ بتائیں تاکہ لاش پر نہانے سے پہلے ہم اس سے دو دو ہاتھ کریں۔"

یہ سن کر بھیل سردار کا چہرہ اتر گیا اور اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اسے ڈرپوک اور بزدل کا طعنہ دیا اور جب ہم ناراض ہو کر چلنے لگے تو بھیل سردار کے بھائی چندا نے ہاتھ

جوڑ کر کہا۔ "صاحب! ہم بزدل نہیں ہیں۔ شیر کو نیزے سے ہلاک کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن یہ درندہ نہیں ہے بلکہ کوئی آسمانی بلا ہے۔ اگر آپ لوگوں کا یہ ارادہ ہے کہ ہم تباہ و برباد ہوں تو چلیئے میں اس چڑیل کی قیام گاہ بتاتا ہوں۔"

ہم چندا کو ساتھ لے کر پہاڑ کی طرف روانہ ہوئے سامنے ہزاروں فٹ اونچے پہاڑ پر سے ایک ندی بڑے زور و شور سے بہہ رہی تھی چندا وہیں رک گیا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ وہ سامنے جو غار نظر آ رہا ہے وہی چڑیل کا مسکن ہے۔ اس کے بعد چندا اپنی جھونپڑیوں کی طرف لوٹ گیا۔ ندی کے ساتھ ساتھ ہم اور آگے بڑھے میں نے دوربین سے جو اس غار کو دیکھا تو میرا سانس رک گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے جو غار تھا وہ اس غار سے بالکل مشابہ تھا جس غار میں شیر ایشر سنگھ کو لے کر داخل ہوا تھا۔ پھر دوربین سے مسٹر براؤن اور سجان سنگھ نے غار کو دیکھا۔ حیرانی کے عالم میں ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مسٹر براؤن بولے۔ "عجیب طلسم خانہ ہے، یہ تو وہی غار ہے جس غار میں شیر ایشر سنگھ کو لے کر غائب ہوا تھا۔"

ہم اس غار کی طرف چل پڑے جب وہ غار تھوڑی دور رہ گیا تو ہم ایک درخت کے پیچھے چھپ کر اس غار کی طرف دیکھنے لگے۔ اف! میں وہ خوفناک منظر کبھی نہ بھولوں گا۔ غار سے ایک کیم شیم شخص نکلا۔ اس کے سر پر ایک برہنہ لاش تھی۔ اس نے لاش کو ندی کے کنارے رکھ دیا۔ ہم دیکھتے رہے جب سورج پہاڑ کی اوٹ میں غروب ہونے لگا تو اس غار سے ایک خوب صورت برہنہ عورت نمودار ہوئی۔ پھر وہ نوجوان حسینہ، لاش کے سینے پر بیٹھ کر نہانے لگی۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی حالت کا تو پتہ نہیں لیکن یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کیا واقعی دنیا میں چڑیل کا وجود ہے؟ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن پھر جلد ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور کانپتے ہاتھوں سے بندوق سیدھی کر کے اس چڑیل سے چند گز اوپر فضا میں فائر کر دیا۔ پہاڑوں کے بیچ گولی چلنے سے توپ کا سا دھماکا ہوا چڑیل لرز گئی۔ وہ لاش کو چھوڑ کر پاگلوں کی طرح ہماری طرف دیکھنے لگی۔ پھر بھاگ کر غار میں چھپ گئی۔ اسی لمحے ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور مسٹر براؤن کے ملازم کدار ناتھ کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ اسی دم مسٹر براؤن نے فائر کیا۔ وہ کیم و شیم آدمی زمین پر گرا اور پھر اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا۔ بجلی کی سی سرعت سے اس نے اپنی کمان سے ایک تیر اور چلایا جو سنسناتا ہوا میرے قریب سے گزر کر ہمارے اوپر درخت میں پیوست ہو گیا۔ وہ دوبارہ کمان پر تیر چڑھانے لگا۔ معاً میں نے مسٹر براؤن اور سجان سنگھ نے ایک ساتھ فائرنگ کر کے اسے زمین پر گرا دیا۔ ہم نے کئی منٹ انتظار کیا لیکن اس نے کوئی حرکت نہ کی۔

میں نے کدار ناتھ کے بازو سے تیر نکالا اور مرہم لگا کر پٹی باندھ دی۔ مسٹر براؤن نے کدار ناتھ سے کہا کہ تم زخمی ہو بھیلوں کی جھونپڑیوں میں چلے جاؤ پھر وہاں سے کسی بھیل کو ساتھ لے کر کیمپ میں پہنچ جانا۔ کدار ناتھ لڑکھڑاتے قدموں سے جھونپڑیوں کی طرف چلا گیا اور وہ کیم شیم

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

شخص اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔ ہم ڈرتے ڈرتے اس کے قریب پہنچے۔ مسٹر براؤن نے اسے ٹھوکر ماری۔ میں نے جھنجھوڑ کر دیکھا۔ ایک سیاہ دیو مرا پڑا تھا۔ اور اس کا گاڑھا گاڑھا خون بہہ کر ندی کی طرف جا رہا تھا۔ بہتے ہوئے لہو کے پاس ہی کراہیہ قبیلے کی ایک عورت کی برہنہ لاش پڑی تھی جس کی گردن پر تیز دانتوں کے نشان تھے۔ گردن کا لہو پی لیا گیا تھا۔

انہیں وہیں چھوڑ کر ہم چڑیل کے تعاقب میں غار میں داخل ہوئے۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہم نے ٹارچ روشن کر کے دیکھا۔ اس غار میں شیروں اور چیتوں کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور ان کھالوں کے فرش پر مرے ہوئے بچھوے، سانپوں کی کینچلی اور سوکھی ہوئی کئی انسانی کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ ایشر سنگھ کے کپڑے پڑے ہیں۔" سجان سنگھ چلایا پھر وہ سامنے ایشر سنگھ کی پگڑی اور انگرکھے کو دیکھ کر رو پڑا۔ ایک بھائی کی محبت دیکھ کر میں اور مسٹر براؤن بھی آبدیدہ ہو گئے اور پھر ایک انجانے خوف سے ہم کانپ اٹھے۔ اسی جگہ سہمی ہوئی وہ چڑیل کھڑی تھی۔ ہم اسے غار سے باہر لے آئے وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح ہمیں دیکھنے لگی۔

وہ نازک اندام اور بے حد حسین عورت تھی۔ اس کے حسن کو خوفناک پہاڑوں اور ہیبت ناک غاروں کی زندگی بھی پامال نہ کر سکی تھی۔ میں نے بندوق کی نالی اس کے سینے پر رکھ کر اسے بہت ڈرایا دھمکایا کہ بتاؤ تم کون ہو اور اس خوف ناک کہانی کا پس منظر کیا ہے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح پلک جھپکائے بغیر ہمیں دیکھتی رہی۔ اس کے حسین چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ ہمیں اس پر ترس آنے لگا اور ہم اس درندہ صفت عورت کی بھولی صورت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسے زیادہ تکلیف اور ایذا دینا ہمارے بس سے باہر تھا۔ وہ حسرت و یاس کا مجسمہ بنی ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ اتنے میں سجان سنگھ غار سے ایک ڈائری لے کر نکلا۔

اس ڈائری میں ہندی زبان میں لکھا تھا۔ "میں ایک کروڑ پتی سیٹھ کی اکلوتی اور بمبئی کی رہنے والی ہوں۔ میرے پتی دیو چتر سنگھ کا دیس جودھپور ہے۔ میرا پتی دیو بہت سندر ہے لیکن اس کا من سیاہ ہے۔ وہ بڑا دھوکہ باز اور بے وفا ہے۔ جادوگر نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر تم نے چالیس انسانی لاشوں پر بیٹھ کر اشنان کر لیا تو پھر تمہارا پتی دیو اپنی محبوبہ طوائف کو چھوڑ کر تمہارے چرنوں میں آ گرے گا اور پھر تمہارے ایک چاند سا بیٹا پیدا ہو گا۔ جادوگر کے پاس ایک پالتو چیتا ہے۔ وہ سدھایا ہوا ہے۔ یہ چیتا، ہرن سانبھر اور انسان کو شکار کر کے لے آتا ہے اور میں اس آدمی کی لاش پر بیٹھ کر اشنان کرتی ہوں اور پھر چلہ کشی میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ جادوگر مجھ سے بہت پریم کرتا ہے لیکن مجھے اس کی خوفناک صورت سے نفرت ہے۔ میرے پتی دیو کے پیار نے اور اس جادوگر نے مجھے درندہ بنا دیا ہے۔"

سجان سنگھ کی زبانی ڈائری کا مضمون سن کر مسٹر براؤن کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے کہا کہ میرے دوست رابرٹ اور ایشر سنگھ کا قاتل، مقتول جادوگر کا تربیت یافتہ چیتا ہے، یہ پری چہرہ

عورت خاوند کی محبت کی ماری ہوئی نفسیاتی مریض ہے۔ اسے محبت کی آگ نے انتہا پسند بنا دیا ہے۔ اب یہ بالکل پاگل ہے ظالم جادوگر نے اپنے جال میں پھنسا کر اس معصوم عورت کی انسانیت مسخ کر دی ہے۔ میرا خیال ہے یہ جادوگر بھی توہم پرست اور دیوانہ تھا اور بالکل درندہ۔ وہ اس پاگل عورت کی دیوانگی سے فائدہ اٹھاتا رہا۔

ہم اس عورت کو جادوگر کی لاش پر لے گئے۔ وہ پاگلوں کی طرح لاش سے چمٹ کر رونے لگی۔ مسٹر براؤن نے ہاتھ پکڑ کر اسے جادوگر کی لاش پر سے اٹھایا۔ اس کی پیشانی پر بکھری ہوئی خشک اور سیاہ زلفیں اور اس کا خوبصورت چہرہ جادوگر کے خون سے بھر گیا۔ بڑا کربناک منظر تھا۔ چاند نکل آیا تو ہم نے اپنی ٹارچیں گل کر دیں۔ مسٹر براؤن نے کہا۔ "آؤ چیتے کو تلاش کریں۔ اس بھٹی سے بعد میں نمٹیں گے۔" ہم پہاڑ پر چڑھ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ محبوب خاں چلایا۔ "دیکھئے صاحب وہ عورت جادوگر کی لاش کو ندی میں ڈال رہی ہے۔" پہاڑ سے اتر کر ہم ندی کی طرف دوڑے اسی لمحے جادوگر کی لاش کے ساتھ وہ عورت ندی میں کود گئی۔ ایک دفعہ وہ پانی کی لہروں میں ابھری اور پھر تیز بہتے ہوئے پانی کی ایک طوفانی موج اسے اور جادوگر کی لاش کو پہاڑ سے نشیب کی طرف بہا کر لے گئی۔ مسٹر براؤن کو بڑا صدمہ ہوا کہ ہماری غفلت سے اس وحشت ناک کہانی کا اصلی کردار ختم ہو گیا۔ وہ مہ جبیں زندہ رہتی تو بہت پراسرار واقعات کا انکشاف ہوتا۔ چیتے کی تلاش میں ہم پھر پہاڑ پر چڑھ گئے۔

مسٹر براؤن کے پاؤں کے قریب ایک سانپ نے پھنکار ماری۔ محبوب خاں نے بجلی کی سی تیزی سے اس پانچ فٹ لمبے ناگ کی گردن پکڑ لی۔ سانپ اس کے بازو سے لپٹ گیا۔ محبوب خاں نے چاند کی چاندنی میں ناگ کے پھن کو ایک پتھر پر ملنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سر کا کچومر نکل گیا۔ سانپ مر گیا۔ محبوب خاں کی جرأت اور حوصلے کو دیکھ کر مجھے بہت رشک آیا کیونکہ سانپ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہم تمام رات جاگتے رہے۔ دن نکلا تو ہم نے حسب معمول جنگلی مرغ بھون کر کھائے اور پھر باری باری جادوگر کی غار کی شیر کی کھال کے فرش پر سوئے۔ چیتا دن میں بھی نہیں آیا۔ ہم نے غار میں دو دن اور دو راتیں گزاریں لیکن چیتا نہ آیا۔

اگلے روز شام کو کھانا کھا کر ہم چیتے کی تلاش میں نکلے تو اچانک بھیلوں کی جھونپڑیوں کی طرف گیدڑوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ میں نے کہا۔ "ہمیں چوکنا اور ہوشیار رہنا چاہیئے کہیں مسٹر رابرٹ اور ایشر سنگھ کی طرح چیتا ہمیں بھی اپنا لقمہ نہ بنا لے کیونکہ گیدڑوں کی یہ چیخی آواز بے معنی نہیں ہے۔" ہم پہاڑی جھاڑیوں سے نکل کر غار کے پاس آ گئے۔ غار کے قریب آہٹ سی ہوئی۔ گھپ اندھیرا تھا کیونکہ اس وقت تک چاند نہیں نکلا تھا۔ پھر غار کے پاس چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی میں نے بندوق پر چڑھی ہوئی ٹارچ روشن کی بڑا لرزہ خیز منظر تھا۔ بالکل شیر کے مشابہ ایک چیتا ایک آدمی کی گردن کا خون پی رہا تھا۔ اس آدمی کو چھوڑ کر چیتے نے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ہماری طرف دیکھا۔ اس کی چمکدار آنکھوں سے چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ میری بندوق سے شعلہ نکلا۔ چیتا اچھلا۔ زمین پر گرا اور پھر اٹھ کر جو جست لگائی تو میری بندوق پر اس زور کا پنجہ مارا کہ بندوق ہاتھ سے گر پڑی۔ میں نے اندھیرے میں زور سے مکہ مارا۔ وہ چیتے کے جسم پر لگا اور اسی وقت محبوب خاں نے اپنا چاقو اس کے جسم میں گھونپ دیا۔ چیتا گھبرا کر بھاگ پڑا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ ہم میں سے کوئی ٹارچ روشن نہ کر سکا۔ خدا کا فضل شامل حال تھا جو ایک خونخوار درندے سے دوبدو مقابلے میں ہماری نکسیر تک نہ پھوٹی۔ میں نے بندوق اٹھائی اور پھر ہم غار کے پاس چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں گئے وہ بدقسمت آدمی مر چکا تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کر کے چہرہ دیکھا۔ اس کا منہ دیکھتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا اور پھر خوف سے سانس رک گیا۔ وہ بھیل سردار کا بھائی چندا تھا۔ چندا کی لاش دیکھ کر مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ بڑا بھیانک منظر تھا۔ کیا واقعی بقول بھیل سردار کے وہ ندی میں کودنے والی حسینہ چڑیل تھی؟ اس نے چیتے کا روپ دھار کر غار کا پتہ دینے والے چندا کو ہلاک کر کے اس کا خون پی لیا تھا۔ نہ جانے مجھ میں کہاں سے ہمت آئی کہ میں اپنے ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود بھیلوں کی جھونپڑیوں کی طرف چل دیا۔

میں ہر طرف سے چوکنا تھا۔ جھاڑی کا پتا بھی ہلتا تو میں فائر کرنے کے لیے بندوق کی لبلبی پر ہاتھ لے جاتا تھا۔ کچھ دور چلا تھا کہ پہاڑ کی اوٹ سے چاند کا روشن چہرہ نمودار ہوا۔ میں جھونپڑیوں میں پہنچا تو وہاں کہرام مچ رہا تھا۔ بھیل سردار مجھے دیکھتے ہی چیخ مار کر رو پڑا۔ میں نے اسے تسلی دی تو وہ کہنے لگا کہ میں نے بہت سر پیٹا کہ آپ لوگ ہم سے مدد نہ لیں اور چڑیل کو ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کر دیں لیکن میرے بھائی کو آپ لوگوں نے مروا دیا ہے۔ چیتے کے روپ میں چڑیل اسے چارپائی سے اٹھا کر لے گئی۔

میں نے سردار سے کہا کہ یہ اتفاق ہے جو چیتے نے تمہارے بھائی کو ہلاک کیا ورنہ ہم نے چڑیل اور اس کے گرو جادوگر کو ہلاک کر کے ندی میں ڈبو دیا ہے اور جادوگر کے سدھائے ہوئے چیتے کو زخمی کر کے اس سے چندا کی لاش کو چھڑا لیا ہے یہ بات سن کر بھیل سردار چند بھیلوں کو ساتھ لے کر میرے ہمراہ غار پر پہنچا اور پھر چندا کی لاش سے چمٹ کر زار زار رونے لگا۔ مسٹر براؤن نے اسے تسلی دی کہ رونے سے کچھ نہیں بنتا اب تم ہمارے ساتھ چلو تاکہ چیتے کو تلاش کر کے اس سے انتقام لیں۔ بھیل سردار نے چندا کی لاش کو جھونپڑیوں میں بھیج دیا اور خود چیتے کے خون کے نشان کے ساتھ ساتھ ہمیں اس غار کے دہانے پر لے گیا جس غار میں چیتا ایشر سنگھ کو لے کر داخل ہوا تھا۔

چاند چھپ گیا اور دن نکل آیا۔ اس غار میں تازہ خون کا نشان موجود تھا لیکن وہاں یہ چیتا نہیں تھا۔ سبحان سنگھ نے منہ بنا کر کہا مانو نہ مانو وہ چڑیل اور یہ چیتا ایک ہی چیز ہے چڑیل ندی میں کود کر پھر چیتے کی جون میں چندا کو شکار کر کے ہمارے پاس آئی اور پھر ہم تین تجربہ کار شکاریوں کو جل دے کر

خون کا نشان چھوڑتی ہوئی ہمیں اس غار پر لے آئی جہاں رابرٹ کو ہلاک کیا اور میرے بھائی ایشر سنگھ کی لاش کو پراسرار طور پر غائب کر دیا تھا"

جادوگر کی موت پہاڑی غار میں ڈائری کا ملنا ہمیں دھوکہ دینے کے لیے اس ڈائری کے صرف ایک صفحہ پر انوکھی تحریر اس چڑیل کا پاگل بن جانا اور پھر ہمیں الو بنا کر معہ جادوگر کی لاش کے ندی میں کود جانا یہ سب ایک عجیب و غریب طلسم خانے کی کڑیاں ہیں یہ ضرور کوئی بلا ہے موقع محل کی رو سے سبحان سنگھ کی باتیں معقول تھیں اس کی یہ گفتگو سن کر میرا دل ڈوبنے لگا میں نے درود شریف پڑھا میرے قلب میں غیر معمولی قوت عود کر آئی میں نے سبحان سنگھ سے کہا۔ "میں مسلمان ہوں میں ان بے معنی باتوں کو نہیں مانتا جب تک میری جان میں جان ہے میں چیتے کی تلاش جاری رکھوں گا۔" مسٹر براؤن نے میری تائید کی۔

میں نے پھر غار کا بغور جائزہ لیا خدا نے مدد کی معمہ حل ہو گیا غار کی چھت میں ایک بہت بڑا سوراخ پہاڑی جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس میں چھپا ہوا تھا گھاس پر کہیں کہیں تازے خون کے جمے ہوئے بڑے بڑے داغ تھے۔ تحقیقات سے ثابت ہوا کہ چیتا انسان کو ہلاک کر کے لاش کو غار کے اس سوراخ کے راستے جادوگر کی غار میں لے جانے کا عادی ہے۔ ہم آگے بڑھے تو زخمی چیتے کے لہو کا تازہ نشان درے کے سامنے اونچے اور گھنے درختوں کے جھنڈ میں جا کر ختم ہو گیا جھنڈ میں اندھیرا تھا ہم ٹارچ روشن کر کے اندر داخل ہوئے گھاس میں آہٹ ہوئی۔ چیتا غراتا ہوا گھاس میں سے نکلا اور محبوب خاں کو ساتھ لے کر پہاڑ کی اترائی پر لڑھکتا ہوا چلا۔ ان کے ساتھ ہی بجلی کی سی سرعت سے میں پہاڑ کی اترائی پر پھسلا اور پھر کمال پھرتی سے میں نے اپنا شکاری چاقو چیتے کی شہ رگ میں گھونپ دیا فوراً چیتے کا پیٹ پھاڑ دیا اس کی آنت او جھڑی باہر نکل آئیں۔

جس وقت مسٹر براؤن اور سبحان سنگھ میری مدد کو آئے میں طلسمی چیتے کو ہلاک کر چکا تھا ان لوگوں نے مجھے بڑی داد دی محبوب خان بولا۔ "آپ لوگ میری فکر نہ کریں میں ٹھیک ہوں۔" وہ بڑا بہادر تھا ہم نے دیکھا کہ وہ چیتا بالکل مثل شیر تھا اس کا تمام جسم گہرے پیلے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور اس کے بدن پر جا بجا بل کھاتی ہوئی کالے رنگ کی دھاریاں تھیں۔ وہ قد کاٹھ میں چیتوں سے بڑا اور دیکھنے میں شیر ہو پالنے کے لیے چیتے کے انتخاب میں ہم جادوگر کو داد دیے بغیر نہ رہ سکے میری پہلی گولی نے اس کا سینہ پھاڑ دیا تھا اور محبوب خاں کے چاقو کا اس کے سر میں زخم تھا اس کے باوجود اس سخت جان درندے نے ہمیں اس قدر تنگ کیا۔

ہم چڑیل کی ڈائری اور جادوگر کا تمام سامان اور چیتے کی لاش لے کر کوہ آبو پہنچے ایجنٹ برائے گورنر جنرل راجپوتانہ نے جادوگر کا سامان اور چیتے کی لاش دیکھی پھر ہندی میں لکھا ہوا ڈائری کا مضمون سنا اور جب مسٹر براؤن نے انہیں چڑیل کی پراسرار داستان سنائی تو وہ حیران و ششدر رہ گئے انہوں نے فوراً تحقیقات کے لیے ایک پولیس افسر کو جودھپور بھیجا تیسرے دن وہ پولیس آفیسر چتر

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

سنگھ کو ساتھ لے کر کوہ آبو آیا

چتر سنگھ بڑا چھیلا اور وجیہہ جوان تھا چتر سنگھ نے اسسٹنٹ برائے گورنر جنرل کو آبدیدہ ہو کر یہ رودادِ سنائی میں نے بمبئی میں ایک سیٹھ کی لڑکی سے سول میرج کر لی تھی وہ تعلیم یافتہ لڑکی میری ہم مذہب تو تھی لیکن ہماری ذات کی نہ تھی میں راٹھور خاندان سے ہوں راٹھوروں نے میری شادی کے خلاف سخت احتجاج کیا مگر میں نے پرواہ نہ کی۔ بدقسمتی سے میری دھرم پتنی کہ کوئی بچہ نہ ہوا میرے خاندان کے لوگ پہلے ہی اس سے نفرت کرتے تھے پھر انہوں نے بچہ نہ ہونے کا بہانہ تراش کر مجھے تنگ کرنا شروع کیا کہ اس لڑکی کو طلاق دو اور اپنی ذات میں دوسری شادی کرو میں دوسری شادی پر آمادہ نہیں تھا کیونکہ مجھے اس لڑکی سے اور اس لڑکی کو مجھ سے والہانہ محبت تھی پھر میرے خاندان کی عورتوں نے طعنہ زنی سے لڑکی کو تنگ کرنا شروع کیا اور اسے یہ یقین دلایا کہ چتر سنگھ دوسری شادی اس لیے نہیں کرتا کہ وہ جے پور کی ایک طوائف کی محبت میں گرفتار ہے چونکہ وہ لڑکی مجھ سے غیر معمولی محبت کرتی تھی اس لیے رقابت کے خیال سے اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ پاگل ہو گئی میں نے بہت علاج کرایا لیکن وہ اصلی حالت پر نہ آئی اور ایک روز رات کو وہ میرے گھر سے غائب ہو گئی میں نے ملک کا کونہ کونہ چھان مارا۔ مجھے صرف اتنا پتہ چلا کہ تاراگڑھ میں ایک چتادھاری سادھو کے پاس اس شکل کی لڑکی کو دیکھا گیا اور وہ سادھو چیتوں کے بچے پالتا ہے میں تاراگڑھ پہنچا۔ وہ پراسرار سادھو میری حسین بیوی کو لے کر فرار ہو چکا تھا میں نے پہاڑوں اور جنگلوں کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن مجھے میری بیوی اور وہ سادھو نہیں ملا۔

میری زبانی اپنی بیوی کی خونی اور ڈرامائی داستان سن کر چتر سنگھ رو پڑا۔ ہم نے اسے تسلی دی وہ غم زدہ ہو کر چلا گیا اسی وقت ایجنٹ گورنر جنرل نے مجھے سو روپے اور مسٹر براؤن اور سبحان سنگھ کو چار چار سو روپے انعام دیا۔

دستِ قضا

"میرا خیال ہے کہ آپ اب جلدی ہی چلے جائیں گے پروفیسر صاحب، کیونکہ ایام تعلیم تو پورے ہو چکے ہیں۔" اونٹو گرائی کے پروفیسر سے ایک ایسے شخص نے کہا جو اس کہانی میں شامل نہیں ہے۔ سینٹ جیمز کالج کے ہال میں ایک دعوت کا اہتمام تھا جہاں وہ پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ پروفیسر جوان، صفائی پسند اور کم گو تھا۔

"ہاں" اس نے کہا۔ "میرے دوستوں نے مجھے کچھ دنوں کے لیے گولف کھیلنے کی دعوت دی ہے، لہٰذا میں مشرقی ساحل کی طرف یعنی برنسٹو جانے کا ارادہ رکھتا ہوں جہاں میں اپنے کھیل کی مشق کے لیے ہفتہ عشرہ قیام کروں گا۔ امید ہے میں کل روانہ ہو جاؤں گا۔"

"پارکنس صاحب" پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ "اگر آپ برنسٹو جا رہے ہیں تو وہاں ٹیمپلرز کی مذہبی درسگاہ کی عمارت ضرور دیکھئے اور پھر مجھے بتایئے گا کہ گرمیوں میں وہاں قیام کرنا کیسا رہے گا۔"

جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں یہ الفاظ ایک ایسے شخص نے کہے جو آثارِ قدیمہ کی تفتیش میں دلچسپی رکھتا تھا لیکن اس کا ذکر محض اس تمہید میں ہوا ہے لہٰذا اس کے بارے میں مزید بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

"بے شک" پروفیسر پارکنس نے کہا۔ "اگر آپ مجھے اس جگہ کے متعلق کچھ تفصیل بتائیں تو میں واپس آ کر آپ کو اس علاقے کی صورت حال سے باخبر کروں گا یا اگر آپ اپنا پتا دے دیں تو خط

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کے ذریعے آپ کو مطلع کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ کو اتنی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں، شکریہ میں تو ان دنوں یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنے اہل و عیال کو لے کر اسی علاقے میں لے جا کر قیام کروں۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ انگلستان کی اکثر مذہبی درسگاہوں کا نظام ٹھیک نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے چھٹیوں میں کچھ مفید کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

پروفیسر نے اس خیال کو در خور اعتنانہ سمجھا کہ کسی مذہبی درس گاہ کو منظم کرنا ایک مفید کام ہے۔ اس کا ہمسایہ بولتا گیا۔

"یہ جگہ 'جہاں میرے خیال میں شاید کوئی بھی چیز زمین سے بلند نہیں ہے، اب ضرور کھاڑی سے قریب تر ہوگی۔ آپ کو معلوم ہے کہ سمندر ساحل کے اس حصے میں اپنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کر گیا ہے۔ نقشے کے مطابق قصبے کے شمالی سرے پر واقع سرائے "گلوب ان" سے ساحل کوئی تین چوتھائی میل کے فاصلے پر ہوگا۔ آپ کہاں ٹھہریں گے؟"

"گلوب ان میں ہی قیام کرنے کا پروگرام ہے۔" پارکنس نے کہا۔ "میں نے وہاں ایک کمرے کا انتظام کر لیا ہے۔ کسی اور جگہ رہائش کا بندوبست نہیں ہو سکا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سردیوں میں بہت سی رہائش گاہیں بند ہو جاتی ہیں۔ وہاں بھی صرف ایک ہی کمرہ خالی تھا جس میں دو پلنگ پڑے ہیں اور ان کے ہاں کوئی اور ایسا کونا نہیں جہاں دوسرا پلنگ رکھا جا سکے۔ میں خود بھی بڑا کمرہ ہی پسند کرتا ہوں کیونکہ میں اپنی کتابیں بھی ساتھ لے جا رہا ہوں اور کچھ لکھنے کا کام بھی کرنے کا ارادہ ہے۔ اگرچہ میں اپنے مطالعے کے وقت میں دو خالی پلنگ تو کیا ایک کا بھی تصور نہیں کر سکتا تاہم میرا خیال ہے کہ میں وہاں اپنے عارضی قیام کے دوران کسی نہ کسی طرح گزارا کر ہی لوں گا۔"

"آپ اپنے کمرے میں ایک فالتو بستر رکھنے کو پسند نہیں کرتے۔" سامنے بیٹھے ہوئے ایک اکھڑ شخص نے کہا۔ "اچھا تو پھر میں وہاں آ جاؤں گا اور کچھ عرصہ قیام کروں گا۔ اس طرح آپ کا ساتھ بھی ہو جائے گا۔"

پروفیسر نے ذرا تامل کیا اور پھر خوش اخلاقی سے قہقہہ لگایا۔

"بڑی خوشی سے راجرس۔ اس سے زیادہ مجھے اور کیا پسند ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ آپ اس طرح شاید کچھ بے لطفی محسوس کریں۔ کیا آپ گولف کھیلتے ہیں؟"

"نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نہیں کھیلتا۔" اکھڑ مزاج مسٹر راجرس نے کہا۔

"دیکھئے جب میں لکھ نہیں رہا ہوتا تو میرا زیادہ وقت گولف کے میدان میں گزرتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس صورت میں آپ کچھ نہ کچھ بے لطفی ضرور محسوس کریں گے۔"

"خیر میں کہہ نہیں سکتا! مجھے یقین ہے کہ اس جگہ میرا کوئی نہ کوئی واقف نکل آئے گا لیکن اگر آپ میرا وہاں آنا پسند نہیں کرتے تو صاف کہہ دیجئے' میں برا نہیں مانوں گا۔ آپ ہمیشہ ہمیں بتاتے

رہے ہیں کہ سچائی بھی ناپسندیدہ نہیں ہوتی۔"

پارکنس بلاشک ایک مہذب اور صداقت پسند شخص تھا اس کے سینے میں اس وقت ایک چبھن سی تھی جس کے باعث وہ ایک دو لمحوں تک جواب دینے سے قاصر رہا۔ یہ وقفہ گزرنے پر اس نے کہا۔

"اگر آپ سچائی ہی سننا چاہتے ہیں تو سنئے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ آیا وہ کمرہ واقعی اتنا بڑا ہے کہ ہم دونوں وہاں آرام سے رہ سکیں گے۔ مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ کہیں اس طرح میرے کام میں حرج تو نہیں ہوگا۔"

راجرس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"چلئے بات ہو گئی!" اس نے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے کام میں مخل نہیں ہوں گا۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر رہیں۔ اور اگر آپ پھر بھی میرا ساتھ پسند نہیں کرتے تو میں نہیں آؤں گا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں بھوتوں کو بھگانے کے سلسلے میں بڑی حد تک آپ کے کام آ سکتا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص کو کہنی سے ٹھوکا دیا اور آنکھ سے اشارہ کیا۔ پارکنس کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا۔ "معاف کرنا پارکنس" راجرس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھ ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ دراصل مجھے یاد نہیں رہا کہ آپ اس موضوع پر کچھ کہنا سننا پسند نہیں کرتے۔"

"بالکل" پارکنس نے کہا۔ "جیسا کہ آپ نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے' میں یہ بخوشی تسلیم کرتا ہوں کہ میں بھوتوں وغیرہ کے متعلق الٹی سیدھی باتیں قطعاً پسند نہیں کرتا۔ میری حیثیت کا آدمی" اپنی آواز کو ذرا بلند کرتے ہوئے وہ کہتا گیا۔ "اس قسم کے اعتقادات کو تسلیم کر بھی نہیں سکتا۔ آپ جانتے ہیں مسٹر راجرس' یا کم از کم آپ کو معلوم ہونا چاہیے، کہ میں اپنے نظریات کے اظہار میں کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتا۔"

"درست ہے، آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا بزرگوار" راجرس نے دبی زبان سے کہا۔

"میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ایسی چیزوں کے وجود کے نظریے سے اگر ذرا بھی رعایت برتی گئی یا اس پر توجہ دی گئی تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں نے ان اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے جو میرے خیال میں بڑے مقدس ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں آپ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہوں۔"

"آپ کی مکمل توجہ کا حاصل وہی ہے جو ڈاکٹر بلمر نے بتایا ہے۔" راجرس نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن معاف کرنا پارکنس، میں نے قطع کلامی کی۔"

"نہیں کوئی بات نہیں" پارکنس نے کہا۔ "مجھے بلمر کا نام یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ مجھ سے پہلے گزرا ہو۔ لیکن مجھے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہیں۔"

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

"ہاں 'ہاں"۔ راجرس نے قدرے عجلت سے کہا۔ "بالکل ٹھیک۔ برنستو میں کہیں اور ہمیں ان باتوں سے اچھی طرح واسطہ پڑے گا۔"

مندرجہ بالا گفتگو کے حوالے سے میں نے یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ پارکنس کے اطوار کسی بڑھیا کی طرح...... بلکہ ایک مرغی جیسے تھے یعنی اپنے روزمرہ کے طور طریقوں کے لحاظ سے وہ شاید بالکل جامد تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بے خوف اور اپنے احساسات میں مخلص اور قابلِ احترام شخص تھا۔ پارکنس کے کردار کا یہی خلاصہ ہے خواہ قارئین اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں۔

اگلے روز پارکنس امید کے مطابق کالج سے چلے جانے اور برنسٹو پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ "گلوب ان" میں اسے خوش آمدید کہا گیا۔ اس کے لیے مذکورہ دو بستروں والا کمرہ ٹھیک ٹھاک کر دیا گیا۔ آرام کرنے سے پہلے اس نے اپنی تمام چیزیں قرینے سے ایک کونے میں بڑی میز پر رکھ دیں۔ کمرہ تینوں جانب سے کھڑکیوں سے گھرا ہوا تھا جو سمندر کی طرف کھلتی تھیں یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ مرکزی کھڑکی سیدھی سمندر کے رخ پر واقع تھی۔ دائیں اور بائیں دونوں کھڑکیوں سے ساحل کے جنوبی اور شمالی حصوں کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ جنوب کی طرف برنسٹو کی بستی نظر آتی تھی اور شمالی رخ پر کوئی مکان نہیں تھا بلکہ ساحل کے کنارے نیچی چٹانیں دکھائی دیتی تھیں۔ بالکل سامنے کے رخ پر گھاس کا طویل قطعہ پھیلا ہوا تھا جس کے قریب کہیں کہیں پرانے لنگر، چرخیاں اور اس قسم کی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ایک پگڈنڈی گذرتی تھی جس سے پرے کھاڑی کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ ساحلِ سمندر اور گلوب ان کے درمیان پہلے خواہ کتنا ہی فاصلہ ہو لیکن اب ان کا فاصلہ ساٹھ گز سے زیادہ نہیں تھا۔

سرائے میں جو لوگ مقیم تھے وہ زیادہ تر گولف کے کھلاڑی تھے۔ البتہ چھ افراد ایسے تھے جو خصوصی تعارف کے محتاج تھے۔ سب سے زیادہ نمایاں شخصیت ایک معمر فوجی کی تھی جو لندن کے کسی کلب کا سیکرٹری تھا۔ اس کی آواز بڑی بلند تھی اور وہ اپنے نظریات کے مطابق واضح طور پر پروٹسٹنٹ تھا۔ اس کے عقائد اس وقت خاص طور سے نمایاں ہوتے جب وہ پادری کے وعظ سنتا۔ یوں اسے دلآویز مذہبی رسوم سے لگاؤ تھا اگرچہ وہ اپنی روایت کے مطابق اس دلچسپی کو زیادہ واضح نہ ہونے دیتا تھا۔

پروفیسر پارکنس نے جس کی نمایاں خوبی جرأت تھی، برنسٹو آنے کے اگلے دن کا زیادہ حصہ اس کرنل ولسن کے ساتھ اپنے گولف کے کھیل کو بہتر بنانے میں گذارا تھا اور دوپہر کے بعد شاید یہ اس کے بہتر کھیل کا نتیجہ تھا...... کرنل کا رنگ اتنا پھیکا پڑ گیا کہ پارکنس کے لیے گولف کے میدان سے اس کے ہمراہ گھر واپس آنے کے خیال سے وحشت ہونے لگی۔ تنی ہوئی مونچھوں اور دھوپ کھائے چہرے پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس نے بہتر یہی سمجھا کہ چائے اور تمباکو نوشی سے کرنل

کی طبیعت بحال ہونے کا موقع دیا جائے تاکہ رات کے کھانے پر اس سے ملاقات ہو تو وہ ہشاش بشاش نظر آ سکے۔ چنانچہ وہ اس سے جدا ہو گیا۔

"آج میں غالباً کھاڑی کے ساتھ چلتے ہوئے گھر جاؤں گا۔" اس نے سوچا...... "ٹھیک ہے، اس طرح دن کی روشنی میں کھنڈرات بھی دیکھ لوں گا جن کا ڈزنی نے ذکر کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں لیکن توقع ہے کہ میں ان سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

یہ بات اس کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ اس کا پاؤں ایک خاردار پودے کی جڑ سے الجھتا ہوا ایک بڑے پتھر سے ٹکرا گیا اور وہ اس کے اوپر گر پڑا۔ جب وہ اٹھا اور اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی حد تک شکستہ زمین کے قطع پر ہے جس میں جابجا چھوٹے گڑھے اور ابھار پائے جاتے ہیں۔ بغور دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ محض پتھر کے تودے ہیں جو چونے کے پلستر سے ڈھکے ہوئے ہیں اور ان پر گھاس اگی ہوئی ہے۔ وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوتا تھا کہ اسے اپنی سیاحت کا انعام مل گیا تھا۔ اکثر بنیادیں زیادہ گہری نہ تھیں جس سے عمارت کی شکل و صورت کا خاصا اندازہ ہو سکتا تھا۔ اسے مدھم سی یاد آئی کہ اس عمارت کے بنانے والوں کا دستور تھا کہ وہ گول گرجے تعمیر کیا کرتے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اکثر بکھرے ہوئے آثار دائرے کی شکل میں نظر آتے تھے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے شعبے سے باہر شوقیہ طور پر تحقیقی کام کرنے کی کوشش سے باز رہ سکیں گے۔ مگر پروفیسر نے تو مسٹر ڈزنی کو خوش کرنے کی غرض سے صحیح معنوں میں تحقیق کی کوشش کی۔ اسے خود بھی ایسے کاموں کا کچھ نہ کچھ شوق تھا۔ لہٰذا انہوں نے گول رقبے کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیا اور اپنی نوٹ بک میں اندازے سے اس کی پیمائش کا اندراج کیا۔ پھر وہ اس مستطیل شکل کے ابھار کو جانچنے کے لیے آگے بڑھا جو دائرے کے مرکز سے مشرق کی طرف واقع تھا۔ اس نے سوچا کہ یہاں چبوترہ یا قربان گاہ بنی ہو گی۔ اس کے شمالی سرے پر پلستر کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا تھا جو شاید کسی لڑکے یا کسی جانور کی کارستانی تھی۔ اس نے خیال کیا کہ یہاں سے مٹی ہٹا کر معماری کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس نے اپنا چاقو نکال کر اس جگہ سے مٹی کو کھرچنا شروع کر دیا اور اب ایک اور چیز دریافت ہوئی، یعنی مٹی کا کچھ حصہ اندر کی طرف گرا اور ایک چھوٹے سے خلا کا انکشاف ہوا۔ اس نے دو ایک دیا سلائیاں جلا کر یہ دیکھنا چاہا کہ وہ کس قسم کا سوراخ ہے لیکن تیز ہوا کے سامنے اس کی پیش نہ چلی۔ چاقو کی مدد سے مزید کھرچنے اور آس پاس ٹھوکے دینے سے تاہم وہ یہ دیکھنے کے قابل ہو گیا کہ اینٹوں میں ایک مصنوعی سوراخ بنا ہوا تھا جو مستطیل شکل کا تھا اور اس کے اندر اگرچہ پلستر نہیں کیا گیا تھا، پھر بھی اس کی تہ اور دیواریں ہموار اور متناسب تھیں۔ بظاہر وہ خالی تھا۔ نہیں! جونہی اس نے چاقو باہر نکالا اسے کسی دھات کی جھنکار سنائی دی اور جب اس نے ہاتھ ڈال کر دیکھا تو سوراخ کے فرش پر ایک نلکی جیسی چیز پڑی ملی۔ اسے اٹھا لینا ایک قدرتی امر تھا اور جب اسے روشنی میں دیکھا گیا، جواب مدھم ہوتی جا رہی تھی، تو پتا چلا کہ یہ بھی انسان کی بنائی ہوئی کوئی چیز تھی...... دھات کی بنی ہوئی کوئی چار

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

انچ لمبی ایک نلکی...... جو بظاہر کافی مدت سے وہاں پڑی ہوئی تھی۔

جب پارکنس کو یہ یقین ہو گیا کہ اب اس خلا میں اور کوئی چیز نہیں تو اس حد تک تاریکی چھا چکی تھی کہ مزید تحقیق کرنے کے لیے وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ غیر متوقع طور پر اتنا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ وہ اگلے دن کی روشنی میں آثارِ قدیمہ کے لیے تھوڑے سے اور وقت کی قربانی دینے کا ارادہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ دریافت شدہ چیز اب اس کی جیب میں محفوظ تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور ہو گی۔

گھر کی طرف روانہ ہونے سے پیشتر اس نے اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائی تو منظر بڑا ویران سا اور قدرے ہیبت ناک تھا۔ مغرب کی طرف مدھم اور زرد سی روشنی میں گولف کے میدان میں کچھ صورتیں کلب گھر کی طرف متحرک نظر آ رہی تھیں۔ ساحلی قلعے کا پست مینار قریب کے گاؤں کی روشنیاں اور ساحلی ریت کی پہلی پٹی بھی دکھائی دے رہی تھی جسے جا بجا سیاہ چوبی پشتے قطع کرتے تھے اس سے پرے ہلکی روشنی میں سمندر لہریں لیتا ہوا نظر آتا تھا۔ شمال کی جانب سے تیز ہوا چل رہی تھی جو گلوب ان کی طرف چلتے ہوئے اس کی پشت کے رخ پر تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا راستہ طے کر رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ٹمپلرز کے گرجے کے کھنڈرات سے کتنی دور آ چکا ہے اس نے آخری بار پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تو مدھم سی روشنی میں ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس کے پیچھے آ رہا ہے اور غالباً اس سے ملنے کی غرض سے تیز تیز قدم اٹھا رہا ہے لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ بدستور اتنا ہی رہا۔ پارکنس نے سوچا کہ وہ اسے نہیں جانتا ہو گا لہٰذا اس کا انتظار کرنا فضول ہے۔ ایسے موقعوں پر کوئی ساتھ چلنے والا ہو تو اچھا ہے بشرطیکہ آپ اسے جانتے ہوں۔ ماضی میں اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ اس قسم کی جگہوں پر بعض اوقات ایسی ملاقاتیں ہو جاتی ہیں جن کے متعلق انسان نے کبھی سوچا بھی نہ ہو۔ وہ ایسی ہی ملاقاتوں کے بارے میں سوچتا گیا حتیٰ کہ گھر پہنچ گیا۔ اسے خاص طور پر اس چیز کا خیال آتا تھا جو اکثر لوگوں کے بچپن میں وہم کی طرح ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ "میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک دیندار ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے ایک مکروہ صورت بھتنا دکھائی دیا جو کھیت کو پار کر کے اس کی طرف آ رہا تھا۔" "مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔" اس نے سوچا۔ "اگر میں پیچھے مڑ کر زرد آسمان کے پس منظر میں اس سائے کو دیکھ لیتا اور مجھے اس کے سینگ اور پر واضح نظر آتے تو کہہ نہیں سکتا کہ میں بھاگ کھڑا ہوتا یا وہیں رک جاتا؟ خوش قسمتی سے میرے پیچھے آنے والا بھلا آدمی اس قسم کا نہیں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے اب بھی اتنے فاصلے پر ہو گا، جتنے فاصلے پر وہ مجھے پہلے نظر آیا تھا۔ اور اگر وہ اسی رفتار سے چلتا رہا تو رات کے کھانے پر میری طرح جلد نہ پہنچ پائے گا۔ باپ رے! اب تو بمشکل پندرہ منٹ رہ گئے ہیں مجھے بھاگنا چاہیے!"

پارکنس کو لباس تبدیل کرنے کے لیے واقعی بہت تھوڑا وقت ملا۔ جب وہ کھانے کی میز پر

کرنل سے ملا تو وہ مطمئن اور ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ کھانے کے بعد تاش کھیلنے کے دوران بھی وہ اسی طرح رہا اور پارکنس نے کافی دیر تک پتوں سے دل بہلایا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ بہت رات گئے سونے کے لیے اٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ شام بڑے خوشگوار طریقے سے گزری ہے اور اگر اسی طرح کے حالات رہے تو گلوب ان میں دو تین ہفتوں کا قیام بڑا خوشگوار ہو گا...... "خصوصاً" اس نے سوچا۔ "اس صورت میں کہ گولف کی مشق جاری رکھوں۔"

جونہی وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اسے راستے میں سرائے کا خادم ملا جو اسے دیکھ کر ٹھہر گیا اور کہنے لگا!

"معاف کرنا جناب' ابھی تھوڑی دیر پہلے میں آپ کا کوٹ برش سے صاف کر رہا تھا کہ کوئی چیز اس کی جیب سے گر پڑی۔ میں نے وہ اٹھا کر آپ کی درازوں والی الماری پر رکھ دی ہے، جناب کسی پائپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ آپ الماری سے لے لیں صاحب۔ اچھا شب بخیر جناب۔"

اس گفتگو سے پارکنس کو یاد آ گیا کہ دن کے وقت اس نے ایک چھوٹی سے دریافت کی تھی۔ بڑے تجسس کے ساتھ وہ اسے موم بتیوں کی روشنی میں لے گیا۔ اب اس نے دیکھا کہ یہ کانسی کی بنی ہوئی ہے اور آج کل کے زمانے کی کتوں کو بلانے والی سیٹی سے ملتی جلتی ہے۔ واقعی یہ ایک سیٹی تھی۔ وہ اسے ہونٹوں تک لے گیا لیکن وہ مٹی اور ریت سے اٹی ہوئی تھی۔ اس لیے بج نہ سکی۔ اس نے چاقو کی مدد سے مٹی وغیرہ صاف کی۔ رات صاف اور روشن تھی اس نے کھڑکی کھولی اور تھوڑی سی دیر کے لیے سمندر کی طرف دیکھا۔ ایک تنہا راہگیر ساحل کے ساتھ ساتھ کسی انجانی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ وہ حیران تھا کہ برنسٹو کے لوگ اتنی رات گئے بھی سوئے نہ تھے۔ اس نے سیٹی کو پھر روشنی میں غور سے دیکھا۔ اس پر کچھ نشان تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حروف کھدے ہوئے تھے۔ ذرا سا رگڑنے پر کندہ عبارت صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ لیکن کچھ سوچنے کے بعد پروفیسر کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے لیے اس عبارت کا مفہوم اخذ کرنا محال تھا۔ سیٹی کی دونوں طرف کچھ نہ کچھ لکھا ہوا تھا۔

"میرے لیے اس کا مطلب سمجھنا ضروری ہے۔" اس نے سوچا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ میری لاطینی کچھ زنگ آلود ہو چکی ہے۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ سیٹی کو لاطینی زبان میں کیا کہتے ہیں۔ دوسری طرف کا فقرہ آسان معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب غالباً یہی ہے: "یہ کون ہے جو آ رہا ہے؟" خیر، بہتر یہ ہے کہ اسے جاننے کے لیے سیٹی بجا کر دیکھی جائے۔"

اس نے آزمائش کے لیے سیٹی بجائی اور ایک دم رک گیا۔ قدرے حیران ہونے کے باوجود وہ اس کی آواز سے خوش ہوا جو بہت دور تک پھیلنے کی صلاحیت رکھتی تھی' اور ترنم تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ سیٹی کی آواز کئی میل تک پہنچی ہو گی۔ یہ ایک ایسی آواز تھی جو ذہن میں صورتیں بنانے کی طاقت رکھتی ہے، جیسے کئی عطر اس کے اہل ہوتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے اس نے یہ منظر دیکھا کہ

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

رات کا وقت ہے اور چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ تازہ ہوا چل رہی ہے اور اس کے درمیان ایک تنہا صورت ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ منظر کیسے اس کے سامنے آ گیا ہے۔ اگر اس کی کھڑکی سے تیز ہوا کا ایک جھونکا ٹکرانے سے یہ "خواب" محو نہ ہو جاتا تو شاید وہ کچھ اور بھی دیکھتا۔ ہوا کا ریلا اتنا شدید تھا کہ اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔ عین اسی وقت کسی بحری پرندے کے پر کی سفید جھلک کھڑکی کے باہر دکھائی دی۔

سیٹی کی آواز اسے اتنی دلکش معلوم ہوئی کہ وہ اسے ایک دفعہ اور بجائے بغیر نہ رہ سکا اس دفعہ سیٹی ذرا زور سے بجائی گئی۔ مگر اب کوئی تصویر نظر نہ آئی حالانکہ اسے اس کی امید تھی۔ "لیکن یہ کیا بات ہے؟ چند ہی منٹوں میں ہوا اس قدر تیزی سے چلنے لگی! کتنا تیز جھکڑ ہے! میں نے سوچا تھا کہ چٹخنی لگانے کا کوئی فائدہ نہیں! دونوں موم بتیاں بجھ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمرہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔"

سب سے پہلے کھڑکی کو بند کرنے کی ضرورت تھی۔ جتنی دیر آپ بیس تک گنتی کریں پارکنس اس چھوٹی سی کھڑکی کے ساتھ کشتی کرتا رہا اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی تنومند چور کو پیچھے دھکیل رہا ہے۔ واقعی دباؤ بڑا سخت تھا۔ ایک دم ہوا کا زور ڈھیلا پڑ گیا۔ کھڑکی کے پٹ دھماکے کے ساتھ بند ہو گئے اور اپنے آپ چٹخنی لگ گئی۔ اب موم بتیاں پھر جلائی گئیں تاکہ دیکھا جائے کہ کچھ نقصان تو نہیں ہوا۔ لیکن سب کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ کھڑکی کا کوئی شیشہ بھی نہ ٹوٹا تھا۔ البتہ اس شور سے سرائے کا ایک مکین یعنی کرنل ضرور جاگ اٹھا تھا۔ اوپر کے فرش پر اس کے قدموں کی چاپ اور غصے سے بڑبڑانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ہوا پوری طرح رکی نہ تھی بلکہ اب بھی چیختی ہوئی تیزی سے چل رہی تھی۔ کبھی کبھی ہوا کی کوئی چیخ اتنی تیز سنائی دیتی تھی کہ پارکنس کے کہنے کے مطابق کئی وہمی لوگ بے چینی محسوس کرتے ہوں گے۔ پندرہ منٹ بعد اسے خیال آیا کہ وہمی لوگ ہی نہیں۔ اس ہوا کے بغیر ہر بھلے شخص کو خوشی ہوئی۔

شاید یہ ہوا تھی یا گولف کھیلنے کا جوش یا کھنڈرات میں تحقیق اس کا باعث تھی کہ پارکنس کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال وہ بہت زیادہ دیر تک جاگتا رہا۔ (میں بھی اکثر ایسی صورت حالات کے تحت سونے سے قاصر رہتا ہوں) وہ سوچنے لگا کہ وہ کسی مہلک پریشانی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس نے دل کی دھڑکنیں گننا شروع کر دیں۔ اسے وہم ہونے لگا کہ دل کی حرکت بند ہو جائے گی اور اس کے پھیپھڑے، دماغ اور جگر اپنا کام چھوڑ دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اسے یقین تھا کہ دن چڑھنے تک وہ ان توہمات کو زائل کر دے گا لیکن اس وقت وہ رفع ہونے سے انکار کر رہے تھے۔ البتہ اسے اس خیال سے ذرا اطمینان ہوا کہ اس کشتی میں کوئی اور بھی سوار ہے۔ قریب ہی کوئی شخص (تاریکی میں اس کی سمت بتانا آسان نہ تھا) اپنے بستر میں کروٹیں بدل رہا تھا۔

اس کے بعد پارکنس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سونے کا پکا ارادہ کر لیا۔ لیکن اب پھر بڑھے ہوئے جوش نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ یعنی اس کے سامنے عجیب عجیب تصویریں گھومنے لگیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لے تو تصویریں سامنے آ جاتی ہیں اور اگر کوئی ان سے گھبرا کر آنکھیں کھول دے تو وہ منتشر ہو جاتی ہیں۔ پارکنس کو اس موقع پر بڑا اذیت ناک تجربہ ہوا۔ اس کے سامنے جو تصویر آئی وہ یوں دکھائی دی جیسے مسلسل گھوم رہی ہو۔ جب اس نے آنکھیں کھول دیں تو وہ منظر غائب ہو گیا۔ لیکن جب اس نے دوبارہ آنکھیں بند کیں تو وہی منظر پھر اس کے سامنے آ موجود ہوا جو کہ پہلے کی نسبت تیز تھا نہ سست جو کچھ اس نے دیکھا وہ یہ تھا:

ساحل کا ایک لمبا قطعہ تھا..... سنگریزوں سے پرے ریت کی پٹی دکھائی دی جس پر جا بجا چوبی پشتے لگے ہوئے تھے۔ یہ منظر بڑی حد تک دوپہر کی سیر سے ملتا جلتا تھا۔ کیونکہ کوئی عمارت یا ایسی کوئی اور چیز دکھائی نہ دیتی تھی اس لیے اسے پہچاننا دشوار تھا۔ روشنی بڑی مدھم تھی جس سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ آندھی آنے والی ہے، دن کا پچھلا حصہ سرد رہے گا اور قدرے بارش بھی ہو گی۔ پہلے تو اس تاریک سطح پر کوئی اداکار نمودار نہ ہوا پھر دور سے کوئی سیاہ سی چیز ظاہر ہوئی جو جلد ہی ایک آدمی کی صورت اختیار کر گئی۔ وہ چوبی پشتوں کو پھلانگتا اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ جونہی وہ زیادہ قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ بری طرح خوفزدہ ہے مگر اس کا چہرہ پہچانا نہیں جاتا اس کے علاوہ وہ بڑا تھکا ہوا نظر آتا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، ہر رکاوٹ اسے پہلے سے زیادہ دشوار معلوم ہوتی تھی۔ "کیا وہ اس رکاوٹ کو عبور کر لے گا۔" پارکنس نے سوچا "یہ دوسروں کی نسبت ذرا اونچی لگتی ہے۔" لیکن وہ جوں توں کر کے اس پر چڑھ ہی گیا اور تقریباً گرتا ہوا اس طرف کود آیا۔ (اب وہ زیادہ قریب دکھائی دینے لگا) پھر یوں معلوم ہوا کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں اور وہ اوپر کی طرف بڑی فکرمندی سے دیکھتا ہوا پشتے کے نیچے ہی بے بسی سے پڑا رہا۔

اس وقت تک دوڑنے والے شخص کے ڈر کی وجہ کسی طرح ظاہر نہ ہوتی تھی، لیکن اب دور ساحل کی طرف سے کسی کے تیز چلنے کی جھلک دکھائی دی۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ کوئی شخص زرد اور پھڑ پھڑاتے ہوئے کپڑے پہنے چلا آ رہا ہے۔ اس کی نقل و حرکت میں کوئی ایسی بات تھی کہ پارکنس اسے قریب سے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ایک جگہ وہ رکا، بازو اوپر اٹھائے اور ریت کی طرف سر جھکایا۔ تب وہ اسی طرح کھاڑی پر سے پانی کی طرف دوڑا اور پھر واپس آ گیا۔ اب وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور پہلے سے زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ وہ دائیں اور بائیں چکر کاٹتا ہوا اس چوبی پشتے سے چند گز کے فاصلے پر پہنچ گیا جہاں پہلے بھاگ کر آنے والا چھپا ہوا تھا۔ دو تین بار ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ ایک جگہ ٹھہر گیا۔ ہاتھ اٹھائے اور پھر تیر کی مانند اسی چوبی پشتے کی طرف بھاگ کر گیا۔

اس مقام پر پہنچ کر پارکنس اپنی آنکھیں بند رکھنے میں ناکام رہا۔ آخر وہ اس ارادے سے اٹھا کہ

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

موم بتی جلا کر کوئی کتاب پڑھے اور اسی طرح جاگ کر رات گزار دے۔ اسے اس متواتر منظر سے بڑی کوفت ہو رہی تھی جو اس کی اپنی میز اور پراگندہ خیالات کو بار بار اس کے سامنے لا رہا تھا۔ دیا سلائی کی رگڑ اور روشنی کے شعلے سے رات کی مخلوق چونک اٹھی۔ وہاں چوہے تھے یا شاید کوئی اور چیز، بہرحال فرش پر تیزی سے کچھ حرکت ہوئی۔ لیکن یہ کیا! دیا سلائی تو بجھ گئی! دوسری تیلی اچھی طرح جلی اور ایک موم بتی اور ایک کتاب کا انتظام ہو گیا جس کے سہارے پارکنس نے خاصا وقت کاٹ لیا حتیٰ کہ گہری نیند نے اس پر غلبہ پا لیا اس کی باقاعدہ اور محتاط زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ جب اگلی صبح کوئی آٹھ بجے اسے آواز دی گئی تو شمعدان میں روشنی کی لو اب بھی جھلملا رہی تھی اور میز کی سطح پر موم جمی ہوئی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں گولف کھیلنے کا لباس تبدیل کر کے تیار ہو رہا تھا۔ قسمت نے کرنل کی صورت میں ایک اچھا سا ساتھی دیا تھا۔ ایک خادمہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"جناب کیا آپ اپنے بستر کے لیے مزید کمبل لینا پسند کرتے ہیں؟" اس نے دریافت کیا۔

"اوہ شکریہ" پارکنس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے ایک کمبل اور چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سردی کچھ بڑھ رہی ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں خادمہ ایک کمبل لے کر آ گئی۔

"کون سے بستر پر رکھوں جناب؟" اس نے پوچھا۔

"اسی بستر پر رکھ دو جہاں میں رات کو سویا تھا۔" پارکنس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجیے گا جناب، معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے دونوں بستر استعمال کیے ہیں لہٰذا آج دونوں کی چادریں بدلنی پڑیں گی۔"

"واقعی؟ بڑی عجیب سی بات ہے" پارکنس نے کہا۔ "لیکن میں نے تو دوسرے بستر کو چھوا بھی نہیں۔ البتہ اس پر کچھ چیزیں ضرور رکھی تھیں۔ کیا واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اس پر سویا ہوا تھا؟"

"بالکل، جناب" خادمہ نے کہا۔ "بستر پر بری طرح شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور سب چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ بلکہ آپ اجازت دیں تو یہ بھی کہوں گی کہ سونے والے نے رات بڑی بے چینی سے گزاری ہو گی۔"

"اچھا!" پارکنس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ میں نے اس پر سامان کھول کر اسے توقع سے زیادہ شکن دار کر دیا ہو۔ بہرحال مجھے افسوس ہے کہ تمہیں زحمت دی۔ مجھے امید ہے کہ میرا ایک دوست کیمبرج سے جلد ہی یہاں پہنچ جائے گا اور وہ ایک دو راتیں یہاں قیام کرے گا۔"

"کوئی بات نہیں جناب، مجھے کوئی زحمت نہیں ہوئی۔ شکریہ" خادمہ نے یہ کہا اور باہر چلی گئی۔

پارکنس گولف کی مشق کرنے اور کھیل کو بہتر بنانے کا ارادہ کر کے چل پڑا۔

میں یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ وہ اپنے ارادے میں اس حد تک کامیاب ہوا کہ دن چڑھتے ہی کرنل، جو اس کے ساتھ کھیلنے کا صبح ہی سے پروگرام بنا رہا تھا، بڑی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا اور اس کی آوازیں اس طرح گونجنے لگی جیسے کسی شاعر کے کہنے کے مطابق "کسی گرجے میں بہت سے آدمی مل کر گا رہے ہوں۔"

"رات بڑی تیز ہوا چل رہی تھی۔" اس نے کہا۔ "ہمارے ایسے موقعوں پر کہتے ہیں کہ کوئی اس کے لئے سیٹی بجا رہا ہو گا۔"

"کیا واقعی!" پارکنس نے کہا۔ "کیا آپ کے علاقے میں اب بھی اس قسم کا توہم پایا جاتا ہے؟"

"مجھے توہم کا تو پتا نہیں" کرنل نے کہا۔ "البتہ ڈنمارک اور ناروے کے علاوہ یارک شائر کے ساحلی علاقوں میں لوگوں کا یہی عقیدہ ہے اور میرا تجربہ ہے کہ کئی پشتوں سے لوگ جس چیز میں اعتقاد رکھتے ہوں اس کی تہ میں ضرور کوئی بات ہوتی ہے۔ لیکن اب آپ کی باری ہے۔" (گولف کھیلنے والے تصور کر سکتے ہیں کہ مناسب وقفوں کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگتی ہیں)

جب گفتگو دوبارہ شروع ہوئی تو پارکنس نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ابھی جو کچھ کہا تھا، اس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اس قسم کی باتوں کے متعلق میرے نظریات بڑے ٹھوس ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کو "مافوق الفطرت" کہتے ہیں میں اس میں قطعاً یقین نہیں رکھتا۔"

"کیا!" کرنل نے کہا۔ "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ آپ بھوت پریت یا اس قسم کی چیزوں کو نہیں مانتے؟"

"کسی بھی ایسی چیز کو نہیں مانتا" پارکنس نے پختگی سے جواب دیا۔

"خوب" کرنل نے کہا۔ "لیکن اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی سدوسی، حیات بعد الممات کے منکر یہودی سے بہتر نہیں ہیں۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" اس نے کہا۔ "لیکن..... اب یہ جو ہوا کے لیے سیٹی بجانے کا مسئلہ ہے، اس کے متعلق میرا نظریہ یہ ہے کہ ہوا پر جو قانون چلتا ہے وہ مچھیروں اور اس قسم کے لوگوں کو بالکل معلوم نہیں۔ کوئی بے دین آدمی یا عورت، یا کوئی اجنبی بھی ساحل کے آس پاس سیٹی بجاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے فوراً بعد تیز ہوا چلنے لگتی ہے۔ لیکن اب ایسے آدمی عام ہیں جو آسمان کو دیکھ کر یا بیرومیٹر کی مدد سے اس کے متعلق پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ لیکن دیہاتی مچھیروں کے پاس بیرومیٹر نہیں ہوتے اور وہ موسم کی پیش گوئی کے کچھ بھدے سے اصول برتتے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی (مفروضہ) بے دین آدمی کو ہوا چلانے کا باعث سمجھا جائے گا۔ اور وہ اس قابلیت کے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

لیے شہرت حاصل کرے گا۔ اب گذشتہ رات کے واقع کو ہی لیجیے۔ ہوا یوں، کہ میں خود سیٹی بجا رہا تھا۔ میں نے دوبارہ سیٹی بجائی اور ہوا چلنے لگی جیسے وہ واقعی سیٹی کی آواز سن کر ہی آئی ہو۔ اگر مجھے کوئی دیکھ لیتا......"

معلوم ہوتا تھا کہ سننے والا اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ پارکنس کسی حد تک وعظ کے انداز میں بول رہا تھا۔ آخری فقرے کو قطع کرتے ہوئے کرنل بولا!

"آپ سیٹی بجا رہے تھے؟" اس نے کہا۔ "کس قسم کی سیٹی ہے جو آپ نے بجائی تھی؟ پہلے آپ گیند کو ضرب لگائیں۔"

"آپ جس سیٹی کے متعلق پوچھ رہے ہیں وہ بڑی عجیب سی ہے۔ یہ میری جیب میں...... نہیں، وہ تو میں اپنے کمرے ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔ بہر حال یہ سیٹی کل مجھے ملی تھی۔"

دونوں دوپہر کے بعد بھی کھیلتے رہے یا کم از کم اس حد تک محو رہے کہ وہ شام کا جھٹپٹا ہونے تک ہر چیز کو بھولے رہے۔ پارکنس کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ درسگاہ کے کھنڈروں میں مزید تحقیقی کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے سوچا کہ اس کی کوئی اہمیت بھی نہیں۔ دن بہر حال ٹھیک ٹھاک گذرا تھا لہٰذا وہ کرنل کے ساتھ گھر روانہ ہو گیا۔

جونہی وہ مکان کے پاس سے گھومے، ایک لڑکا جو بھاگتا آ رہا تھا کرنل سے بری طرح ٹکرا گیا۔ اور پھر بھاگ جانے کی بجائے اس کے ساتھ ہی چمٹا رہا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ یہ قدرتی بات تھی کہ کرنل نے لڑکے سے پہلے جو کچھ کہا وہ ڈانٹ ڈپٹ کے الفاظ تھے لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ لڑکا خوف کے مارے بول نہیں سکتا۔ شروع کے سوالات تو غلط ثابت ہوئے۔ جب لڑکے کے دم میں دم آیا تو وہ چلانے لگا۔ وہ اب بھی کرنل کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔ آخر کار اسے الگ کیا گیا مگر وہ بدستور چلاتا رہا۔

"کیا مصیبت نازل ہوئی ہے تم پر؟ یوں چلا کیوں رہے ہو؟ کیا دیکھ لیا تم نے؟" دونوں نے اس سے پوچھا۔

"اُف، میں نے اسے کھڑکی میں اپنی طرف گھورتے دیکھا ہے۔" لڑکے نے دردناک آواز میں کہا۔ "اور میں اسے قطعاً نہیں دیکھ سکتا۔"

"کون سی کھڑکی ہیں؟" کرنل نے غصے سے کہا۔ "پوری بات بتاؤ، لڑکے۔"

"سامنے کی کھڑکی، ہوٹل کی" لڑکے نے کہا۔

پارکنس نے یہ سن کر لڑکے کو گھر بھیجنے کی رائے دی لیکن کرنل نے انکار کر دیا۔ وہ بات کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ لڑکے کو اس طرح ڈرا دینا بڑی بری بات ہے اور اگر پتا چل جائے کہ کچھ لوگ مذاق کر رہے ہیں تو انہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔ کئی سوالات کرنے کے بعد یہ کہانی بنی: لڑکا گلوب ان کے سامنے کچھ لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جب کھیل کے بعد سب لڑکے اپنے

اپنے گھروں کو چل دیئے اور وہ بھی روانہ ہو رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے کی کھڑکی پر پڑ گئی۔ وہاں کوئی چیز تھی جس نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جہاں تک اسے معلوم ہوا اس چیز کا رنگ یا لباس سفید تھا۔ لیکن اس کا چہرہ نہ دکھائی دے سکا۔ وہ کوئی اچھی چیز نہیں تھی۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ اچھا شخص نہیں تھا۔ کمرے میں روشنی تھی؟ نہیں، اس کا خیال ہے کہ وہاں روشنی نہ تھی۔ کھڑکی کونسی تھی؟ اوپر والی یا دوسری؟ دوسری والی...... بڑی کھڑکی۔

لڑکے کے چہرے پر جو تاثرات تھے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ شک سا محسوس کرتا ہے کہ شاید مسٹر سمپسن اس کی بات دھیان سے نہ سنے لیکن کرنل نے اسے اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔

"اور یہ رہے چھ پنس...... نہیں، بلکہ یہ ایک شلنگ...... اور اب اپنے گھر بھاگ جاؤ۔ اس کے بارے میں اور کچھ نہ سوچنا۔"

لڑکا جلدی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا اور کرنل اور پارکنس مڑ کر دیکھ بھال کرنے کی غرض سے گلوب ان کے سامنے کے رخ پر پہنچے۔ لڑکے نے جو تفصیل بتائی تھی اس کے مطابق وہاں ایک ہی کھڑکی تھی۔

"بڑی عجیب بات ہے۔" پارکنس نے کہا۔ "بظاہر تو یہ میرے ہی کمرے کی کھڑکی ہے جس کا اس لڑکے نے ذکر کیا تھا۔ کیا آپ کچھ دیر کے لیے اوپر آئیں گے۔ کرنل ولسن؟ دیکھیں تو سہی کہ کون میرے کمرے میں آزادانہ آتا جاتا ہے۔"

وہ جلد ہی دروازے کے سامنے جا پہنچے اور پارکنس دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھا۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"یہ بڑی ہی عجیب بات ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آج صبح میں نے جاتے وقت کمرے کو تالا لگایا تھا۔ تالا اب بھی اسی طرح لگا ہوا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ چابی بھی میرے پاس ہی ہے۔" اس نے چابی دکھاتے ہوئے مزید کہا۔ "اب اگر نوکروں کی یہ عادت ہے کہ وہ کسی کی غیر موجودگی میں کمروں میں داخل ہوتے ہیں تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ میں ایسی باتیں ہرگز پسند نہیں کرتا۔" عجیب طرح کے جذبات کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا (جو کہ واقعی مقفل تھا) اور موم بتیاں جلائیں۔ "کوئی چیز اپنی جگہ سے ہلی ہوئی تو معلوم نہیں ہوتی" اس نے کہا۔

"سوائے آپ کے بستر کے" کرنل نے کہا۔

"معاف کیجئے، وہ میرا بستر نہیں" پارکنس نے کہا۔ "میں اسے استعمال نہیں کرتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے اسے چھیڑا ضرور ہے۔"

واقعی بات کچھ ایسی ہی تھی: بستر کے کپڑے ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے اور بڑے پیچ دار طریقے سے مڑے ہوئے تھے۔ پارکنس کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میرا خیال تو یہ ہے۔" آخر اس نے کہا۔ "کہ کل رات میں نے اپنا سامان کھولنے کے دوران

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

انہیں بے ترتیب کر دیا تھا اور اس کے بعد کسی نے بستر کو ٹھیک نہیں کیا۔ شاید میرے بعد کوئی بستر ٹھیک کرنے کے لیے اندر آیا ہو اور اسے لڑکے نے کھڑکی میں دیکھا ہو اور پھر اسے کسی نے بلایا ہو اور وہ بستر ٹھیک کیئے بغیر ہی تالا لگا کر چلا گیا ہو۔ میں تو کہتا ہوں کہ واقعات اسی طرح ہوئے ہوں گے۔"

"اچھا تو گھنٹی بجا کر کسی کو بلائیں اور دریافت کریں۔" کرنل نے کہا۔ پارکنس کو یہ تجویز بڑی پسند آئی۔

خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور مختصراً یہ کہ اس نے حلفیہ بیان کیا کہ مسٹر پارکنس ابھی ہوٹل ہی میں تھے کہ اس نے صبح بستر ٹھیک طرح بچھایا تھا اور اس کے بعد وہ اس کمرے میں نہیں آئی۔ اس کے پاس کوئی دوسری چابی نہیں ہے۔ مسٹر سمسن کے پاس البتہ چابیاں ہوتی ہیں اور وہی آپ کو بتا سکیں گے کہ یہاں کوئی آیا تھا یا نہیں۔

یہ ایک معمہ تھا۔ تحقیقات سے پتا چلا کہ کوئی بھی قیمتی چیز اٹھائی نہ گئی تھی۔ اور پارکنس کو میزوں پر چھوٹی چیزوں کی ترتیب اچھی طرح یاد تھی اور اسے یقین بھی تھا کہ کوئی حرکت نہیں کی گئی۔ مسٹر اور مسز سمیسن نے بھی یہی کہا کہ ان میں سے کسی نے بھی اس کمرے کی چابی کسی شخص کو نہیں دی۔ پارکنس ایک اچھے ذہن کا مالک تھا اسے ہوٹل کے مالک اس کی بیوی یا کسی ملازم میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس سے کسی پر کوئی الزام لگایا جا سکے۔ اس کا یہی خیال تھا کہ لڑکے نے کرنل کو من گھڑت کہانی سنائی تھی۔

موخر الذکر خلاف معمول رات کے کھانے پر اور شام کے وقت خاموش اور متفکر سا رہا۔ سونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف جاتے وقت اس نے پارکنس کو شب بخیر کہی اور روکھے سے لہجے سے کہا۔

"اگر رات کو میری ضرورت پڑے تو آپ جانتے ہیں کہ میں کہاں ہوتا ہوں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے، شکریہ کرنل ولسن، لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔ ہاں یاد آیا۔" اس نے مزید کہا۔ "میں نے جس پرانی سیٹی کا آپ سے ذکر کیا تھا، وہ آپ کو دکھاؤں؟...... یہ دیکھیے، یہی ہے وہ سیٹی!"

کرنل نے اسے موم بتی کی روشنی میں بڑی احتیاط سے دیکھا۔

"کیا آپ اس عبارت کا مطلب سمجھ سکتے ہیں؟" پارکنس نے اسے واپس لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"نہیں اس روشنی میں نہیں۔ آپ اسے کیا کریں گے؟"

"جب میں کیمبرج واپس جاؤں گا تو وہاں کسی ماہر آثار قدیمہ کو دکھا کر معلوم کروں گا کہ وہ اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں اور اگر یہ کوئی محفوظ رکھنے کے قابل چیز ہوئی تو میں غالباً کسی

عجائب گھر کو تحفہ دے دوں گا۔"

"ہوں!" کرنل نے کہا۔ "ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اگر یہ میرے پاس ہوتی تو میں اسے سمندر میں پھینک آتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ باتوں سے قائل نہیں ہوں گے لیکن مجھے توقع ہے کہ آپ اس سے کوئی نہ کوئی سبق ضرور سیکھیں گے اللہ کرے کہ آپ کی رات خیریت سے گزرے۔"

تھوڑی دیر بعد دونوں اپنے اپنے کمرے میں تھے۔

بدقسمتی سے پروفیسر کے کمرے کی کھڑکیاں، پردوں اور جھلملیوں سے محروم تھیں گذشتہ رات اس نے اس طرف دھیان نہ دیا تھا۔ لیکن آج رات معلوم ہوتا تھا کہ چاند بالکل اس کے بستر کے سامنے چمک رہا ہے۔ اور شاید وہ اس طرح سو نہ سکے گا۔ یہ سوچ کر اسے اگرچہ کسی حد تک ناگوار سی ہوئی لیکن وہ ہمت کر کے اٹھا اور ایک کمبل، کچھ سیفٹی پنوں اور ایک چھڑی اور ایک چھتری کی مدد سے کھڑکی کے آگے ایک "پردہ" لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر یہ قائم رہ سکے تو اپنے بستر پر چاند کی سیدھی کرنوں کو نہ پڑنے دے گا۔ اور جلد ہی وہ اپنے بستر میں بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ جب وہ کافی دیر تک کچھ پڑھتا رہا تو اس نے بالآخر سونے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے کمرے میں خواب آلود نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور روشنی بجھا کر لیٹ گیا۔

وہ بمشکل ایک گھنٹہ سویا ہو گا کہ اچانک کسی کھٹ پٹ کی آواز نے اسے جگا دیا۔ ایک لمحے ہی میں اسے احساس ہو گیا کہ اس نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کے آگے جو "پردہ" کھڑا کیا تھا وہ گر چکا ہے اور روشن چاند بالکل اس کے چہرے کے سامنے ہے۔ اسے کافی حد تک ناگواری سی محسوس ہوئی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اٹھ کر پردے کو پھر ٹھیک کرے؟ یا محض سونے کی کوشش کرے؟

چند منٹ تک وہ لیٹا ہوا امکانات کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے تیزی سے کروٹ بدلی اور حیرت سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ سانس روک کر کان کھڑے کر لیے۔ کمرے میں سامنے خالی بستر پر کچھ حرکت ہو رہی تھی، اس کا اسے یقین تھا۔ "کل وہ اسے یہاں سے اٹھوا دے گا، کیونکہ اس میں ضرور چوہوں یا کسی اور چیز نے بسیرا کر لیا ہو گا۔ اب خاموشی تھی۔ نہیں! ہل چل پھر شروع ہو گئی۔ وہاں کچھ ایسی کھڑکھڑاہٹ اور چرچراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی، جو کوئی چوہا وغیرہ ہرگز نہیں کر سکتا۔

میں اپنے طور پر پروفیسر کی گھبراہٹ اور وحشت کا کافی حد تک اندازہ کر سکتا ہوں کیونکہ تیس سال پیشتر میں نے اسی قسم کا خواب دیکھا تھا۔ لیکن قارئین شاید اس منظر کا تصور نہ کر سکیں کہ کتنی دہشت ناک حالت میں اسے خالی بستر پر ایک دم کوئی اٹھ کر بیٹھتا ہوا نظر آیا۔ پارکنس اپنے بستر سے کود کر اترا اور تیزی سے کھڑکی کی طرف لپکا تاکہ اپنا اکیلا ہتھیار، یعنی چھڑی پکڑے، جس کی مدد سے اس نے کھڑکی کے آگے پردہ سا بنایا تھا۔ لیکن عین اسی وقت خالی بستر سے وہ "شخص" تیزی سے اٹھا اور دونوں بستروں کے درمیان اور دروازے کے سامنے بازو پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ پارکنس نے اسے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

بڑے وحشتناک اضطراب سے دیکھا۔ اس کے پاس سے گزر کر کسی طرح دروازے کے راستے فرار ہونے کا خیال اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ نہ جانے کیوں، وہ اس "شخص" کو چھونے سے گریز کر رہا تھا۔ اور اگر اس "شخص" نے اسے چھونے کی کوشش کی تو وہ اس سے پہلے ہی کھڑکی سے چھلانگ لگا دے گا۔ پل بھر کے لیے وہ "شخص" تاریک سائے میں کھڑا رہا، لہٰذا وہ اس کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا۔ اب اس نے ذرا جھک کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ اچانک پارکنس کو کچھ دہشت اور قدرے اطمینان کے ساتھ احساس ہوا کہ وہ اندھا تھا کیونکہ آگے بڑھتے ہوئے وہ اپنے لپٹے ہوئے بازوؤں کو یوں حرکت دے رہا تھا۔ جیسے راستہ ٹٹول رہا ہو۔ پارکنس کی جانب سے ذرا پرے مڑتے ہوئے اسے اچانک پارکنس کے چھوڑے ہوئے بستر کا احساس ہوا اور وہ تیزی سے ادھر بڑھا۔ وہ بستر پر جھکا اور تکیوں کو ٹٹولنے لگا جس سے پارکنس کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اگر وہ اپنے بستر پر ہوتا تو کیا ہوتا؟ چند لمحوں میں اس مخلوق کو معلوم ہو گیا کہ بستر خالی ہے اور پھر اس کے کھڑکی کی طرف روشنی میں چلنے سے پہلی بار پتا چلا کہ وہ کس طرح کی چیز ہے۔

پارکنس، جو اس بارے میں کسی پوچھ گچھ کو پسند نہیں کرتا، ایک دفعہ میرے سامنے اس دہشت ناک مخلوق کے متعلق کچھ بیان کر رہا تھا جس سے معلوم ہوا کہ اسے زیادہ تر جو بات یاد ہے وہ یہ ہے کہ اس کا چہرہ، جو شکن دار کپڑے کا چہرہ دکھائی دیتا تھا، بہت زیادہ خوفناک تھا۔ اس چہرے پر کیا تاثر تھا۔ وہ بتانے سے قاصر ہے۔ البتہ اس وقت اس کا خوف اس حد تک شدید تھا کہ اس کا پاگل ہو جانا یقینی تھا۔

لیکن وہ زیادہ دیر تک اسے دیکھ نہ سکتا تھا کیونکہ وہ "شخصیت" بڑی تیزی سے کمرے کے وسط کی طرف حرکت کر رہی تھی۔ اور جونہی اس نے راستہ ٹٹولتے ہوئے اپنے بازو ادھر ادھر لہرائے تو اس کے لباس کا ایک کونہ پارکنس کے چہرے سے ٹکرا گیا اور وہ نفرت سے چلائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس سے ڈھونڈنے والے کو بہت جلد اس کا سراغ مل گیا اور وہ پھرتی سے پارکنس کی طرف لپکا۔ پل بھر میں پارکنس کھڑکی میں آدھا پیچھے کی طرف جھکا ہوا اپنی پوری طاقت سے متواتر چیخ رہا تھا اور کپڑے کا چہرہ اس کے اپنے چہرے پر بہت قریب جھکا ہوا تھا۔ عین اس موقع پر جب کہ لمحہ بھر کی دیر خطرناک ثابت ہو سکتی تھی، اس کی گلو خلاصی ہو گئی جیسا کہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کرنل نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا اور ٹھیک وقت پر پہنچ کر کھڑکی کے پاس یہ خوفناک منظر دیکھا۔ جب وہ ان کے قریب پہنچا تو دونوں میں سے ایک ہی وہاں موجود تھا۔ پارکنس غش کھا کر آگے کی طرف کمرے کے فرش پر گر پڑا اور اس کے سامنے فرش پر بستر کے کپڑوں کا ایک بے ترتیب ڈھیر پڑا تھا۔

کرنل ولسن نے اس موقع پر اس سے کوئی سوال دریافت نہ کیا۔ بلکہ دوسروں کو کمرے میں داخل ہونے سے روکتے ہوئے اس نے پارکنس کو اس کے بستر پر آرام سے لٹا دیا اور خود ایک کمبل لے کر دوسرے بستر پر قبضہ جمایا جہاں وہ رات بھر رہا۔ اگلے دن سویرے ہی راجرس آ پہنچا۔ اگر وہ

ایک روز پہلے آتا تو اس کا اتنا اچھا استقبال نہ ہوتا اور پھر تینوں نے پروفیسر کے کمرے میں طویل تبادلہ خیالات کیا جس کے اختتام پر کرنل ہوٹل کے دروازے سے باہر نکلا۔ اس نے اپنی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان ایک چھوٹی سی چیز پکڑ رکھی تھی جسے اس نے لے جا کر اپنے ورزشی بازو کی پوری طاقت سے دور سمندر میں پھینک دیا۔ اس کے بعد گلوب ان کی پچھلی سمت سے آگ کا دھواں اوپر اٹھتا دکھائی دیا۔

ہوٹل کے عملے اور مہمانوں سے اس معاملے کی کیا وضاحت بیان کی گئی، مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ البتہ پروفیسر کو ہولناک دیوانگی سے نجات مل گئی اور ہوٹل آسیب زدہ مکان کے طور پر بدنام ہونے سے بچ گیا۔

اس بارے میں کچھ زیادہ سوالات نہیں کیے گئے کہ اگر کرنل اس وقت نہ آ جاتا تو پارکنس کا کیا حشر ہوتا۔ بظاہر وہ یا تو کھڑکی سے باہر کود جاتا یا پھر اپنے حواس ہی کھو بیٹھتا۔ لیکن اس بات کا پتا نہیں چل سکا کہ وہ مخلوق جو سیٹی کے جواب میں وہاں وارد ہوتی تھی۔ اسے خوفزدہ کرنے کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ وہاں بستر کے کپڑوں کے سوا اور کوئی سامان بھی نہ تھا جس سے اس مخلوق کا جسم وجود میں آتا تھا۔ کرنل نے، جسے ہندوستان کا ایک ایسا ہی واقعہ یاد تھا، رائے ظاہر کی کہ اگر پارکنس اس مخلوق کے ساتھ بند رہتا تو وہ اسے کچھ زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتی تھی کیونکہ خوفزدہ کرنا ہی اس کی واحد خوبی تھی۔ کرنل نے مزید کہا کہ اس سارے معاملے سے کلیسائے روم کے بارے میں اس کی رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس ضمن میں کوئی اور خاص قابل ذکر بات نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ پروفیسر کے نظریات میں بڑی حد تک تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ اس کے اعصاب بھی بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اب وہ کسی دروازے پر کوئی جبہ لٹکا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتا خواہ وہ ساکن ہی ہو۔ اور ایک دن کسی کھیت میں اس نے چڑیوں کو ڈرانے والا پتلا دیکھ لیا، جس کے بعد اس کی دو ایک راتیں بڑی بے چینی سے گزریں۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

ڈائن

ہماری پارٹی سیر و سیاحت کی غرض سے امرناتھ جا رہی تھی۔ ہم لوگ خوشیاں اور رنگ رلیاں مناتے ہوئے پانچ بجے کے قریب چندن واڑی جا پہنچے یہاں صرف ایک دوکان تھی جو ایک سکھ نے مسافروں کے لیے خیمہ میں کھول رکھی تھی۔

سہ پہر کا سہانا سماں، پہاڑ کی سیر، دل کش فضا، پاک و صاف ہوائیں، ندی کا شور و غل، برفانی پل پر آفتاب کی ناچتی ہوئی کرنیں جھلملا رہی تھیں۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا کا حسن سمٹ کر اس لاثانی مقام پر جمع ہو گیا ہے۔

ہم نے فیصلہ کر لیا کہ آج رات یہاں ضرور قیام کریں گے ہمارے بار برداری کے ٹٹو اور قلی ابھی پیچھے تھے۔ ہم نے دوکاندار کو آرڈر دیا اور خود انتظار کی زحمت سے بچنے کے لیے برف کے ایک تودے کی طرف بڑھے۔ نو عمری کا زمانہ تھا۔ طبیعت جولانیوں پر تھی۔ تازہ امنگیں نئے جذبے، زندہ دلولے پوری صحت و تندرستی، سچی خوشیاں حقیقی مسرتیں جو اس بے فکری کی عمر کے لوازم شمار ہوتے ہیں۔ اور جن کے زیر اثر دنیا کی ہر ایک چیز ایسی خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ گویا ہر شے سے خوشیوں اور جوانیوں کا رس ٹپک رہا ہو۔ کیا دل فریب کیفیت تھی۔

ہم لوگ قدرت کی ان آرائشوں اور دلآویزیوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے برفانی پل پر چلنے لگے۔ پل کے پار ایک کائی آلود چٹان پر ایک عجیب الہیت انسان بیٹھا تھا۔

س کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ شکل و صورت سے بھی کچھ برا نہ تھا مگر اس نے وضع انوکھی بنا رکھی تھی۔ یعنی سیاہ رنگ کا ایک لمبا کشمیری طرز کا گرم خرقہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں سیاہ فوجی بوٹ تھے ہاتھوں میں چرمی دستانے اور سر پر سیاہ چرمی کنٹوپ اور اس پر طرہ یہ کہ کنٹوپ پر سوا۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ہیٹ لگا رکھا تھا۔ آنکھوں پر دوہری عینکیں چڑھا رکھی تھیں اور مزے مزے سے سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔

اس کی ہیئت کذائی پر ہم بے اختیار ہنسنے لگے ہمیں شوخیوں اور شرارتوں کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا ہم نے اس پر انگریزی زبان میں بھی آوازے کسے پھبتیاں اڑائیں۔ اور خوب دل کھول کر مذاق کیے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جوانی کی سرمستیوں کے سامنے بھوت بھی بھاگتے ہیں مگر اس خدا کے بندے کے کان پر جوں تک نہ رینگی بلکہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں اور بڑے اطمینان سے سگرٹ کا دھواں بکھیرتا رہا البتہ ہمارے انتہائی مذاق سے قدرے متاثر ہو کر وہ ہلکے سے مسکرا دیتا۔ اس سے ہماری ہنسی میں مزید اضافہ ہوتا کہ یہ جانگلو کیوں ہنستا ہے؟ اسے کیا سمجھ آئی ہے اور اس کی اس حرکت پر ہم اتنے ہنستے کہ ہمارے پیٹ میں بل پڑ جاتے اور گلے خشک ہو کر کھانسی ہونے لگتی۔

اسی ہنسی مذاق میں جب کچھ وقت گزر گیا تو ہمیں چائے یاد آئی اور وہاں سے لوٹے چائے سے فارغ ہوئے تو باربرداری کے ٹٹو اور قلی وغیرہ پہنچ گئے تھے اور خیمے نصب کرانے میں مشغول ہو گئے الاؤ لگوا کر، بستر وغیرہ تیار کروا کر، فارغ ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ اب پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔

کشمیر کی بھوک توبہ توانائی ہوتی ہے اس سرزمین میں آکر قوت ہاضمہ اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ بغیر منہ چلائے کسی وقت بھی گزارا نہیں ہوتا۔ قدرتی چشموں اور بہتی ہوئی ندیوں کے پانی جو کیمیائی نباتاتی اور جڑی بوٹیوں کی آمیزش سے اکسیر کا جواب رکھتے ہیں۔ ثقیل سے ثقیل غذا بھی فوراً ہضم ہو جاتی ہے۔ اور بے اختیار الجوع الجوع زبان پر آتا ہے چنانچہ کھانے کی غرض سے دوکان پر پہنچ کر یکایک ایک کونے میں نظر پڑی تو ہم سب چونک اٹھے کیونکہ کونے میں بچھے ہوئے سٹول پر وہی خرقہ پوش صاحب بیٹھے انگریزی اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے جسے چائے کے وقت ہم لوگ یہاں بھول گئے تھے۔

انہیں دیکھ کر پھر ہمیں مذاق کی سوجھی۔ ہمارے ایک شریر ساتھی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "آپ انگریزی تو خوب جانتے ہوں گے ہمیں بھی کچھ سکھا دیجیے۔"

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "آپ کو کیا سکھاؤں گا۔ کیونکہ میں تو خود ضرورت کے مطابق جانتا ہوں۔"

"ایں آپ انگریزی جانتے ہیں۔ تو گویا آپ بھی تعلیم یافتہ ہیں۔"

اس نے کہا۔

"شاید ایسا ہی ہو" خرقہ پوش نے جواب دیا۔

تو کہاں تک تعلیم ہے۔ آپ کی ہم لوگوں نے برائے تمسخر کہا۔

"صرف ایم اے تک" اس نے طنزاً کہا۔

ہم لوگوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ہم ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ ہماری ندامت کو

بھانپ کر اس نے کہا۔

"پشیمان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہنسو کھیلو! تمہاری چھیڑ چھاڑ سے میں بہت خوش ہوں کیونکہ ایک عرصہ کے بعد مجھے یہ دلچسپ موقع میسر آیا ہے اس اتفاقیہ ملاقات سے میرا چلوؤں خون بڑھ گیا ہے دوسرے میری ہیئت کذائی ہی ایسی تھی کہ خواہ مخواہ ہنسی آتی ہے مگر میں مجبور ہوں کیونکہ عرصہ دراز سے میں اس پہاڑی علاقہ میں رہتا ہوں اور یہ سورج کی چمکیلی کرنیں جو برف پر جگمگا کر دل کش مناظر پیش کرتی ہیں۔ آنکھوں کیلئے سخت مضر ہیں اسی لیے میں نے دوہری عینکیں چڑھا رکھی تھیں اور سولہ ہیٹ بھی اس سلسلے میں بہت مفید ہے۔ یہ چہرے کو برفانی عکس سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس طرح جسم کے دوسرے حصے بھی ڈھانپنے پڑتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کروں تو اس برفانی ہوا سے میرے مسام پھٹ جائیں اور مجھے بھی خارش کی بیماری لگ جائے۔ جو ان علاقوں میں عام ہے۔"

اس کی طرز گفتگو اتنی سادہ اور موثر تھی کہ ہم سب اس سے معافی مانگنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ایک نیک دل انسان تھا۔ وہ بہت جلد ہم لوگوں سے مانوس ہو گیا۔ کھانے کے بعد ہم نے اس کو اپنے خیمہ میں لے جانا چاہا کہ ہمیں اپنی سیاحت کا کوئی دلچسپ واقعہ سنائے اس نے وعدہ کیا کہ ہمیں ایک دلچسپ اور سچی کہانی سنائے گا۔ لیکن چونکہ وہ رات کو قہوہ پینے کا عادی تھا۔ اس لیے اس نے کہا۔ "آپ لوگ خیمے میں جائیں میں ابھی قہوہ پی کر آتا ہوں۔"

ہم خیمہ میں واپس آئے اور اسی خرقہ پوش کا ذکر کرتے ہوئے اس کے انتظار میں بستروں میں پڑ گئے۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ ہمارے خیمہ میں آتا۔ ہم سب سو گئے۔

صبح سویرے جب ہم لوگ بیدار ہوئے تو خرقہ پوش یاد آیا ہم نے اپنے ملازم کو اسے بلانے کے لیے دوکان پر بھیجا۔ تھوڑی دیر میں وہ اکیلا ہی واپس آ گیا مگر اس کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندا تھا۔ اس نے ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"صاحب وہ خرقہ پوش خود تو چلا گیا ہے البتہ یہ کاغذات آپ کے لیے دوکاندار کے پاس چھوڑ گیا ہے"۔

ہم سب اس پلندے پر ایک ساتھ ٹوٹ پڑے۔ بیرونی کاغذ لفافہ کی صورت میں پلندے پر لپٹا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔

میرے نو عمر اور نووارد دوستو! رات میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں کوئی دلچسپ واقعہ سناؤں گا لہٰذا جب میں تمہارے خیمہ میں آیا تو تم لوگ جوانی کی راحت آمیز نیند کا مزا لے رہے تھے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا لیکن یہ داستان جس کے سنانے کا میں تہیہ کر کے آیا تھا۔ تم لوگوں کو سوتا ہوا دیکھ کر بار گراں کی طرح محسوس ہونے لگی میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ صبح تک ٹھہر سکتا، کیونکہ میں ان گھوڑے والوں کے ساتھ، جو منہ اندھیرے ہی ادھر سے گزرتے ہیں، جانے کا وعدہ کر چکا تھا اگر ایسا نہ کرتا تو یہ دشوار گزار راستہ پیدل طے کرنا پڑتا اس لیے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کہانی قلمبند کر رہا ہوں یہ میری آپ بیتی ہے!"

میں ایک سیاح ہوں۔ صرف سیاح ہی نہیں بلکہ سیاح اکبر کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ خبط مجھے بچپن سے تھا جو کسی وقت چین نہ لینے دیتا تھا۔ میں باپ کے ڈر سے اپنے دل پر جبر کر کے تعلیم میں مصروف رہا۔ تعلیم کے ختم ہوتے ہی میرے والدین بھی جنت کو سدھار گئے۔ میں اکیلا رہ گیا وہ مردہ جذبات وقت کے تقاضوں سے پھر بیدار ہوئے سیلانی طبیعت نیا رنگ لائی لہٰذا آج سے بارہ سال پیشتر سیر تن گزارنے کی خاطر پہلگام آیا۔ میرے ساتھ دو کلاس فیلو عنایت اور مرزا بھی تھے۔ جو کہ میری طرح دلدادۂ سیاحت تھے جن کی صحبت گویا سمند شوق پر تازیانہ تھی۔ ہم دن رات پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومنے لگے۔

آخر ایک دن ہم نے اپنے پہاڑی ملازم سے امرناتھ کی تعریف سنی بس پھر کیا تھا فوراً کیل کانٹے سے لیس ہو کر چل پڑے۔ اتوار کا دن تھا چمکدار دھوپ سیلاب نور کی طرح نشیب و فراز پر بہہ رہی تھی۔ تمام لدھرویلی پر نور کا عالم تھا۔ دس بجے ہم پہلگام سے چلے اور ایک بجے تک چندن واڑی جا پہنچے۔ ہمارے ساتھ چھ قلی اور تین باربرداری کے ٹٹو تھے۔

تھوڑی دیر ہم نے چندن واڑی میں دم لیا اور کھانا جو ساتھ پکا کر لائے تھے کھا کر آگے روانہ ہوئے۔ ہمارا خیال تھا کہ غروب آفتاب تک شیش ناگ پہنچ جائیں گے مگر ابھی چند میل ہی کا سفر طے کیا تھا کہ سیاہ بادلوں نے چاروں طرف غول بیابانی کی طرح پھیلنا شروع کیا۔ قلیوں نے کہا۔

"جتنی جلدی ہو سکے اس حد سے نکل جانا چاہیے۔ کیونکہ اس مقام پر بارش اکثر خطرناک اور شدید ہوتی ہے۔"

ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی لیکن آدھ گھنٹہ کے اندر ہر طرف اس قدر دھند چھا گئی کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا اور ساتھ ہی طوفان باد و باراں نے آ لیا۔

ہوا کا زور دم بدم بڑھ رہا تھا۔ جس کی گونج سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ ندی کا مد و جزر ہوا کے غضبناک تھپیڑوں کے ساتھ ہر لحظہ بڑھ رہا تھا گویا اس کی خوفناک لہریں اچھل اچھل کر ہمیں نگلنا چاہتی ہوں ہم چٹانوں اور جھاڑیوں کا سہارا لے کر چلنے لگے اور اسی حالت میں اس حد کو عبور کر لیا۔

اب راستہ کافی کھلا تھا اور ندی بھی دور ہوتی جا رہی تھی لیکن بدقسمتی سے ژالہ باری ہونے لگی۔ اولوں کی بوچھاڑ سے اپنے پرائے کی تمیز نہ رہی ہم نے بے تحاشا دوڑنا شروع کیا۔ پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری اور بڑھتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ژالہ باری تو ختم ہو گئی مگر مینہ بدستور جاری رہا۔

آخر ایک لمبے اور دشوار سفر کے بعد ہمیں دور سے جھونپڑی دکھائی دی۔ ہم گرتے پڑتے وہاں تک جا پہنچے۔

یہ گھاس پھوس کی جھونپڑی بالکل غیر آباد تھی۔ شاید کسی سیاح نے یہاں کبھی قیام کیا تھا جس کے کونے میں ایک شکستہ چولہا تھا اور قریب ہی سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر لگا تھا اور ایک طرف پیال بچھی تھی۔ ہم نے آگ جلا کر کپڑے خشک کئے اور قلیوں کا بے صبری سے انتظار کرنے لگے حتیٰ کہ شام ہو گئی اور وہ نہ آئے اس ویران جھونپڑی میں رات گذارنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ہم تینوں بھوکے پیاسے دوستوں نے خشک پتے اور پیال وغیرہ جلا کر رات کاٹ دی، گو تمام رات ہمیں ریچھوں کی غراہٹ اور دوسرے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں، مگر آگ روشن ہونے کی وجہ سے ہم ان کی دستبرد سے محفوظ رہے۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا اور قرص آفتاب سنگ پارس کی طرح بے رنگ دنیا کو جلا عطا دے رہا تھا۔ ہم اس تاریک جھونپڑی سے نکلے ہی تھے کہ ہمارے قلی بھی ہمیں تلاش کرتے ہوئے آ پہنچے جنہوں نے ہمیں بتایا کہ ہم لوگ راستہ بھٹک گئے ہیں وہ تمام رات ہمیں تلاش کرتے رہے اور یہ جگہ چندواڑی اور شیش ناگ سے بہت دور دوسری طرف واقع ہے۔"

اس خبر سے ہم بہت افسردہ ہوئے۔ لیکن اس وقت ہمیں سخت بھوک لگ رہی تھی ہم نے قلیوں سے پوچھا۔

"کیا اس جنگل کے قرب و جوار میں کوئی گاؤں ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "ہاں یہاں قریب ہی ایک خوب صورت وادی ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر تین گاؤں آباد ہیں جن میں کرور اور ہاری تو دونوں گاؤں چھوٹے ہیں مگر تگ پو بڑا گاؤں ہے۔"

ہم بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے یہ مشورہ کیا ادھر چلیں اور شکم پری کریں۔ غرضیکہ ہم سیدھے راستے پر آگے کی طرف روانہ ہوئے۔

فجر کا پہر اور نورانی سماں تھا اور خوشنما راستہ پہاڑی کے دامن میں بل کھاتی ہوئی دندانہ دار سڑک، کھڈ میں بہتی ہوئی منہ زور برفانی ندی دیوار و چٹانیں، فردوسی شان اور قدرت کے حقیقی جلوے، ترو تازگی بخش رہے تھے۔ قریباً ایک میل کے فاصلہ پر جا کر بلند پہاڑ کے پیچھے ایک خوبصورت اور شاداب وادی دکھائی دی ہم ایک برساتی نالے کے ڈھلوان راستے کے ذریعے وادی میں اتر گئے۔

ہم لوگ باڑ پھاند کر کسی پتھر کے عمارت کی طرف گئے۔ عمارت کے دروازے بند تھے۔ اس عمارت کے سامنے ایک وسیع چمن تھا جس کے آخری سرے پر دور سے ایک خوب صورت کشمیری طرز کا دو منزلہ جھونپڑا دکھائی دیا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گانے کی آواز صاف اور بلند ہوتی گئی۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

گانے والے کی آواز میں اتنا رس تھا اور لے اتنی دلنشین تھی کہ ہم لوگوں سے ضبط نہ ہو سکا۔ ہم بے تابی سے چمنستان میں گھس کر گانے والے کو تحیر زا نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

یہاں ایک چھوٹے سے جھرنے کے قریب اور خوش رنگ پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ایک چھوٹا سا تعزیہ نما چھپر تھا جس کے نیچے ایک پری زاد لڑکی بیٹھی تھی اردو زبان میں ایک فراقیہ گیت گا رہی تھی۔

یہ گانے والی حسینہ نہایت نازک اندام تھی۔ اس کے شب رنگ اور دراز بال تن نازک کے گرد حصار کیے ہوئے تھے۔ چونکہ وہ ہماری طرف پشت کیے بیٹھی تھی اس لیے اسے ہماری موجودگی کا علم نہ ہو سکا ہم اس نغمہ کے نشے میں سرشار دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے لیکن جونہی گانا ختم ہوا ہم اس کے قریب چلے گئے۔

ہمارے پاؤں کی چاپ سن کر اس نے رباب پرے رکھ دیا اور چہرے سے بکھیرے ہوئے بالوں کی لٹیں ہٹائیں۔ آہ کیا بتاؤں وہ کس قدر حسین تھی۔ حسن کی تجلیوں سے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی نورانی جھلک سے گمان ہوا جیسے چاند یکایک کالی بدلیوں سے نکلا ہو، اس کی سرخ و سفید رنگت اس کے خوشخط ہلالی ابروؤں کے نیچے بڑی بڑی مست آنکھوں میں میخانوں کی بستیاں آباد تھیں۔ اس کے گیسوؤں سے مصور کی رعنائی ہوتی تھی۔ اس کا گول اور درخشاں چہرہ آفتاب کو شرماتا تھا اور گداز بازوؤں میں نغمے کی راگنی سوئی ہوئی تھی، غرضیکہ ہر لحاظ سے وہ تخلیق کی پہلی سحر معلوم ہوتی تھی۔

وہ سرخ چھینٹ کا ایک لمبا پیرہن پہنے تھی اور سر پر سرخ رنگ کا ہلکا پھلکا رومال اوڑھ رکھا تھا جس کے نیچے سے شبرنگ بال کمر تک لٹکتے ہوئے نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے اس کی کمر میں بندھا ہوا سیاہ ریشمی پٹکا اس طرح تھا جیسے صندل کے درخت کے اردگرد مار سیاہ ایسا بے مثل حسن دیکھ کر ہمارے دل پہلوؤں میں دھڑکنے لگے وہ اس زمردیں خطہ کی لال پری تھی یا سرخ پیر بہوٹی۔

ہم نے مختصر لفظوں میں اسے اپنے خیالات سے آگاہ کیا پہلے تو وہ چند مدت تک ہمیں تعجب سے دیکھتی رہی۔ پھر معصومانہ انداز سے مسکرائی۔

اس کی مسکراہٹ سے ہم سب کے مضمحل چہرے کھل گئے۔ وہ ہمیں دو منزلہ جھونپڑے کے اندر لے گئی۔ ایک بڑے کمرے میں پھول دار نمدے اور خوب صورت گدے بچھے ہوئے تھے اور کھونٹیوں کے ساتھ جابجا پھولدار آلی نباتات کے لمبے لمبے ہار لٹک رہے تھے جو مینڈھیوں کی طرز پر گوندھے گئے تھے۔ غرضیکہ کمرے کی ہر ایک چیز صاف ستھری اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔

وہ ہمارے لیے کھانا لینے گئی اور ہم اس کی بات آپس میں باتیں کرنے لگے۔

میں نے کہا۔ "شاید وہ یہاں اکیلی رہتی ہے۔ کیونکہ سوائے اس کے کوئی دوسرا آدمی دکھائی نہیں دیتا۔"

مرزا نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس کا ساتھی کہیں باہر کھیت پر ہوگا۔"

اتنے میں وہ کھانا لے آئی جو لکڑی کے خوب صورت کاسوں میں رکھا ہوا تھا یہ کھانا بھی کچھ عجیب طرح کا تھا یعنی اُبلے ہوئے سیب جن میں دہی ملا ہوا تھا۔ دودھ کی روٹیاں۔ شہد۔ انڈے۔ پنیر۔ زردشک، کچے اخروٹ اور ایک خاص قسم کی گھاس جو پانی میں اگتی ہے اور مغز اخروٹ کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔

یہ سب چیزیں بافراط تھیں۔ ایسے مفلس علاقہ میں ایسا کھانا یقیناً کسی جاگیردار کو بھی میسر نہ آ سکتا تھا۔

ہم نے کہا "آپ نے اردو زبان کس سے سیکھی ہے؟"

اس نے کہا۔ "اپنے والدین سے وہ پشاور کے رہنے والے تھے"

ہم نے پوچھا۔ "آپ کا اسم شریف۔"

اس نے کہا۔ "میرا نام شگوفہ ہے!"

کیا پیارا نام تھا۔ وہ خود تو ابھی شگوفہ تھی ہی لیکن اپنے حسن نورستہ سے دوسروں کے دلوں کے شگوفوں کو کھلا دینے کا اعجاز بھی رکھتی تھی۔ ہم لوگوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس غیر مہذب علاقہ میں آپ کیسے آ گئیں؟" اس نے کہا "قسمت لے آئی!"

ہم نے پوچھا۔ "آپ کا شریک زندگی غالباً کام پر گیا ہوگا"

اس نے شرما کر جواب دیا۔ "نہیں میں تو کنواری ہوں"

ہم نے کہا۔ "لیکن آپ کے لواحقین۔"

اس نے کہا۔ "میرا کوئی بھی نہیں۔ میں بالکل اکیلی ہوں" "اکیلی؟"

ہم سب نے بے اختیاری سے کہا: اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ہاں بالکل اکیلی۔" اس نے متانت سے کہا۔

"مگر یہ سازو سامان؟" ہم نے کہا۔

"سب گاؤں والے میرے لیے مہیا کرتے ہیں" اس نے فخر سے کہا۔

اس کے بعد ہم نے کئی ایک سوال کیے مگر اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا بلکہ ٹالتی رہی۔

کھانے کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور راستہ بھر شگوفہ کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اس وادی کی رنگینیوں اور شگوفہ کی پرلطف ملاقات کا ہم پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ ہم نے کچھ دن یہاں قیام کرنے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ ہم نے واپس آ کر اسی دیران جھونپڑی کے قریب ڈیرے ڈال دیئے اور روزانہ "شگوفہ" کے گھر جا کر اس کی پاکیزہ صحبتوں سے دل بہلانے لگے میرے دل پر ان ملاقاتوں کا خاص اثر ہو رہا تھا۔ تاہم مجھے کوئی ایسا موقع نہ ملا کہ کبھی تنہائی میں مل کر اس سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ شگوفہ بھی مجھ پر بہت مہربان تھی۔ اور میرے دوستوں کی نسبت میری باتوں سے بہت

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

خوش ہوتی تھی لیکن دل کا حال خدا کو معلوم ہوگا میں اس کے متعلق کیا کہہ سکتا تھا۔ البتہ خود دل و جان سے اس پر فدا ہونے لگا۔ چند دن بعد میرے دوستوں نے واپسی کا ارادہ کیا اور مجھے بھی ان کی انگشت نمائی کے ڈر سے مجبوراً ان کے ساتھ واپس آنا پڑا۔

شگوفہ کے حسن و جمال کی کشش کوئی معمولی نہ تھی۔ اس کی بھرپور جوانی محشر خیز شباب، مستانہ چال، شیریں کلامی اور ان سب سے بڑھ کر معصومیت میرے دل میں گھر کر چکی تھی۔ میرا دل اس کی پرستش کرتا تھا تاہم دن رات اس کی یاد میں تڑپنے کے باوجود میں تین سال تک کشمیر نہ جا سکا۔ آخر چوتھے سال بد قسمتی پھر مجھے وہاں لے گئی۔ شگوفہ کے اشتیاق میں جو میرے دل کی ملکہ اور میری خوشیوں کا گہوارہ تھی، میں دوبارہ پہلگام پہنچا، لیکن وہاں مشکل ایک رات ٹھہرا اور دوسرے دن صبح شفق کے رنگین سایوں میں روانہ ہو کر چار بجے تک اپنی کھوئی ہوئی جنت میں پہنچ گیا، جس کی وسیع آغوش میں پاکیزگی اور معصومیت پرورش پاتی تھی، جس کے دراز دامنوں میں مستیاں اور رعنائیاں کھیلتی تھیں، جس کی چوڑی چھاتی پر بلوریں ندیاں مچلتی تھیں، جہاں دھان کے کھیتوں پر حسن ازلی کھلاتا تھا، جہاں زمردیں درختوں کی نورانی سج دھج شاداہیوں کا منہ چڑاتی اور جہاں کے نچیلے پھولوں کی نزاکت پر خود قدرت رشک کرتی تھی۔

میں والہانہ انداز سے مسکن محبوب میں داخل ہوا۔ چمنستان پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ وہ ایک کنج میں سورج مکھی کے پھولوں کے درمیان بیٹھی ایک خاص قسم کی نرم و نازک گھاس کے تنکوں سے اپنے لیے پاپوش تیار کر رہی تھی۔ اس وقت وہ آتشی رنگ کے لباس میں تھی۔ اس کا گلابی چہرا سورج کی خوشگوار گرمی سے قندھاری انار کے خوشنما دانے کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور سر کے بال کالی ناگن کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس دلفریب نظارے سے متاثر ہو کر میں وہیں مبہوت کھڑا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے کام سے اکتاتے ہوئے انگڑائی لی تو اچانک اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں دوڑ کر اس کے قریب گیا۔ مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا اور نہایت خلوص سے جھونپڑے میں لے گئی۔

سفر کی تکان سے میری طبیعت مضمحل ہو رہی تھی۔ اس لیے میں کھانا کھا کر سو گیا۔ شام کے قریب میری آنکھ کھلی تو باہر نکل کر دیکھا کہ کشمیری عورتوں کا ایک میلہ سا لگا تھا جن کے درمیان شگوفہ نہایت وقار سے اس طرح بیٹھی تھی جیسے ستاروں کے حلقہ میں چاند اس کے سامنے ایک بہت بڑے سماوار میں چائے ابل رہی تھی۔

میں اسے مصروف پا کر چمنستان کی طرف چل دیا سورج اس وقت پہاڑوں کی عین برفانی

چوٹیوں پر چمک رہا تھا۔ اور نورانی شعاعوں کے عکس سے برف پر جا بجا قوس قزح کے رنگ جھلک رہے تھے۔ ان رنگین سایوں سے وادی کی شان دوبالا ہو رہی تھی۔ اودھر زرشک کی کھٹ مٹھی خوشبو دل کو لبھا رہی تھی۔

میں ان فطری تجلیات کی بہاریں لوٹتا ہوا نہایت سکون و اطمینان سے گلگشت چمن کرنے لگا۔ اسی حالت میں جب کہ میں چکر کاٹ کر زرشک کی بیلوں سے گزر رہا تھا تو سامنے مجھے ایک خرقہ پوش کشمیری کھڑا دکھائی دیا جس نے کشمیری زبان میں آہستہ سے کہا۔

"یہاں سے بھاگ جاؤ!"

"میں نے حیرانی سے کہا کیوں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بھاگ گیا۔

ابھی میں اس شخص کی حرکت پر غور کر رہا تھا کہ پیچھے سے سیٹی کی آواز آئی میں نے پلٹ کر دیکھا تو کچھ دور پگڈنڈی پر کھڑا ہوا ایک بوڑھا کشمیری مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر اس نے اشارے سے مجھے روک دیا اور پھر جھونپڑے کی طرف اشارہ کر کے اس نے انگلی اپنے لبوں پر رکھ لی۔ جس کا مطلب ظاہر تھا کہ خاموش رہو، وہ سن لے گی۔

ان لوگوں کی ایسی حرکات نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ یہ لوگ مجھے کس خطرے سے آگاہ کرتے ہیں، اتنے میں سورج کی سنہری شعاعیں ایک ایک کر کے روپوش ہو گئیں جنگلی درخت، خوشرنگ پھول، پہاڑی کھیت، خودرو بیل بوٹے غرضیکہ ہر ایک چیز سہم کر رات کے تاریک دامن میں سونے لگی۔ مگر میں عالم استعجاب میں وہیں کھڑا رہا۔

یکایک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ تو اپنے قریب ایک بوڑھی عورت کو کھڑا پایا۔ جس نے مجھے کشمیری زبان میں کہا۔ تم یہاں کیوں آئے ہو اور کہاں سے آئے ہو۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں پنجابی ہوں اور سیر و سیاحت کی غرض سے آیا ہوں۔"

اس نے کہا۔ "تو کیا تمہیں رات گزارنے کے لیے گاؤں میں کوئی جگہ نہ مل سکتی تھی۔ جو یہاں اس بلا کے دام میں آ پھنسے۔"

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی۔ مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"سچ سچ بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے؟ ورنہ ابھی شگوفہ کو بلا کر سب کچھ بتاتا ہوں"

اس دھمکی سے بڑھیا کانپ گئی۔ اور قبرستان کی باڑ کے قریب سنگین عمارت کے پیچھے لے جا کر مجھ سے کہنے لگی۔ "تم نے دیکھا کہ وہ اس جنگل میں کس شان و شوکت سے رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں"

بڑھیا کہنے لگی۔ "یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارا علاقہ بہت مفلس ہے۔ ہم خود چیتھڑے پہنتے ہیں مگر

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اس کے لیے پشمینے کے زردوز لباس بناتے ہیں خود روکھا سوکھا کھاتے ہیں اور اس کے لیے روزانہ اچھی اچھی خوراکیں بہم پہنچاتے ہیں۔ خود "ماکنگڑیوں" کے سہارے بیٹھ کر رات گزارتے ہیں
"ــــــــــــــ

میں نے کہا۔ "میں کیا جانوں؟"

بڑھیا نے کہا۔ "اچھا سنو۔ شگوفہ ڈائن ہے انسانی خون اس کے منہ لگ چکا ہے۔ ہم یہ سب چیزیں اپنے بچاؤ کی خاطر اسے بطور نذر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ گاؤں والوں پر ہاتھ صاف کیا کرتی تھی۔ مگر اب صرف بھولے بھٹکے مسافروں کو ہی شکار بناتی ہے یا قبروں سے مردے نکال کر کھاتی ہے۔ اس کا حسن و جمال صرف فریب نظر ہے"۔

اس انکشاف نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔

آسمان پر سیاہی اور سفیدی دست و گریباں ہو رہی تھی۔

تمام وادی پر دھند لکے کا غلاف چڑھ رہا تھا............ ہوائیں کالے چور کی طرح کائنات سے داؤ پیچ کر رہی تھیں۔ سیاہ پوش فضا میں روحوں کے چلنے پھرنے کا گمان ہو رہا تھا اس پریشان کن ماحول میں بڑھیا کے اس بیان کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں واہمہ کا شکار ہو کر کانپنے لگ۔ سچ ہے۔ جان بہت عزیز ہوتی ہے چنانچہ میں نے بڑھیا سے التجا کی کہ آج رات مجھے اپنے گھر میں پناہ دے لیکن بڑھیا نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

میں نے کہا "کیا گاؤں میں کوئی سرائے بھی ہے۔"

اس نے کہا۔ "کوئی نہیں اور اگر ہوتی بھی تو تمہیں کوئی پناہ نہ دیتا۔"

میں نے کہا۔ "کیوں"

بڑھیا نے کہا۔ "گاؤں والے ایک مسافر کی خاطر شگوفہ کو دشمن کیسے بناتے"

عین اسی وقت پاؤں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی جھاڑیوں سے خفیف سی سرسراہٹ۔ بڑھیا تو فوراً دم دبا کر بھاگی، لیکن میں بدحواسی کے عالم میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ محض وہم تھا۔ تو میری جان میں جان آئی اور چہرے پر مصنوعی بشاشت پیدا کرتے ہوئے جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔

جھونپڑے کو خالی پا کر مجھے سخت فکر ہوئی اور یقین ہو گیا کہ اس نے ضرور ہماری باتیں سنی ہوں گی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں چپ چاپ کمرے میں بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں وہ اندر داخل ہوئی اور سست انداز سے کھانا لائی اور نہایت خاموشی سے میرے سامنے چن دیا اس کے اس رویہ سے میں بہت پریشان ہوا اور اس سے گھل مل کر باتیں کرنے لگا مگر اس نے کچھ توجہ نہ کی اور ٹالنے کی غرض سے اٹھ کر میرا بستر تیار کرنے میں مصروف ہو گئی اب تو میں بہت گھبرایا اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جسے وہ تاڑ گئی اور اپنے مغموم چہرے پر عارضی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی۔

"آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا"

میں نے اداسی سے کہا۔ "آپ کی بے رخی دیکھ کر۔"

میرے اس جواب پر اس نے سر جھکا لیا اور اس کی شرابی آنکھوں سے اس طرح آنسو بہنے لگے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی خدا جانے اتنے بڑے بڑے شفاف اور نورانی آنسو اس نے کہاں جمع کر رکھے تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ مگر فوراً ان مست آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں نے ایسا اعجاز دکھایا کہ میرے تمام شکوک ان کی دلفریب رو میں بہہ گئے۔ میں اپنی غلطی پر سخت نادم ہوا۔ اور اس کا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر میرا دل موم ہو گیا۔

"شگوفہ میں تم سے محبت کرتا ہوں" میں نے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں کہا۔

وہ خاموش رہی۔ میں نے دوبارہ یہی الفاظ دوہرائے۔

"لیکن تمہاری محبت۔" اس نے رکتے ہوئے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

"لیکن کا کیا مطلب۔ شگوفہ کیا تمہیں میری محبت ناپسند ہے؟"

میں نے کہا؟

اس نے کچھ جواب نہ دیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی خاموشی سے میری بے قراری دم بدم بڑھنے لگی۔ مگر وہ کسی ایسے خیال میں محو تھی جیسے اس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔

"جلدی بولو شگوفہ اب میں صبر نہیں کر سکتا۔" میں نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہاری محبت ناجائز ہے" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"نہیں نہیں شگوفہ میں کسی ناجائز محبت کا خواہشمند نہیں" میں نے کہا۔

"میں تو تمہیں شریک زندگی بنانا چاہتا ہوں"۔

"ہاں میں نے سمجھا، مگر میرے اور تمہارے درمیان ایک بیکراں خلیج حائل ہے"۔ اس نے کہا۔

"خلیج کیسی" میں نے پوچھا۔

شگوفہ نے جواب دیا۔ "مذہب"

"تو کیا تم مسلمان نہیں ہو" میں نے تعجب سے کہا۔

"لیکن مسلمانوں میں تو کئی فرقے ہوتے ہیں" شگوفہ نے جواب دیا۔

"نہیں مسلمان سب ایک رشتہ میں منسلک ہیں۔ فرقہ داری ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی" میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

مگر میں اپنے فرقہ کے قوانین کسی صورت میں بھی نہیں توڑ سکتی" شگوفہ نے متانت سے جواب دیا۔

"اچھا تو مجھے بھی اپنے فرقہ میں شامل کر لو۔ کیا تم ایسا بھی نہیں کر سکتیں"

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

میں نے منت سے کہا۔

"وہ ایک لمبے سکوت کے بعد بولی۔" ہاں ایسا ہو تو سکتا ہے بشرطیکہ پہلے میرے فرقہ میں شامل ہونے کی رسوم ادا کرو۔"

چنانچہ میں نے منظور کر لیا۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ چاند کی سیمیں کرنیں زیتون کے چراغ کی لو سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ بال چھپل کی نشیلی خوشبو سے مستی برس رہی تھی میں کمرے میں اکیلا بیٹھا اپنی قسمت کے آخری فیصلہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں شگوفہ اندر آئی اس نے سیاہ کمخواب کا لباس پہن رکھا تھا اور سیاہ ہی موتیوں کے زیورات نورانی جسم کی زینت بن رہے تھے۔ یہ سوگوار علامت دیکھ میں نے آزردگی سے کہا۔

"شگوفہ شب عروسی کے لیے کالا لباس بہت منحوس ہے۔"

شگوفہ نے کچھ جواب نہ دیا اور نہایت خاموشی سے میرے قریب بیٹھ کر حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اچھا تمہیں میری شرط منظور ہے۔ بعد میں پچھتاؤ گے تو نہیں"

میں نے کہا۔ "ہرگز نہیں قول مرداں جان دارد۔"

اس منظوری کے بعد اس نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک ریشمی چادر میرے ہاتھ میں دے دی اور ایک منتر بتا کر مجھے ہدایت کی کہ میں شگوفہ کی صورت کا تصور کر کے یہ منتر پڑھوں اور منتر پڑھتے وقت یہ چادر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلائے رکھوں۔ چند بار عمل کرنے سے ایک پرندہ آ کر میرے ہاتھوں پر گرے گا۔ جسے میں اس چادر میں لپیٹ کر بغل میں داب لوں۔

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جس کے عمل سے چند سیکنڈ ہی میں ایک پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا میرے ہاتھوں میں آ گیا اور میں نے فوراً اسے چادر میں لپیٹ کر بغل میں داب لیا۔

بعد ازاں اس نے میری آنکھوں سے پٹی کھولی اور میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگی۔

"اچھا میری داستان حیات سنو تا کہ میری سچائی کے اظہار کے ساتھ ہی میری داستان ختم ہو جائے۔"

پرندہ بے چارہ میری بغل سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ اس لیے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پہلے اس بے زبان کی قسمت کا فیصلہ تو کرو۔ جو میری بغل میں تڑپ رہا ہے۔ داستان حیات

سنانے کو تو تمام عمر پڑی ہے"

اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "اس کا کچھ خیال نہ کرو اسے تڑپنے دو، کیونکہ میرے مذہب کا یہی فرمان ہے"

"میں بے دلی سے خاموش ہو گیا" شگوفہ نے کہا۔

آہ میں بہت ہی بد قسمت ہوں۔ ابھی میں نے دہر ناپائیدار میں قدم ہی رکھا تھا کہ میری ماں مر گئی۔ جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو سوتیلی ماں کی جھڑکیوں اور ملامتوں کے سوا کبھی میرے کانوں نے نرم الفاظ نہ سنے۔ میں جب چھ برس کی ہوئی تو باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ گو باپ نے کبھی مجھ سے محبت نہ کی تھی تاہم ایک ٹھکانہ تو تھا سو وہ بھی جاتا رہا۔ مگر خدا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے میرا ٹھکانہ اس طرح بنایا کہ ہمارے محلہ کی ایک نیک دل اور امیر عورت نے میری پرورش کا ذمہ لے لیا۔ اس نیک دل خاتون کا ایک ہی لڑکا تھا جس کو گھر سے نکلے ہوئے دس سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔

خدا کی قدرت مجھے ابھی ان کے گھر آئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ بھائی عثمان یعنی اس نیک دل خاتون کا اکلوتا بیٹا واپس آ گیا۔ ماں مجھے پہلے ہی بہت پیار کرتی تھی۔ مگر اب مجھے اپنے لیے مبارک خیال کرتے ہوئے زیادہ قدر کرنے لگی۔ حتیٰ کہ ان کی ناز برداریوں نے مجھے بہت شوخ اور شریر بنا دیا۔ لیکن جہاں گل ہوتا ہے وہاں خار بھی ساتھ ہی ہوتا ہے یعنی بھائی عثمان کو میری شوخیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ اکثر مجھے ایسی قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے کہ میرا خون خشک ہو کر رہ جاتا۔

بھائی عثمان زرد رو اور لاغر اندام تھے۔ ان کے متین چہرے سے عزم و استقلال ٹپکتا تھا اور پیشانی کی شکنیں دانائی اور بزرگی کی شاہد تھیں ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ طبیعت میں حکومت کا مادہ تھا۔ وہ اپنی ہر جائز و ناجائز بات منوانے کے عادی تھے۔

بھائی عثمان نے ماں کو بتایا کہ وہ کشمیر کے علاقہ میں ایک دور دراز وادی میں دس سال تک مقیم رہے، اور آئندہ بھی اپنی زندگی وہیں گزارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ماں نے ہر چند منع کیا مگر وہ نہ مانے بلکہ ماں کو بھی اپنے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرنا شروع کیا۔ آخر کار ماں کو انہوں نے رضامند یا مجبور کر لیا۔ اسی طرح ہمارا آٹھ افراد کا قافلہ اس وادی میں پہنچا یعنی ایک بھائی عثمان خود، دوسری میں، تیسری ماں چوتھا اندھا چچا دو بوڑھی خادمائیں اور ملازم۔

کچھ دن تک تو ہم لوگ بہت اداس رہے۔ لیکن قدرت نے اس وادی کو حسن و دلکشی کا وافر حصہ دے رکھا تھا۔ اس لیے ہم چند ہی دن میں اس قدرتی زندگی کے عادی ہو گئے۔

بھائی عثمان فطرتاً خشک طبیعت اور خلوت پسند واقع ہوئے تھے اس احاطہ کے دوسرے سرے پر جو عمارت کھڑی ہے، یہ ان کی لائبریری تھی۔ وہ دن میں ایک مرتبہ ماں سے ملنے آتے، باقی تمام وقت اسی لائبریری میں گزارتے اور رات کو بہت دیر سے گھر آتے۔ مجھے اس تجربہ گاہ کی طرف

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

جانے کا حکم نہ تھا۔ بلکہ گھر میں بھی جب کبھی میرا ان کا سامنا ہو جاتا تو خواہ مخواہ ایسی ڈانٹ بتاتے جس سے میں سہم جاتی اور ہمیشہ ان کی نظروں سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔

دن گزرتے گئے۔ میری ماں نے مجھے اردو فارسی کی کتابیں پڑھائیں اور تھوڑا بہت لکھنا بھی سکھایا۔ لیکن بد قسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ جب بارہ سال کی ہوئی تو ماں نے انتقال کیا۔ تھوڑے عرصہ بعد چچا بھی مر گیا اور پھر دونوں ملازم اور ایک خادمہ بھی یکے بعد دیگرے ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔

اب بھائی عثمان کے علاوہ صرف میں اور بوڑھی خادمہ گھر میں باقی رہ گئے۔ بھائی عثمان بدستور اپنی لائبریری میں رہتے تھے۔ گو اب انہوں نے اپنی سخت گیری سے ہاتھ اٹھا لیا تھا مگر مجھے منہ بھی نہ لگاتے تھے۔ میں مجبوراً تنہائی کی زندگی بسر کرتی رہی۔ آخر جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اس گھر میں غیر ہوں اور اسی وجہ سے بھائی عثمان مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ حالانکہ میری ذات سے کبھی انہیں تکلیف نہیں پہنچی۔

عمر کے ساتھ حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ آج ضرور بھائی عثمان سے اس شدید اور نامعلوم نفرت کی وجہ دریافت کروں گی۔ اگر میرا وجود ہی ان کے کسی دکھ کا باعث ہو تو میں اس گھر سے رخصت ہو جاؤں گی۔

اسی خیال سے میں رات کو دیر تک ان کا انتظار کرتی رہی انہوں نے اس دن کھانا بھی نہ کھایا۔ بوڑھی خادمہ بے چاری ان کا کھانا آتش دان کے قریب رکھے دیوار کے سہارے خراٹے بھرتی رہی۔ ادھر میں ان کے انتظار میں بستر پر کروٹیں لے رہی تھی حتیٰ کہ یہ انتظار کی گھڑیاں میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئیں، ناچار میں نے لائبریری میں جانے کی ٹھان لی اور دل کڑا کر کے لائبریری کی طرف چلی گئی۔ مگر دروازہ پر پہنچ کر کچھ جھجکی۔ بھائی عثمان کی خفگی کے خیال سے کانپ گئی۔ تاہم میں نے فوراً ہی اپنے دل کو مضبوط کیا کہ بھائی عثمان بھی تو آخر انسان ہی ہیں کوئی ہوا تو نہیں۔ میں نے دستک دینے کے ارادے سے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو دروازے کا پٹ ہاتھ لگتے ہی چرے کھل گیا۔ میں بوکھلا کر پیچھے ہٹی۔ میرا خیال تھا کہ ابھی بھائی عثمان اپنی بھاری بھر کم آواز میں للکار کر کہیں گے کون ہے لیکن جب خلاف امید کوئی آواز نہ آئی تو میں نے جھانک کر اندر دیکھا۔

کمرہ خالی تھا میں چپکے سے اندر داخل ہوئی طاقچہ پر موم بتی جل رہی تھی میز پر کتابیں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں قریب ہی بھائی عثمان کی ٹوپی پڑی تھی اور کوٹ ایک طرف کھونٹی پر لٹک رہا تھا۔ کمرے میں کسی دوا کی ہلکی ہلکی بو پھیل رہی تھی میں حیران تھی کہ بھائی عثمان ایسی بے سروسامانی سے کہاں جا سکتے ہیں یک دم میری نظر دیوار سے لگے ہوئے ایک بڑے قطعہ پر پڑی جو مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوا میں نے غور سے دیکھا تو اس پر لکھی ہوئی سطروں میں حروف کے بجائے اعضاء کی صورتیں دی گئی تھیں مثلاً کان' ناک' آنکھیں' زبان' دانت' دل' معدہ' تلی' کلیجہ' پھیپھڑے' گردے

وغیرہ ہر ایک عضو کی تصویر دے کر عبارت کے طریقہ پر سطریں لکھی گئی تھی نہ جانے یہ کونسی زبان تھی میں دیر تک اسے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی مگر کامیاب نہ ہوئی۔

قریب ہی ایک الماری تھی جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا اتفاقاً میری نظر اس کے اندرونی حصہ تک پہنچی یہ الماری دراصل ایک چھوٹا سا صندوق نما کمرہ تھا جس کے اندر ایک زینہ تھا جو نیچے گہرائی میں جا رہا تھا۔

معاً مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو ضرور بھائی عثمان نے اپنی تفریح کی کوئی جگہ بنا رکھی ہے لہٰذا یہ اسرار کھولنے کے لئے میں دبے پاؤں نیچے اترنے لگی تو بہت سی سیڑھیاں اترنے کے بعد کچھ روشنی دکھائی دی۔

گہرائی میں ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا جس میں عجیب قسم کی روشنی ہو رہی تھی سیڑھیوں کے قریب ہی لکڑی کا ایک بڑا سا شیلف پڑا تھا جس میں پتھر کے بڑے بڑے مرتبان اور ٹین کے بڑے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔

میں رینگتی ہوئی اس شیلف کے پیچھے چھپ گئی اور شیلف کے کونے سے جھانک کر اندر کا نظارہ کرنے لگی تہہ خانہ کے کونے میں آگ جل رہی تھی اس آگ کا رنگ بالکل سبز تھا اور یہ تہہ خانہ بھی دھوئیں سے بھرا ہوا تھا مگر اس دھوئیں سے دم گھٹنے کی بجائے ایک طرح کی فرحت حاصل ہوتی تھی تہہ خانے کا اندرونی حصہ اس دھوئیں کی کثیف چادر میں لپٹا ہوا بالکل ایک سبز غبارے کی طرح دکھائی دیتا تھا اس غبارے میں سامنے لکڑی کا ایک بڑا سا میز رکھا تھا جس پر پھولوں کی سیج بچھی ہوئی تھی اور اس سیج پر کوئی سفید چادر اوڑھے سو رہا تھا سونے والے کی پائنتی کی طرف دو تین شیشے کے پیالے پڑے تھے جن میں کوئی سیاہ سی چیز پڑی ہوئی ہل رہی تھی کونے کے قریب ہی آگ سے تھوڑی دور دیوار کے ساتھ ویسا ہی ایک قطعہ لٹک رہا تھا جیسا کہ میں اوپر ابھی دیکھ چکی تھی اس قطعہ کے سامنے بھائی عثمان مت بنے کھڑے تھے ان کی پشت میری طرف تھی۔

یک لخت وہ میز کی طرف پلٹے تو ان کے ہاتھ میں پھیپھڑوں سمیت ایک کلیجہ دکھائی دیا جو انہوں نے سانس والی نالی کے اوپر والے سرے سے پکڑ رکھا تھا اسے دیکھ کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا میں بھاگ جانا چاہتی تھی مگر طاقت نے جواب دے دیا اور لرزہ براندام شیلف کے سہارے بیٹھی ہوئی سب کچھ دیکھتی رہی۔

بھائی عثمان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کلیجہ پوری طرح تڑپ رہا تھا جسے انہوں نے شیشے کے خالی پیالے میں ڈال دیا اس کلیجہ کی حرکت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ اچھل اچھل کر پیالے سے باہر نکلنا چاہتا تھا بھائی عثمان نے اب جیب سے گھڑی نکالی اور دیر تک اس کی حرکت کا گھڑی کی رفتار سے مقابلہ کرتے رہے۔

اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ سونے والے کے سرہانے پہنچے اور اس کے منہ سے کپڑا ہٹا کر اس پر

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

جھک گئے اور بہت دیر تک اسے دیکھتے رہے وہ بھی آہستگی سے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے بھی ہلکی ہلکی جنبش دے کر اسے جگانے کی کوشش کرتے مگر سونے والے نے کوئی حرکت نہ کی آخر اس کی بیداری سے مایوس ہو کر بھائی عثمان نے اس پر سے چادر اتار دی۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ ایسی گہری نیند سونے والی ایک نیم برہنہ عورت تھی گو اس کا چہرہ بھائی عثمان کے سائے کی اوٹ میں ہونے سے مجھے دکھائی نہ دیا مگر اس کے جسم کے باقی حصہ سے جو سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی مریضہ ہے۔

بھائی عثمان نے اس مریضہ کو گود میں اٹھا لیا اور جلتی آگ کے پاس کھڑے ہو کر اس کے جسم کو آگ کی گرمی پہنچانے لگے دفعتاً مجھے اس مریضہ کے چہرے کی تھوڑی سی جھلک دکھائی دی جس سے مجھ پر دہشت طاری ہو گئی آہ وہ ایک لاش تھی جس کی ٹانگیں ایک طرف لٹک رہی تھیں سر اور بازو دوسری طرف اس کی لاش کے لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال بھائی عثمان کے پاؤں کو چھو رہے تھے۔

خوف و ہراس سے مجھ پر ایک تشنجی دورہ پڑا اور تہہ خانہ ایک سبز غبارے کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا معلوم ہوا ایک ہولناک چیخ میرے منہ سے نکلی اور میں بیہوش ہو گئی۔

شگوفہ یہاں تک پہنچ کر یک دم رک گئی وہ کچھ تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ادھر پرندہ میری بغل میں دم توڑ رہا تھا میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

”خدا کے لئے جلد کہانی ختم کرو تمہاری اس طویل کہانی سے اس جانور کا خواہ مخواہ خون ہو جائے گا۔“

شگوفہ نے بری طرح ہانپ کر کہا پھر اس پرندے کا ذکر کیا ایک دفعہ جو میں کہہ چکی ہوں کہ یہ مارنے کی خاطر تمہاری بغل میں دیا گیا ہے

مجھے اس کی سنگ دلی پر افسوس ہوا۔

تھوڑے وقفہ کے بعد اس نے کمزور آواز میں کہنا شروع کیا اس پر ہول واقعہ کے بعد جب میں ہوش میں آئی تو خود کو اپنے بستر پر پڑا ہوا پایا میں نے خیال کیا کہ یہ سب کچھ میں نے خواب میں دیکھا ہے چونکہ سردی سے میرے بدن میں کپکپی ہو رہی تھی لہٰذا میں نے بوڑھی خادمہ کو آواز دی تاکہ آتش دان میں آگ سلگائے مگر میری متعدد آوازوں پر بھی جب بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا تو میں گھبراہٹ میں اٹھ کر اس دروازے تک گئی جو میری اور بڑھیا کی خوابگاہ کے درمیان تھا۔

بڑھیا کو کمرے میں نہ پا کر میں بدحواسی سے باہر برآمدے میں نکل آئی۔ تاریک رات میں مہیب سرخ روشنی کے شعلے بڑھتے پھیلتے دکھائی دیئے فضا دھوئیں سے بھرپور تھی میں کانپتی ہوئی آگے بڑھی تو معلوم ہوا کہ بھائی عثمان کی لائبریری دھڑا دھڑ جل رہی ہے جس کو دیکھ کر اس تہہ خانے کا سارا سین میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور مجھے یقین کرنا پڑا کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ

خواب نہ تھا مگر یہ آگ کیسے لگی کیا بھائی عثمان نے خود لگائی لیکن کیوں کہیں انہوں نے خودکشی نہ کر لی ہو۔

یہ خیال آتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میں نے بے تحاشا چیخیں مارنی شروع کیں میری اس چیخ پکار پر بوڑھی خادمہ بھائی عثمان کے کمرے سے نکلی میں دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے پوچھا کہ بھائی عثمان کہاں ہیں؟“

اس نے کہا ”اپنے کمرے میں۔“

میں نے کہا تو کیا ان کو آتش زدگی کی خبر نہیں

بڑھیا نے جواب دیا کیوں نہیں

میں نے کہا۔ ”تو وہ پھر اسے بجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے“

بڑھیا نے کہا ”ناممکن بات کی کوشش سے کیا فائدہ۔“

میں نے پھر کہا ”مگر کم از کم وہ باہر آ کر اسے دیکھ ہی لیتے“ بڑھیا نے روکھے پن سے کہا یہ ان کی مرضی پر منحصر ہے تم فوراً اپنے کمرے میں جاؤ یہاں دھوئیں میں بیمار ہو جاؤ گی۔“

”میں نے مچلتے ہوئے کہا مجھے بھائی عثمان کے پاس لے چلو بڑھیا نے سختی سے کہا نہیں تمہیں اپنے کمرے میں جانا ہو گا اس وقت وہ تمہیں نہیں مل سکتے۔“

میں مایوس ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی اس وقت میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے جن کا میں نے بوڑھی خادمہ پر بھی اظہار کیا اس نے کہا۔

”نادان لڑکی اگر وہ سلامت نہ ہوتے تو تمہیں یہاں اٹھا کر کون لاتا“

”تو کیا بھائی عثمان مجھے اٹھا کر لائے ہیں“ میں نے متعجب ہو کر کہا۔

میں بڑھیا کے اصرار پر بستر میں پڑ رہی مگر ایسی حالت میں کون سو سکتا ہے وہ آگ تمام رات بھڑکتی رہی اتفاقاً صبح کے قریب بارش شروع ہو گئی جس سے یہ منحوس آگ بجھ گئی۔

اس واقعہ کے بعد میں دو ماہ تک بھائی عثمان کو نہ دیکھ سکی لیکن بوڑھی خادمہ کا ان کے کمرے میں آنا جانا ہوتا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہیں اور گوشہ نشینی اختیار کر چکے ہیں کئی بار مجھے خیال آیا کہ جا کر ان سے معافی مانگوں مگر میں مجرم تھی اور وہ انتہائی سخت گیر واقع ہوئے تھے اس لئے جرات نہ ہوئی اور میں اپنی اس بے قوفانہ حرکت پر بہت نادم تھی۔

خزاں کا آغاز تھا نہایت اداس اور خشک دوپہر تھی میں آتش دان کے قریب سر نگوں بیٹھی تھی کہ بوڑھی خادمہ نے آ کر مجھ سے کہا شگوفہ جان تمہیں آغا بلا رہے ہیں

اس اچانک بلاوے نے مجھے کسی حد تک خوفزدہ کر دیا نہ جانے بھائی عثمان اب مجھے کیا سزا دیں چنانچہ میں سہمی ہوئی ان کے کمرہ میں گئی۔

آج پہلی دفعہ میں نے ان کا کمرہ دیکھا تھا اس نیم تاریک کمرہ میں گہرے سبز رنگ کے اونی

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

پردے پڑے تھے اور چھت میں ایک بہت بڑی پیتل کی قندیل لٹک رہی تھی جس میں رکھے ہوئے ایک پیتل کے چومکھے چراغ میں بیر وزہ کی بتیاں جل رہی تھیں اور بیر وزہ کی تیز بو تمام کمرہ میں پھیل رہی تھی آتش دان میں ایک خاص قسم کی لکڑی سلگ رہی تھی جس کی روشنی بالکل سبز تھی بیر وزہ کی گہرے بادامی رنگ کی روشنی اس سبز روشنی کے گرد دھوئیں کی تہہ کی طرح لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی جس سے یہ کمرہ بھی ایک سبز غبارے کی شکل اختیار کر چکا تھا یہاں بھی وہی تصویروں کی زبان میں لکھے ہوئے قطعے لٹک رہے تھے اور قالین پر بھی کچھ ویسے ہی نشانات تھے اس انوکھے ماحول سے میں بہت گھبرائی

"آجاؤ شگوفہ بہن" انہوں نے نرمی سے کہا

ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میری جان میں جان آگئی میں خوشی اور تعجب کے ملے جلے احساس سے کانپتی ہوئی آگے بڑھی انہوں نے مجھے اپنے قریب ایک پتائی پر بٹھا لیا وہ بہت لاغر و کمزور ہو رہے تھے اور ان کی کلائیوں پر بہت بڑے بڑے سفید داغ دکھائی دیتے تھے۔

ان کو مہربان پا کر میں نے دبی زبان سے پوچھا۔

"یہ آپ کی کلائیوں پر نشان کیسے ہیں؟"

"یہ جل گئی ہیں تمہاری مہربانی سے شگوفہ" انہوں نے اداسی سے کہا

مجھے افسوس ہوا اور میں نے معافی کی غرض سے اپنا سر ان کے پاؤں پر رکھ دیا انہوں نے میرا سر آہستہ سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "شگوفہ میں تمہیں ملامت نہیں کرتا بلکہ اچھا ہوا کہ تم اس راز سے واقف ہو گئیں مجھے تم سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔"

میں نے حیرت سے بھائی عثمان کا منہ دیکھا کیونکہ میں نہ جانتی تھی کہ کون سا راز مجھ پر ظاہر ہوا ہے۔ آخر میں نے حوصلہ کر کے کہہ ہی دیا۔

"بھائی جان میں تو کسی راز سے بھی واقف نہیں ہوئی۔"

بھائی عثمان نے کہا۔ "تو پھر تم تہ خانے میں کیوں گئیں تھیں۔"

جس پر میں نے ان سے وہاں جانے کا سارا ماجرا بیان کیا بھائی عثمان کہنے لگا۔

"اچھا تو میرا خیال تھا کہ تم اکثر وہاں جایا کرتی ہو"

میں نے جواب دیا۔ "اگر میں پہلے کبھی گئی ہوتی تو اتنی خوفزدہ کیسے ہوتی۔"

بھائی عثمان نے کہا "بے شک"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے۔ "شگوفہ اب تم سیانی ہو گئی ہو اور یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارا میرے سوا اس دنیا میں کوئی عزیز نہیں ہے اور نہ تمہارے سوا میرا۔ اس لیے بہن بھائی کی حیثیت سے ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنا ہمارا فرض ہے۔"

میں نے کہا۔ "ضرور۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھا مجھے قول دو۔"

آہ میں نے انہیں بے سمجھے بوجھے قول دے دیا۔

بعد ازاں بھائی عثمان نے مجھے بتایا کہ اس واقعہ کے اٹھارہ سال پیشتر وہ ایک پارٹی کے ساتھ اس علاقہ میں آئے تو ایک غریب پہاڑی گوالے کی لڑکی کو دل دے بیٹھے۔ فرح گوا ایک گوالے کی لڑکی تھی۔ مگر اتنی خوددار اور قانع واقع ہوئی تھی کہ انتہائی کوششوں کے باوجود ان سے مانوس نہ ہوئی آخر انہوں نے اس کے باپ کو کسی نہ کسی طرح رام کر لیا۔ اس نے اس شرط پر ان کا نکاح فرح سے کر دیا کہ وہ اسی گاؤں میں سکونت اختیار کریں۔ مگر آہ ان کی قسمت میں سکھ نہ تھا۔ شادی کے بعد جلد ہی ان کے سہانے خوابوں کا تسلسل ٹوٹ گیا کیونکہ فرح دق کی مریض تھی اور وہ ان کی ان تھک کوششوں کے باوجود جانبر نہ ہو سکی۔

انہیں اس کی موت کا اتنا صدمہ ہوا کہ زندگی دوبھر ہو گئی وہ فرح کے علاج کے دوران میں کئی ایک ایسی جڑی بوٹیوں سے واقف ہو چکے تھے۔ جن کی عجیب و غریب خاصیتیں تھیں چنانچہ ایک ایسی جڑی بوٹی کا بھی انہیں علم تھا جس کے پھولوں پر اگر لاش رکھ دی جائے تو وہ خراب ہونے سے محفوظ رہتی ہے اور یہ سبز روشنی والی لکڑی بھی پھیپھڑوں کے امراض کے لیے اکسیر ہے اور یہ بیر وزہ کی بتیاں بھی دق کے جراثیم کو ہلاک کرتی ہیں۔ لہٰذا انہوں نے فرح کی لاش کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے کتب خانہ کے نیچے ایک تہ خانہ بنایا اور اس خاص بوٹی کے پھولوں کی سیج بنا کر اس پر فرح کو لٹا کر تہ خانہ میں بند کر دیا اور خود بیراگی بن کر جنگلوں اور بنوں میں آوارہ گردی کرتے لگے کبھی مہینے میں ایک آدھ دفعہ یہاں آتے اور لاش پر تازہ پھول ڈال جاتے۔

اسی دوران میں اتفاقاً انہیں ایک ایسا سنیاسی مل گیا جو ایک خاص علم جانتا تھا جسے ڈائنوں کا علم کہا جاتا ہے یہ علم ایک خاص زبان میں پڑھا جاتا ہے اور اس کی عبارت اعضاء کی صورت میں لکھی جاتی ہے جس کا عمل انسانی یا حیوانی اعضاء کو آسانی سے بدل سکتا ہے یا بالکل علیحدہ کر سکتا ہے۔

چنانچہ سنیاسی سے یہ علم حاصل کر کے انہیں اتنی خوشی ہوئی جیسے انہوں نے کونین کی دولت پالی محبت کی رنگینیاں، زندگی کی دلچسپیاں اور امیدوں کا ہر اکھڑا باغ ان کی آنکھوں کے سامنے لہلہانے لگا انہیں یقین تھا کہ اس عمل کے ذریعہ فرح کو دوبارہ زندگی دے سکیں گے غرضیکہ وہ انہیں ارمانوں کے دل میں لیے واپس آئے اور اس عمل کے ذریعہ انہوں نے بغیر کسی قسم کے آپریشن کے اس کے ناکارہ پھیپھڑے کا کلیجہ سمیت نکال دیئے اور بکری کے تازہ پھیپھڑے اس کے جسم میں داخل کیے لیکن چونکہ اس کو مرے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا اس لیے اس کا جسم سڑ کر ضائع ہو چکا تھا اور گوشت بالکل سوکھ کر لکڑی بن گیا تھا اس لیے وہ زندہ نہ ہو سکی، گو اس نے چند سانس لیے مگر پھر جلدی ختم ہو گئی۔

گو اب انہیں اس کی زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تھی لیکن خبط کا کیا علاج جس کے زیر اثر وہ بار

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

بار ناکارہ پھیپھڑے نکال کر نئے ڈالتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید بار بار ایسا کرنے سے اس کا جسم بھی تازہ ہو سکے گا۔ اس جدوجہد میں ان کی صحت خراب ہو گئی۔ اب انہیں محسوس ہوا کہ غور پرداخت کرنے والا ضرور کوئی ان کے پاس ہونا چاہیے لہٰذا اس لیے والدہ کو یہاں لے آئے جن کے آنے سے ان کی حالت بہت کچھ سنبھل گئی اور اسی طرح انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گذار دیا۔ مگر تھوڑے عرصہ سے وہ خود کو دق کا مریض تصور کرنے لگے۔ چونکہ وہ کئی جڑی بوٹیاں جانتے تھے اس لیے ان کے ذریعہ انہوں نے مرض کو دبا دیا۔ مگر مرض جڑ سے نہ گیا۔

اب ان کے لیے ضروری تھا کہ فرح کو زندہ کرنے کا خیال چھوڑ دیں وہ خود بھی اس کام سے بیزار ہو چکے تھے۔ مگر نہ معلوم کیوں اس کام سے باز نہ آئے۔ آخر خدا نے ان کی مدد کی کہ اس روز تہ خانے میں میری چیخ سن کر ایسے بوکھلائے کہ فرح کی لاش ہاتھوں سے چھوٹ کر جلتی آگ میں جا پڑی جس سے شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ بدحواسی سے بھاگ رہے تھے کہ راستہ میں مجھ پر نظر پڑی مجھے وہاں سے اٹھا لائے لیکن خدا جانے ان کی کلائیاں کیسے جل گئیں۔

اب وہ کئی دن سے سوچ رہے تھے کہ یہ بیماری جو انہیں لگ چکی ہے کس طرح رفع ہو۔ کہاں تک وہ اسے جڑی بوٹیوں کے ذریعے قابو میں رکھ سکیں گے اگر ذرا بھی بے احتیاطی ہو گئی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے لہٰذا اس دن ایک تدبیر ان کے ذہن میں آئی کہ اگر میں یہ علم ان سے سیکھ کر ان کے پھیپھڑے بکری کے تازہ پھیپھڑوں سے بدل دوں تو ان کی زندگی محفوظ ہو سکتی ہے میں نے حامی بھر لی۔

غرضیکہ کچھ دن بعد مجھے اسی تہ خانہ میں لائے جس میں کبھی فرح کی لاش رکھی گئی تھی جو آتش زدگی کے بعد انہوں نے ازسرِنو تعمیر کیا تھا، میز پر لیٹ کر انہوں نے مجھے دو طلسم سکھائے اور بکری کے تازہ پھیپھڑے جو خاص طور پر اس کام کے لیے تیار رکھے تھے۔ مجھے دیئے اور ہدایت کی کہ پہلے طلسم کے اثر سے جب ان کے پھیپھڑے باہر نکل آئیں تو دوسرا طلسم بکری کے پھیپھڑوں پر پڑھنے سے یہ ان کے جسم میں خود بخود داخل ہو جائیں گے۔ میں نے اس کام کو معمولی سمجھ رکھا تھا لیکن جونہی میں نے طلسم پڑھا تو کوئی چیز میرے پاؤں کے قریب آ گری میں نے جھک کر دیکھا۔ ایک پھیپھڑا معہ جگر کے میرے پاؤں میں تڑپ رہا تھا۔

میرا دل دہل گیا۔ میں نے گھبرا کر بھائی عثمان کی طرف دیکھا۔ ان کا رنگ اس وقت ایسا زرد ہو رہا تھا، کہ میں حواس باختہ ہو گئی۔ میری حالت دیکھ کر انہوں نے مجھے اشارہ سے بلایا۔ مگر میں بت بنی کھڑی رہی آخر انہوں نے اونچی آواز سے کہا۔ ”شگوفہ کیا دیکھ رہی ہو۔ اپنا کام شروع کر دو بیماری نے پہلے ہی مجھے نڈھال کر رکھا ہے۔ میں اس حالت میں زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکوں گا۔“

نہ جانے مجھے اس وقت کیا ہو گیا کہ انتہائی کوشش کے باوجود میں حرکت نہ کر سکی اور متوحش نگاہوں سے ان کے زرد اور مدقوق چہرے کو دیکھتی رہی ”او بدبخت لڑکی“ بھائی عثمان نے غصے سے

تلملاتے ہوئے کہا اور پوری طاقت سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اف اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک لاش اٹھ رہی ہے خوف و ہراس سے خون میری رگوں میں جم گیا۔ اور بے ہوش ہو گئی۔

جب میں ہوش میں آئی تو تہ خانہ میں مکمل خاموشی تھی اور بھائی عثمان چند قدم پر اوندھے منہ پڑے تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بے تحاشا سیڑھیوں کی طرف بھاگی اور اوپر جا کر کتب خانہ سے باہر نکلتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

اسی وقت بوڑھی خادمہ دوڑتی ہوئی آئی اور مجھے پچکارتے ہوئے رونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ میں نے سارا ماجرا اس سے بیان کر دیا۔ پہلے تو اس نے مجھے بہت ملامت کی پھر اپنے فرض سے آگاہ کرتے ہوئے اس کام کو انجام دینے کے لیے منت سماجت کرنے لگی۔ اب کھلی ہوا میں میرے حواس بھی کچھ بجا ہوئے۔ مجھے اپنی کمزوری پر سخت ندامت ہوئی اور بوڑھی خادمہ کے سمجھانے سے میں دوبارہ تہ خانہ میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

اس دفعہ مجھے دلیری بھی تھی کیونکہ بوڑھی خادمہ میرے ساتھ تھی۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بھائی عثمان ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ہم دونوں نے اٹھا کر انہیں میز پر لٹایا اور میں نے بکری کے پھیپھڑے پر طلسم پڑھنا شروع کیا۔ چند منٹ کے بعد وہ پھیپھڑا حرکت کرنے لگا۔ میں نے اپنا عمل جاری رکھا تو وہ پھیپھڑا صرف حرکت ہی کرتا تھا، مگر بھائی عثمان کے جسم میں داخل نہ ہوتا تھا۔ میں حیران تھی کہ یہ طلسم اپنا اثر پوری طرح کیوں نہیں کرتا۔ لیکن مجھے جلدی ہی معلوم ہو گیا۔ میں طلسم پورا نہیں پڑھ رہی تھی اس کا ایک آخری حرف بھول چکی ہوں۔ اپنی غلطی سے آگاہ ہو کر میں نے سر پیٹ لیا [illegible] دل کو مضبوط رکھتی تو اپنے عمل میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ اب وہ مر چکے تھے بھولا ہوا حرف [illegible] لاتا۔ اس کے بعد جب تک ان کی لاش ٹھیک تھی، میں نے انہیں زندہ کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔

بھائی عثمان کے مرنے کے بعد گاؤں کے آوارہ لڑکے میرے پیچھے پڑ گئے اور ایک دن رات کے وقت نہ جانے کس طرح میرے جھونپڑے میں گھس آئے، اس وقت میں ایک انسانی کلیجہ اپنے ہاتھ میں لئے اس پر اپنا عمل کر رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے کلیجے کو چبانا شروع کر دیا۔ یہ حالت دیکھ کر وہ اتنے خوفزدہ ہوئے کہ بجائے سیدھے راستے بھاگنے کے کھڑکی سے کود گئے جن میں سے ایک تو نیچے گرتے ہی مر گیا۔ اور دوسرے بھاگ نکلے اور انہوں نے گاؤں میں جا کر مجھے ڈائن مشہور کر دیا۔ اس دن سے کسی نے بھی میرے جھونپڑے کی طرف آنے کی جرأت نہ کی۔

ایک سال گاؤں میں وبا پھیل گئی یہ ایک نئی بیماری تھی یعنی پہلے زکام کی شکایت ہوتی۔ ساتھ ہی سر میں درد ہوتا۔ دوسرے دن ناک اور منہ سے خون آتا جس سے مریض فوراً مر جاتا۔ لہٰذا ان لوگوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے اس وبا کا خالق مجھے ہی قرار دیا اور میرے قتل کے منصوبے ہونے لگے۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اکیلی عورت کو مارنا بھلا کون سی بڑی بات ہے کیونکہ اب میری بوڑھی خادمہ بھی مر چکی تھی۔ چونکہ میں ان کی نظروں میں عورت نہ تھی بلکہ ایک ڈائن تھی اس لیے وہ اس سازش کو عملی جامہ پہنانے سے ہچکچاتے رہے۔

نوری ایک یتیم لڑکی تھی جو کبھی کبھی مجھ سے پیناپرانا کپڑا یا بچا کھچا کھانا لے جایا کرتی۔ ایک دن اس نے مجھے گاؤں والوں کے ارادے سے آگاہ کیا۔ اسی دن میں شام کو خود گاؤں میں گئی۔

نمبردار کی حویلی میں اس وقت محفل جم رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے میں نے گرج کر کہا۔

"مجھے اپنے علم کے زور سے معلوم ہوئہ ہے کہ گاؤں میں میرے خلاف ہنڈیا پک رہی ہے۔ اس لیے میں تمہیں آگاہ کرنے آئی ہوں کہ ڈائن کسی کے مارے نہیں مرتی اور اگر وہ مر بھی جائے تو اس کی بد دعا کبھی نہیں مر سکتی۔"

میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ گاؤں والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ میری منتیں کرنے لگے کہ وباء سے انہیں بچاؤں۔

میں نے بھائی عثمان سے سن رکھا تھا کہ یہاں ایک خاص قسم کا لہسن پیدا ہوتا ہے جس کے کھانے سے ہر قسم کے زکام کے جراثیم مر جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ کل گاؤں کے معززین میرے ڈیرے پر آئیں اور فلاں قسم کے لہسن کا ایک ٹوکرا بھر کر ساتھ لائیں۔

دوسرے دن وہ لوگ لہسن کا ٹوکرا لے کر میرے گھر آئے تو میں نے یہ شرط پیش کی کہ ان تینوں گاؤں کے لوگ اگر مجھے اپنا پیر بنائیں اور نذرانہ دیا کریں تو میں وباء دور کر دوں گی انہوں نے میری شرط منظور کر لی۔

سمجھوتہ ہونے کے بعد میں نے لہسن پر جھوٹ موٹ دم کر دیا اور حکم دیا کہ یہ لہسن وباء زدہ لوگوں کو کھلایا جائے جب اس لہسن کے کھانے سے وہ لوگ اچھے ہونے لگے تو میرا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ اس دن سے یہ لوگ مجھے نذرانہ دینے لگے اور فارغ البالی سے میری گزر اوقات ہوتی رہی حتیٰ کہ وہ دن بھی آ پہنچا کہ آپ سے ملاقات ہوئی اور آپ کی محبت میرے من میں بس گئی، مگر پھر جب آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو میرا برا حال ہوا میں زندگی سے بیزار رہنے لگی آخر ایک مدت کے بعد میری محبت کی کشش پھر آپ کو یہاں کھینچ لائی تو ظالموں نے آپ کو بہکانا شروع کیا۔ آخر آپ انسان تھے۔ دھوکے میں آ گئے اب اگر میں لاکھ صفائی پیش کروں، پھر بھی آپ کی محبت اور ہمدردی حاصل نہیں کر سکتی۔ آپ ہمیشہ مشکوک رہیں گے۔

شگوفہ نے اپنی کہانی ختم کرتے ہی نہایت غمگین ہو کر سر جھکا لیا اور کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔

میری بغل میں بد نصیب پرندے کی تڑپ بھی دم بدم کم ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی لمبی خاموشی سے اکتا کر کہا۔

"بس کہانی تو ختم ہو گئی۔ اب مجھ کو اجازت دو کہ اس پرندے کو رہا کروں تاکہ یہ کم از کم آخری سانس تو کھلی ہواؤں میں لے سکے"

شگوفہ نے کچھ جواب نہ دیا اور بے حس و حرکت بیٹھی رہی، یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کانپ رہی ہے میں نے محبت سے اس کے سیمیں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

اف وہ برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ مگر اس کی حالت بدستور یہی رہی' میں نے اسے جھنجھوڑ کر زور سے پکارا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا خوشنما سر اونچا کیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو چکا تھا اور اسکی شرابی آنکھیں سچ مچ بد مستوں کی طرح نیم باز تھیں۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنی کانپتی ہوئی مرمریں بانہیں اٹھا کر میرے گلے میں ڈال دیں۔ میں نے اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا۔

"شگوفہ تمہارا جسم اتنا سرد کیوں ہے کیا کچھ بیمار ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ میں نے پھر پکارا۔

"شگوفہ..............."

"میرے آقا" اس نے رکتے ہوئے کہا۔ "میں نے ڈائن کا ذلیل لفظ اپنے نام سے ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا"

یہ کہتے ہوئے اس کا سر خود بخود میری چھاتی سے لگ گیا اور اس کے پھول سے لب ہمیشہ کے لیے کھلا گئے۔ میں نے سمجھا کہ وہ غش کی حالت میں ہے لیکن میری انتہائی کوششوں کے باوجود اس کی دائمی غشی دور نہ ہو سکی۔

شگوفہ کی اس اچانک موت سے میرا کلیجہ پھٹنے لگا اور میں تمام رات گریہ وزاری کرتا رہا۔

صبح جب گاؤں والے اس کی تجہیز و تکفین کی تیاری کرنے لگے تو مجھے اس پرندے کا خیال آیا جو رات شگوفہ نے میری بغل میں دیا تھا۔ دیکھا تو وہ بدستور سیاہ پنکھے میں لپٹا ہوا ایک طرف پڑا تھا میں نے بے تابی سے اٹھا کر اسے کھولا۔ آہ! یہ پرندہ دراصل شگوفہ کے پھیپھڑے اور کلیجہ تھا۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

آسیبی کمرہ

جٹ لینڈ کے شہروں میں سے وائی بورگ کو واقعی ایک بلند حیثیت حاصل ہے۔ یہاں لاٹ پادری کا مقام ہے، ایک خوش نما اور تقریباً بالکل نیا گرجا ہے ایک دلکش باغ اور ایک خوبصورت جھیل بھی ہے جہاں بہت سے بگلے پائے جاتے ہیں۔ اس کے نزدیک ہی موضع ہالڈ ہے جو ڈنمارک میں نفیس ترین چیزوں کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ فنڈرپ کا مقام بھی قریب ہی واقع ہے جہاں ۱۲۸۶ء میں سینٹ سیسیلیا کے دن مارسک سٹیگ نے شاہ ایرک گلپنگ کو قتل کیا تھا۔ سترھویں صدی میں جب شاہ ایرک کا مقبرہ کھدوایا گیا تو اس کی کھوپڑی پر لوہے کے چوکور سرے والے ڈنڈے کی چھین ضربوں کے نشانات پائے گئے لیکن میں کوئی گائڈ بک نہیں لکھ رہا ہوں کہ مقبروں کی تفصیلات میں الجھوں۔

وائی بورگ میں کئی اچھے ہوٹل ہیں۔ پرانسلرس اور فینکس زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ لیکن میرا چچازاد بھائی جس کے تجربات میں اب آپ کو بتانے والا ہوں، جب وائی بورگ میں پہلی بار وارد ہوا تو گولڈن لائن میں ٹھہرا۔ اس کے بعد پھر اس نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا اور شاید آنے والے صفحے اس کے اجتناب کی وجہ کی تشریح کر سکیں۔

گولڈن لائن شہر کی ان معدودے چند عمارتوں میں سے ایک ہے جو ۱۷۲۶ء کی عظیم آتشزدگی میں تباہ نہ ہوئیں۔ اس آگ نے راڑ ہوس، سوگنے کرکے کا مشہور گرجا اور کئی قدیم اور قابل دید عمارات بالکل نیست و نابود کر دی تھیں۔ گولڈن لائن سرخ اینٹوں کی بہت بڑی عمارت

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ہے یعنی سامنے کا رخ اینٹوں کا بنا ہوا ہے اور تکونی چھت پر سیڑھی دار بیٹریاں لگی ہوئی ہیں۔ دروازے کے اوپر کچھ عبارت کندہ ہے لیکن کھلا صحن جہاں موٹریں آ کر رکتی ہیں، سیاہ اور سفید لکڑی اور پلستر کا بنا ہوا ہے۔

جب میرا چچازاد بھائی اس کے دروازے تک پہنچا تو سورج کافی ڈھل چکا تھا اور عمارت کے سامنے کے رخ پر روشنی پوری طرح پڑ رہی تھی۔ وہ اس جگہ کے قدیم فیشن کے طرز تعمیر سے بڑا خوش ہوا اور اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ وہ قدیم جٹلینڈ کی ایسی مثالی قیام گاہ میں اطمینان اور خوشی سے بہرہ ور ہوگا۔

مسٹر اینڈرسن کو معمولی معنوں میں محض کاروبار کی غرض سے وائی بورگ نہیں آنا پڑا تھا بلکہ اسے ڈنمارک کی مذہبی تاریخ کے بارے میں کچھ تحقیقی کام پر مامور کیا گیا تھا اور یہ بات اس کے علم میں آ چکی تھی کہ وائی بورگ کی ایک عمارت رگسارکیو میں کچھ ایسے کاغذات موجود ہیں جو آگ سے بچ گئے ہیں اور جن سے ملک میں آخری رومن کیتھولک دور پر روشنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس نے اس مقصد کے لیے کافی وقت صرف کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ان کاغذات کے معائنے اور نقل کرنے میں غالباً دو یا تین ہفتے لگیں گے۔ اسے یہ بھی امید تھی کہ گولڈن لائن میں اسے کوئی ایسا بڑا کمرہ مل جائے گا جو سونے کے لیے اور لائبریری دونوں کا کام بخوبی انجام دے سکے۔ اس نے اپنی یہ خواہش جب ہوٹل کے مالک سے بیان کی تو کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ خود ہی دو ایک بڑے کمرے دیکھ کر حسب منشا کمرہ منتخب کر لیں تو بہتر ہے۔ اسے یہ ایک اچھا خیال معلوم ہوا۔

آخری منزل کو جلد ہی مسترد کر دیا گیا کیونکہ بصورت دیگر دن بھر کے کام کے بعد اتنی ساری سیڑھیاں چڑھنی پڑتیں۔ دوسری منزل میں حسب منشا مناسب رقبے کا کوئی کمرہ نہ تھا۔ البتہ پہلی منزل میں دو تین کمرے ایسے تھے جو ضرورت کے مطابق کافی کشادہ تھے۔

ہوٹل کا مالک شدت سے نمبر ۱۷ کے حق میں تھا لیکن مسٹر اینڈرسن نے کہا کہ اس کمرے کی کھڑکیاں سامنے کے مکان کی خالی دیوار کی طرف کھلتی ہیں اور دوپہر کو یہاں بہت کم روشنی ہوگی۔ نمبر ۱۲ یا نمبر ۱۴ بہتر رہے گا۔ کیونکہ دونوں کمروں کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی ہیں اور شام کی چمکیلی روشنی اور خوبصورت بیرونی منظر آنے والے شور کی تلافی کے لیے کافی ہیں۔

آخر کار نمبر ۱۲ کا منتخب کر لیا گیا۔ آس پاس کے کمروں کی طرح اس کی تین کھڑکیاں تھیں جو کمرے کی ایک ہی طرف واقع تھیں۔ یہ کمرہ کافی بلند اور لمبا تھا۔ یہاں کوئی انگیٹھی نہ تھی لیکن چولہا خوش نما اور قدرے پرانا تھا ایک طرف لوہے کا چبوترہ سا بنا ہوا تھا جس پر حضرت ابراہیم کو قربانی پیش کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور اس پر کچھ تحریر بھی درج تھی۔ کمرے میں اور کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔ شہر کی ایک قدیم رنگین تصویر دیوار پر آویزاں تھی۔ جس پر سن ۱۸۲۰ء لکھا ہوا تھا۔

رات کے کھانے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ لیکن جب اینڈرسن منہ ہاتھ دھونے کے بعد تازہ دم ہو کر سیڑھیاں اترا تو گھنٹی بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ اتنے میں وہ اپنے ہمسایوں کے ناموں کی فہرست کا بغور مطالعہ کرنے لگا جیسا کہ ڈنمارک میں عام رواج ہے ان کے نام ایک بڑے تختہ سیاہ پر لکیریں اور کالم بنا کر لکھے گئے تھے اور کمروں کے نمبر ہر سطر کے آغاز میں درج تھے۔ یہ فہرست بڑی دلچسپ تھی۔ ان میں ایک ایڈووکیٹ یا سکولور، ایک جرمن اور چند سفری ایجنٹ شامل تھے جو کوپن ہیگن سے آئے تھے۔ ایک بات البتہ ایسی تھی جس سے خیال آرائی کا موقع نکلتا ہے اور وہ یہ تھی کہ ہمسایوں کی فہرست میں نمبر ۱۳ کا اندراج نہ تھا اور یہ چیز اینڈرسن پہلے بھی ڈنمارک کے ہوٹلوں میں چھ بار دیکھ چکا تھا۔ وہ اس پر حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکا کہ محض اسی نمبر سے ناپسندیدگی کا اظہار اتنی شدت سے پھیلا ہوا ہے کہ کسی شخص کو اس نمبر کا کمرہ دینا مشکل ہو گیا ہے۔ اس نے ہوٹل کے مالک سے یہ دریافت کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ کیا اسے یا اس کے ہم پیشہ افراد کو واقعی ایسے گاہکوں سے سابقہ پڑا ہے جنہوں نے کمرہ نمبر ۱۳ میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا ہو۔

رات کا کھانا کھانے کے موقع پر کیا گزری، اس بارے میں اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا (میں یہ کہانی اس انداز میں بیان کر رہا ہوں جیسا کہ میں نے اس سے سنی تھی) شام کا زیادہ حصہ اس نے اپنے کپڑے، کتابیں اور کاغذات کھولنے اور ترتیب سے رکھنے میں بسر کیا۔ تقریباً گیارہ بجے اس نے سونے کا ارادہ کیا لیکن آج کل کے بہت سے لوگوں کی طرح اس کی بھی عادت تھی کہ سونے سے پہلے چند صفحے پڑھا کرتا تھا اور اب اسے یاد آیا کہ جو کتاب وہ راستے میں ریل گاڑی میں پڑھتا رہا تھا اور جو اس موقعے پر وہ پڑھنا چاہتا تھا، وہ اس کے اوور کوٹ کی جیب میں پڑی تھی جو اس وقت کھانا کھانے کے بعد کمرے کے باہر ایک کھونٹی پر لٹک رہا تھا۔

نیچے جا کر کتاب لانا ایک منٹ کا کام تھا اور چونکہ راستے میں اندھیرا ابھی نہ تھا لہٰذا اس کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ واپس آتے وقت اپنا دروازہ ڈھونڈ لے۔ کم از کم اس نے ایسا ہی خیال کیا لیکن جب وہ وہاں پہنچا اور ہینڈل کو گھمایا تو دروازے نے کھلنے سے بالکل انکار کر دیا اس کے ساتھ ہی اس نے اندر کسی کے تیز تیز چلنے کی آواز بھی سنی۔ وہ واقعی غلط دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو پھر اس کا اپنا کمرہ بائیں طرف؟ اس نے نمبر دیکھا: ۱۳ تھا۔ اس کا کمرہ بائیں طرف ہونا چاہیے اور واقعی ایسا تھا۔ اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے اپنی کتاب کے تین چار صفحے پڑھے پھر بتی بجھا کر وہ سونے ہی والا تھا۔ کہ اچانک اسے خیال آیا کہ فہرست میں تو کمرہ نمبر ۱۳ کا اندراج ہی نہیں تھا۔ حالانکہ ہوٹل میں اس نمبر کا کمرہ واقعی موجود تھا۔ اسے کسی حد تک افسوس بھی ہوا کہ اس نے وہ کمرہ اپنے لیے کیوں نہ منتخب کر لیا۔ شاید اس طرح وہ ہوٹل کے مالک کے کچھ کام آ سکتا اور مالک کو اپنے گاہکوں سے کہنے کا موقع بھی ملتا کہ ایک بھلا مانس انگریز یہاں تین ہفتے قیام کر چکا ہے جسے یہ کمرہ بڑا پسند تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ کمرہ نوکروں کے لیے ہو یا اور کسی ایسے ہی کام میں لایا جاتا

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ہو۔ بہر حال یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کمرہ اس کے اپنے کمرے جتنا بڑا نہ ہو یا اتنا چھا نہ ہو۔ اور اس نے خواب آلود آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا جو بجلی کے لیمپ سے آتے والی مدھم روشنی میں دن کی نسبت بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تو لمبائی میں کم لگتا تھا اور دیواروں کے تناسب سے کچھ اونچا بھی دکھائی دیتا تھا، خیر ان پراگندہ خیالات سے نیند زیادہ اہم تھی اور وہ سو گیا۔

اگلے روز اینڈرسن نے وائی بورگ کے رگسادکو پر حلہ بول دیا۔ توقع کے مطابق اس کا خیر مقدم کیا گیا اور اس کی خواہش کے مطابق ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی گئی۔ کاغذات جو اس کے سامنے رکھے گئے تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ اور اس کے اندازے سے زیادہ دلچسپ تھے سرکاری کاغذات کے علاوہ وہاں رومن کیتھولک کلیسا کے آخری اسقف اعظم، بشپ جورگن فرائس کے متعلق بہت سے خطوط کا ایک پلندہ تھا جن سے اس کی نجی اور کردار کی کھلی تفصیل ملتی تھی اور کئی دلچسپ باتوں کا پتا چلتا تھا۔ بشپ کے ایک مکان کا بڑا ذکر کیا گیا تھا جو شہر میں تھا لیکن وہ خود اس میں رہائش نہیں رکھتا تھا۔ اس کا مکین بظاہر بڑا بدنام تھا اور اصلاحی فریق کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ شہر کے لیے باعث ننگ تھا خفیہ اور شیطانی ٹوٹکے اس کا مشغلہ تھے اور اس نے اپنا ضمیر ابلیس کے ہاتھ بیچ رکھا تھا۔ وہ کسی بابلی مذہب کا پیرو تھا اور یہ بڑی خرابی کی بات تھی کہ بشپ اس قسم کے موذی اور بدکردار شخص کی سرپرستی کرے۔ بشپ نے ایسی لعن طعن کا جرات سے مقابلہ کیا۔ اس نے خفیہ سرگرمیوں اور اس قسم کی باتوں سے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور اپنے مخالفوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس معاملے کو مناسب عدالت میں پیش کریں تاکہ اس کی پوری پوری تفتیش کی جائے۔ مناسب عدالت سے ان کی مراد روحانی عدالت تھی اور اگر شہادت سے ثابت ہو جاتا کہ میگ نکولاس فرینکن ان جرائم میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا ہے جو مبینہ طور پر اس کے خلاف عائد کئے گئے ہیں تو بشپ سے زیادہ اور کوئی شخص اس کی مذمت پر آمادہ نہ ہوتا۔

ریکارڈ آفس بند ہونے سے پیشتر اینڈرسن کے پاس اس سے زیادہ وقت نہ تھا کہ وہ پروٹسٹنٹ لیڈر ریسمس نیلسن کے دوسرے خط کو سرسری نظر سے دیکھ سکے تاہم اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عیسائی عوام اب روم کے لاٹ پادریوں کے فیصلوں کے پابند نہیں رہے اور بشپ کی عدالت کو اس حد تک بااختیار نہیں سمجھا جاتا کہ وہ اہم اور سنجیدہ معاملات کا حتمی فیصلہ کر سکے۔

دفتر سے باہر نکلتے وقت اینڈرسن کے ساتھ ایک معمر شخص بھی تھا جو اس ادارے کا صدر تھا اور جونہی وہ اکٹھے چلنے لگے ان کی گفتگو کا رخ قدرتی طور پر انہی کاغذات کی طرف مڑ گیا جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

وائی بورگ کے ناظم دستاویزات ہر سکاٹیولیس کو اگرچہ ان تمام مسودات کا پوری طرح علم تھا جو اس کی تحویل میں تھے تاہم وہ اصلاحی دور کے کاغذات کا ماہر نہ تھا۔ اینڈرسن نے ان کے بارے میں جو کچھ بتایا ناظم نے اس میں بڑی دلچسپی لی اور اس کتاب کو پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا جو ان کاغذات

کی مدد سے اینڈرسن لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا "بشپ فرائس کا یہ مکان" اس نے مزید کہا "میرے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے نہ جانے یہ کہاں واقع تھا میں نے قدیم وائی بورگ کے نقشے کا بغور مطالعہ کیا ہے لیکن بدقسمتی سے بشپ کی جائداد کا اندراج ۱۹۲۰ء میں جس قدیم کھتونی میں کیا گیا تھا اور جس کا بڑا حصہ ہمارے ریکارڈ میں موجود ہے اس کا وہی حصہ گم ہو چکا ہے جس پر شہر کی جائداد کی فہرست تھی۔ خیر کوئی بات نہیں مجھے امید ہے کہ میں اسے تلاش کرنے میں کبھی نہ کبھی کامیاب ہو جاؤں گا۔"

تھوڑی دیر چہل قدمی کرنے کے بعد اینڈرسن واپس گولڈن لائن پہنچا، رات کا کھانا کھایا، کچھ دیر اکیلا تاش کے پتوں سے کھیلتا رہا اور پھر سونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ راستے میں اسے ایک دم خیال آیا کہ اس نے ہوٹل کے مالک سے ابھی تک ذکر ہی نہیں کیا کہ تختے پر کمرہ نمبر ۱۳ کا اندراج نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سوچا کہ اس سلسلے میں کوئی بات کرنے سے پہلے وہ یہ تصدیق کر لے کہ کمرہ نمبر ۱۳ واقعی موجود بھی ہے۔

اس فیصلے پر عمل کرنا دشوار نہ تھا۔ دروازہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا اور اس پر نمبر بھی صاف پڑھا جا رہا تھا۔ جونہی وہ اس کے قریب پہنچا اسے کچھ آوازیں آئیں اور قدموں کی چاپ سنائی دی بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرے میں کسی قسم کا کام ہو رہا ہے۔ چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ قدموں کی چاپ دروازے کے بالکل قریب آ کر رک گئی۔ اور اس نے قدرے تعجب سے ایک ایسی آواز سنی جیسے کوئی شخص بڑے جوش میں تیز تیز سانس لے رہا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ کمرہ اب بہت چھوٹا معلوم ہو رہا تھا حالانکہ جب اس نے یہ کمرہ منتخب کیا تھا تو یہ خاصا بڑا دکھائی دیتا تھا۔ اگر یہ واقعی کافی کشادہ نہیں تو وہ بڑی آسانی سے کسی اور میں منتقل ہو سکتا تھا اس اثناء میں اسے کسی چیز کی ضرورت پڑی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اسے اپنے چرمی تھیلے میں سے ایک رومال درکار تھا اور وہ تھیلا ملازم نے اس کے پلنگ کی مخالف سمت والی دیوار کے قریب ایک سٹول پر رکھا تھا۔ اب ایک بڑی عجیب بات ہوئی یعنی وہ بڑا تھیلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید ملازموں میں سے کسی نے اسے کہیں اور رکھ دیا ہو یا شاید کپڑوں کی الماری میں پڑا ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا یہ سوچ کر اسے رنج ہوا ایک دم اسے خیال آیا کہ کہیں چوری تو نہیں ہو گیا۔ ڈنمارک میں ایسی وارداتیں شاذ و نادر ہی ہوتی ہیں لیکن کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں متعلقہ ملازم سے پوچھ گچھ ضروری تھی اسے جس چیز کی ضرورت تھی وہ خواہ کچھ بھی ہو مگر اس کے آرام کے پیش نظر اس قدر ضروری نہ تھی کہ وہ صبح تک انتظار نہ کر سکتا۔ لہٰذا اس نے گھنٹی بجانے اور نوکروں کو بے آرام کرنے سے اجتناب ہی کیا وہ اٹھ کر کھڑکی کی طرف گیا، یہ دائیں ہاتھ والی کھڑکی تھی اور وہ با ہر سنسان بازار میں جھانکنے لگا۔ سامنے ایک طویل عمارت کھڑی تھی، جس کی سادہ دیوار نظر آ رہی تھی۔ کوئی راہگیر چلتا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا۔ رات بڑی تاریک تھی اور باہر کا منظر اچھی طرح نظر نہ آ رہا تھا۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کمرے کی بتی اس کے بالکل پیچھے تھی اور وہ سامنے کی دیوار پر اپنا سایہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ کمرہ نمبر ۱۱ کے داڑھی والے شخص کا سایہ بائیں طرف پڑ رہا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ قمیض پہنے ہوئے دو ایک بار اپنی کھڑکی کے آگے سے گزرا ہے۔ پہلے تو وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرتا ہوا دکھائی دیا تھا اور کچھ دیر بعد وہ چغہ پہنے ہوئے دکھائی دیا۔ اس کے علاوہ کمرہ نمبر ۱۳ کے مکین کا سایہ بھی دائیں ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ یہ کچھ زیادہ دلچسپ تھا۔ کمرہ نمبر ۱۳ بھی اس کی طرح کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکائے جھک کر بازار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سائے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دراز قد اور دبلا آدمی ہے..... یا شاید عین ممکن ہے کہ عورت ہو؟ خیر وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے بستر پر جانے سے پہلے اپنا سر کسی قسم کے کپڑے سے ڈھانپا تھا اور اینڈرسن نے سوچا کہ اس کے کمرے میں سرخ شیڈ والا لیمپ ہوگا، جس کی لو بہت ٹمٹما رہی تھی۔ سامنے کی دیوار پر سرخ رنگ کی مدھم روشنی جھلملا رہی تھی۔ وہ کھڑکی میں سے سر نکال کر ذرا آگے جھانکا تاکہ وہ اپنے ہمسائے کو دیکھ سکے لیکن ساتھ والی کھڑکی سے سفید سی روشنی، اٹھتی ہوئی نظر آئی جس کے پار اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔

بازار میں کچھ فاصلے سے آہٹ سنائی دی جس کے قریب آنے پر نمبر ۱۳ کو جیسے اپنی موجودہ وضع کا احساس ہو گیا تھا۔ ایک دم بڑی تیزی سے وہ اس کھڑکی سے پرے ہٹ گیا اور پھر سرخ روشنی بجھ گئی۔ اینڈرسن اس اثنا میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے بچا ہوا سرا کھڑکی کی سل پر گرا دیا اور اپنے بستر پر واپس آ گیا۔

اگلی صبح خادمہ نے اسے جگایا اور بتایا کہ نہانے کے لیے گرم پانی تیار ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور ڈینش زبان کے صحیح الفاظ سوچ کر حتی الامکان صاف طور پر کہا۔

”تم نے میرا چرمی تھیلا دیکھا ہوگا۔ کہاں ہے وہ؟“

جیسا کہ عام پر ہوتا ہے، ملازمہ ہنسی اور کوئی واضح جواب دیئے بغیر باہر چلی گئی۔

اس پر اینڈرسن کو کچھ تاؤ سا آ گیا وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تاکہ اسے واپس بلائے۔ لیکن وہ بیٹھا ہی رہ گیا۔ اس کی نظر سامنے کی دیوار کی طرف پڑ رہی تھی۔ قریب ہی اس تپائی پر چرمی تھیلا پڑا تھا جہاں اس کی آمد پر ملازم نے رکھا تھا۔ ایک ایسے آدمی کے لیے جسے اپنی قوت مشاہدہ پر خاصا ناز ہو یہ بڑے اچنبھے کی بات تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تھیلا گذشتہ رات اس کی نظروں سے اوجھل رہا اور وہ اس کے متعلق پریشان رہا۔ اور اب وہ اس کے سامنے پڑا تھا۔

دن کی روشنی میں چرمی تھیلے کے علاوہ کچھ اور بھی منکشف ہوا۔ اب یہ کمرہ اپنی تین کھڑکیوں کے ساتھ صحیح طور پر متناسب دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اطمینان ہوا کہ اس کی پسند بہر حال بری نہ تھی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ درمیانی کھڑکی کی طرف گیا تاکہ دیکھے کہ باہر موسم کیسا ہے۔ ایک اور صدمہ اس کا منتظر تھا۔ گزشتہ رات وہ ضرور عجیب طریقے سے غافل رہا ہوگا وہ دس مرتبہ قسم کھا کر یہ کہہ سکتا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے وہ بائیں ہاتھ والی کھڑکی میں کھڑا سگریٹ پیتا رہا

تھا۔ اور اب سگریٹ کا سرا درمیانی کھڑکی کی سل پر پڑا تھا۔

ناشتہ کرنے کی غرض سے وہ نیچے جانے لگا۔ اگرچہ اسے کچھ دیر ہو گئی تھی تاہم نمبر ۱۳ اس سے زیادہ لیٹ تھا۔ دروازے کے باہر اس کے جوتے پڑے تھے..... مردانہ جوتے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نمبر ۱۳ ایک مرد ہے، عورت نہیں۔ اسی وقت اس کی نظر اوپر جا پڑی۔ دروازے کا نمبر ۱۴ تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ دھیان دیئے بغیر نمبر ۱۳ کے سامنے سے گزر آیا ہے۔ گذشتہ بارہ گھنٹوں کے عرصے میں تین فاش غلطیاں کسی باسلیقہ اور صحیح الدماغ آدمی کے لیے بہت زیادہ ہیں۔ وہ اصلیت معلوم کرنے کے لیے واپس مڑا۔ نمبر ۱۴ سے اگلا کمرہ نمبر ۱۳ یعنی اس کا اپنا کمرہ تھا۔ نمبر ۱۳ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

اینڈرسن کچھ منٹ تک کھڑا اپنے ذہن پر زور ڈال کر سوچتا رہا کہ اس نے گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں کیا کھایا پیا تھا۔ پھر اس نے اس سوال ہی کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر اس کی آنکھیں یا اس کا دماغ جواب دے گئے ہوتے تو اسے اور بھی کئی موقعوں پر اس حقیقت کا علم ہوتا اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ ایک بڑے دلچسپ تجربے سے دوچار ہو رہا ہے۔ بہرحال واقعات کی رفتار کا جائزہ لینا یقینی طور پر ضروری تھا۔

دن کے دوران وہ لاٹ پادری سے خط و کتابت کی جانچ پڑتال کرتا رہا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اسے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ یہ پلندہ نامکمل تھا۔ صرف ایک اور خط ایسا ملا جس میں میگ نکولاس فرینکن کے بارے میں ایک حوالہ تھا۔ یہ خط بشپ جورگن فرائس نے ریسمس نیلسن کے نام لکھا تھا۔ مضمون یوں ہے:۔

”اگرچہ ہم اپنی عدالت کے متعلق تمہارے فیصلے کو بے عذر مان لینے پر قطعاً مائل نہیں ہیں اور اس سلسلے میں اگر ضرورت پڑی تو تمہارا پورا پورا مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ ہوں گے۔ لیکن جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہمارا عزیز اور قابل اعتماد میگ نکولاس فرینکن، جس کے خلاف تم نے جھوٹے اور حاسدانہ الزامات عائد کرنے کی جرأت کی ہے، ہم سے اچانک جدا ہو گیا ہے۔ تو اس وجہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہار گئے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ مسیح کے حواری اور انجیل کے کاتب یوحنا نے اپنے آسمانی الہام کے مطابق مقدس رومن چرچ کو ”سرخ عورت“ کے روپ اور نشان کے تحت بیان کیا ہے، اگر تم نے مزید الزام تراشی کی تو تمہیں اس کا پتہ چل جائے گا۔“

حتی الامکان تلاش کے باوجود اینڈرسن کو اس خط کا باقی ماندہ حصہ نہ مل سکا اور نہ کوئی سراغ لگ سکا کہ جس شخص سے جھگڑا چلا وہ کیوں اور کس طرح ”جدا“ ہوا۔ وہ محض یہ فرض کر سکا کہ فرینکن اچانک مر گیا ہوگا۔ اور چونکہ بشپ کے خط اور نیلسن کے آخری خط کی تاریخ میں، جب کہ فرینکن ابھی زندہ تھا، صرف دو دن کا وقفہ تھا۔ اس لیے اس کی موت ضرور بالکل غیر متوقع طور پر واقع ہوئی ہوگی۔

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

دوپہر کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے ہالڈ کی جانب گیا اور ہیکلنڈ میں چائے پی۔ اگرچہ وہ اس وقت قدرے پریشان تھا تاہم اسے اپنے صبح والے تجربات کے پیش نظر اپنی بصارت یا دماغ کی کسی خرابی کا کوئی ثبوت نہ ملا۔

رات کو کھانے کی میز پر وہ ہوٹل کے مالک کے ساتھ والی کرسی پر تھا۔

"کیا وجہ ہے" اس نے کچھ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد دریافت کیا۔ "کہ یہاں کے بہت سے ہوٹلوں میں ۱۳ نمبر کمرہ نہیں ہوتا؟ آپ کے ہاں بھی نہیں ہے۔"

ہوٹل کا مالک بظاہر دلچسپی لینے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ کو اس قسم کی باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیے! سچ بات تو یہ ہے کہ خود میں نے دو ایک دفعہ اس بارے میں سوچا ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ایک پڑھے لکھے آدمی کو ایسی توہم پرستی کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ میری ابتدائی تربیت وائی بورگ کے ہائی سکول میں ہوئی تھی اور ہمارا بوڑھا استاد ایک ایسا آدمی تھا جو ہمیشہ اس قسم کی باتوں کی مخالفت کیا کرتا تھا۔ اب کئی سال ہوئے وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ بڑا صحت مند تھا اور جسم کے ساتھ ساتھ اس کا ذہن بھی مستعد تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک روز برفباری ہو رہی تھی اور ہم لڑکے ......"

یہاں پہنچ کر وہ ماضی کے ذکر میں کھو گیا۔

"تو آپ کا خیال یہ ہے کہ ۱۳ نمبر کمرے پر کسی کو کوئی خاص اعتراض نہیں ہے؟ اینڈرسن نے پوچھا۔

"ہاں یقیناً! آپ جانیں کہ مجھے میرے بوڑھے باپ نے اس کاروبار میں لگایا تھا۔ پہلے تو وہ آر ہوس میں ایک ہوٹل چلاتے رہے اور پھر جب ہم پیدا ہوئے تو یہاں وائی بورگ میں چلے آئے جو کہ ان کی جائے پیدائش تھی اور اپنی وفات تک یہاں فینکس ہوٹل میں کاروبار کرتے رہے۔ یہ ۱۸۷۶ کی بات ہے۔ پھر میں نے سلکے بورگ میں کاروبار شروع کیا اور صرف پچھلے سال یہاں اس عمارت میں منتقل ہوا ہوں۔"

اس کے بعد اس عمارت کی حالت اور کاروبار کے ابتدائی دنوں کے متعلق تفصیلی گفتگو ہوتی رہی۔

"اور جب آپ اس عمارت میں آئے تھے تو یہاں ۱۳ نمبر کمرہ تھا؟"

"نہیں۔ میں اس کے متعلق آپ کو بتانے والا تھا۔ دیکھئے، اس قسم کے مقامات پر تجارتی طبقہ یعنی مسافر ہی ہوتے ہیں جن کی خاطر ہمیں عموماً سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ انہیں اگر ۱۳ نمبر میں ٹھہرائیں تو وہ بازار میں سونے کو ترجیح دیں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے کمرے کا نمبر کیا ہے۔ لہٰذا میں نے اکثر اپنے گاہکوں سے بھی ایسا ہی کہا ہے لیکن وہ اس پر اڑے رہے کہ ۱۳ نمبر سے نحوست آتی ہے وہ کئی قسم کی کہانیاں سناتے ہیں کہ ۱۳ نمبر میں

سونے والے پھر ویسے نہ رہے۔ یا انہوں نے اپنے بہترین گاہک کھو دیئے یا اسی طرح کی اور کئی باتیں۔" ہوٹل کے مالک نے زیادہ واضح الفاظ ڈھونڈتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ اپنے نمبر ۱۳ کو کس کام میں لاتے ہیں؟" اینڈرسن نے پوچھا۔ وہ اس امر سے واقف تھا کہ ان لفظوں میں عجیب طرح کی تشویش پائی جاتی تھی جو اس سوال کی اہمیت سے کوئی موافقت نہ رکھتی تھی۔

"میرا نمبر ۱۳؟ کیا میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ اس مکان میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں؟ میرا خیال تھا کہ آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ اگر ۱۳ نمبر کمرہ ہوتا تو وہ آپ ہی کے کمرے کے ساتھ ہوتا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا تو یہی تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گزشتہ رات میں نے اسی گلیارے میں کمرہ نمبر ۱۳ دیکھا ہے اور واقعی مجھے یقین ہے کہ میں درست کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے اسے ایک رات پہلے بھی دیکھا تھا۔"

اس پر ہر کرسٹنسن نے، اینڈرسن کی توقع کے مطابق، مضحکہ خیز قہقہہ لگایا اور اس حقیقت پر بڑی تکرار سے زور دیا کہ اس ہوٹل میں ۱۳ نمبر کمرہ کوئی نہیں اور نہ اس کے آنے سے پہلے موجود تھا۔

اینڈرسن کو اپنی بات کی واقعیت پر قدرے اطمینان تھا لیکن وہ اب بھی سراسیمہ تھا۔ اس نے سوچا بہتر یہی ہے کہ ہوٹل کے مالک کو رات گئے اپنے کمرے میں آ کر سگار پینے کی دعوت دی جائے تاکہ اس امر کی تصدیق ہو جائے کہ وہ کسی دھوکے کا شکار تو نہیں ہوا۔ اس کے پاس انگلستان کے شہروں کی کچھ تصویریں تھیں جو کسی کو بلانے کے لیے اچھا خاصا بہانہ بن سکتی تھیں۔

ہر کرسٹنسن نے اس دعوت پر خوشی کا اظہار کیا اور اسے قبول کر لیا۔ رات کو تقریباً دس بجے اسے آنا تھا مگر اس سے پہلے اینڈرسن کچھ خط لکھنا چاہتا تھا اور وہ اس مقصد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اگرچہ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے تقریباً شرماتا تھا۔ لیکن اس حقیقت سے اسے انکار نہیں تھا کہ ۱۳ نمبر کی موجودگی کے سوال سے وہ کافی حد تک مضطرب تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے کمرے میں جانے لگا تو ۱۱ نمبر کی طرف سے گزرا تاکہ وہ نمبر ۱۳ کے دروازے یا اس دروازے کی جگہ کے آگے سے نہ گزرے۔ جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے جلدی سے اور مشتبہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا لیکن وہاں ایسی کوئی بات نظر نہ آئی جس سے اس کے اندیشے کی تصدیق ہوتی سوائے اس غیر متعین وہم کے کہ کمرہ معمول کی نسبت کچھ چھوٹا نظر آتا تھا۔ آج رات چرمی بیگ کی موجودگی یا گمشدگی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ اس نے خود اسے خالی کر کے اپنے بستر کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اس نے کوشش کر کے نمبر ۱۳ کے خیال کو ذہن سے نکال دیا اور خط لکھنے کے لیے بیٹھ گیا۔

اس کے پڑوس میں کئی افراد رہتے تھے۔ وقتاً فوقتاً گلیارے میں کوئی دروازہ کھلتا اور جوتوں کا جوڑا باہر پھینکا جاتا یا کوئی سفری ایجنٹ گنگناتا ہوا دروازے کے آگے سے گزرتا۔ باہر سے کبھی چھکڑے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

سڑک پر چلتی ہوئی گاڑی کی آواز بھی آجاتی تھی یا کسی کے تیز قدموں کی چاپ بھی سنائی دے جاتی تھی۔

اینڈرسن نے خطوط لکھنے کے بعد وہسکی اور سوڈا منگوانے کے لیے آرڈر دیا اور پھر کھڑکی کے پاس جاکر سامنے کی دیوار اور اس پر پڑنے والے سائے دیکھنے لگا۔

جہاں تک اسے یاد تھا نمبر ۱۳ میں ایک وکیل مقیم تھا جو کہ ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ وہ بہت کم باتیں کرتا تھا۔ اور لکھنے کی میز پر بھی عموماً کاغذوں کے پلندے کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے تنہائی میں اپنے حیوانی جذبوں کی تسکین دینے کی عادت تھی۔ مگر اسے ناچنے کی کیا پڑی تھی؟ سامنے دیوار پر ساتھ والے کمرے کے سائے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ناچ رہا ہے۔ بار بار اس کا دبلا جسم کھڑکی کے سامنے سے گزرتا تھا اس کے بازو لہراتے تھے اور ایک سوکھی سی ٹانگ بڑی پھرتی سے اوپر کی طرف حرکت کرتی تھی۔ وہ پیروں سے ننگا معلوم ہوتا تھا اور فرش ضرور مضبوط ہوگا۔ کیونکہ اس کی حرکات کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ سیکفورد ہر اینڈرز جنسن اپنے ہوٹل کے کمرے میں رات کو دس بجے ناچ رہا ہو تو ایک عمدہ طرز کی یادگار تصویر کے لیے مناسب مواد مل سکتا ہے۔

اینڈرسن کے خیالات ایملی کی نظم "یوڈولفو کے اسرار" کی مانند ہے

ہوٹل کا مالک اگر اس موقع پر دروازہ نہ کھٹکھٹاتا تو ممکن تھا کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک خاصی لمبی نظم آجاتی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے حیرت زدہ چہرے سے معلوم ہوا کہ اینڈرسن کی طرح اسے بھی کسی خلافِ معمول چیز سے تعجب ہوا ہے۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ اینڈرسن کی تصویروں میں اس نے کافی دلچسپی لی اور کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس وقت اگر وکیل گانا شروع کر دیتا تو کہا نہیں جاسکتا کہ گفتگو کا رخ کس طرح نمبر ۱۳ کی طرف مڑتا۔ اس کا گانا اس انداز کا تھا جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو اس نے بہت زیادہ پی رکھی ہے یا پھر وہ پاگل ہو گیا ہے۔ انہوں نے سنا کہ گانے کی آواز بڑی بلند اور تیکھی تھی بلکہ خشک سی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے پہلے کبھی وہ گایا نہ ہو۔ گانے کے الفاظ یا تان کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ آواز حیرت انگیز طور پر بلند ہوتی گئی اور پھر یاس آمیز نوحے کی طرح نیچی ہو گئی۔ جیسے سردیوں کے موسم میں خالی دودکش سے ہوا گزرتی ہے یا جیسے کسی ساز کی ہوا ایک دم ختم ہو جاتی ہے۔ یہ آواز واقعی بڑی وحشت ناک تھی اور اینڈرسن نے محسوس کیا کہ اگر وہ اکیلا ہوتا تو وہ بھاگ کر پڑوس کے کسی سفری ایجنٹ کے کمرے میں پناہ لیتا۔

ہوٹل کے مالک کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

"میری سمجھ میں تو نہیں آیا" آخر کار وہ اپنا ماتھا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "یہ آواز بڑی خوفناک ہے۔ میں نے اسے ایک دفعہ پہلے بھی سنا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ یہ کسی بلی کی آواز ہے"

"کیا وہ پاگل ہے؟" اینڈرسن نے دریافت کیا۔

"ضرور ہوگا۔ اور کتنی افسوسناک بات ہے ایسا اچھا گاہک اور اپنے کاروبار میں کامیاب۔ میں نے سنا ہے اچھے خاصے کنبے کا کفیل بھی ہے۔"

عین اس وقت دروازے پر زور دار دستک ہوئی اور پھر دستک دینے والا جواب ملے بغیر خود ہی اندر آگیا۔ یہ وکیل تھا جو پورے لباس میں نہیں تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔

"میں معافی چاہتا ہوں جناب" اس نے کہا۔ "لیکن میں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ مہربانی کر کے اب بس کر دیں......"

یہاں وہ رک گیا کیونکہ بظاہر دونوں میں سے کوئی بھی اس شور کا ذمہ دار نہ تھا اور وہ آواز کچھ توقف کے بعد پہلے کی نسبت زیادہ وحشیانہ طور پر بلند ہونے لگی تھی۔

"لیکن بخدا اس کا مطلب کیا ہے؟" وکیل نے ایک دم پوچھا۔ "یہ کون ہے؟ آواز کہاں سے آرہی ہے؟ کیا میرا دماغ جواب دے گیا ہے؟"

"حقیقت یہ ہے ہر جلنسن' کہ یہ آواز ساتھ والے یعنی آپ ہی کے کمرے سے آرہی ہے۔ کیا وہاں چمنی میں کوئی بلی تو نہیں گھسی ہوئی؟"

اینڈرسن کو یہی بات سب سے بہتر طور پر سوجھی تھی جو اس نے کہہ دی اور اس کے ساتھ ہی اس بات کی بے اثری کا احساس بھی تھا لیکن محض ساکت کھڑے رہتے اور اس دہشت ناک آواز کو سنتے رہنے سے کیا ہوتا تھا۔ ہوٹل کے مالک کا کشادہ چہرہ خوف سے پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا اور اس نے اپنی کرسی کے بازوؤں کو سختی سے پکڑ رکھا تھا۔

"ناممکن" وکیل نے کہا۔ "ناممکن وہاں کوئی چمنی ہی نہیں ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ شور یہاں ہو رہا ہوگا۔ آواز واقعی میرے ساتھ والے کمرے سے آرہی تھی۔"

"کیا آپ کے اور میرے دروازوں کے درمیان کوئی دروازہ نہیں ہے؟" اینڈرسن نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں جناب" ہر جنسن نے قدرے تیزی سے جواب دیا۔ "کم از کم آج صبح تو نہیں تھا۔"

"ہوں! اینڈرسن نے کہا۔ "آج رات بھی نہیں؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" وکیل نے کچھ پس و پیش کرتے ہوئے کہا۔

اچانک ساتھ والے کمرے سے گانے یا چیخنے کی آواز آنی بند ہو گئی اور پھر گانے والے کے ہنسنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ تینوں آدمی اس آواز کو سن کر کانپ اٹھے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

"اچھا" وکیل نے کہا۔ "تو آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔ ہر کرسٹنسن؟ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

"بخدا!" کرسٹنسن نے کہا۔ "میں کیا بتا سکتا ہوں! میں آپ حضرات سے زیادہ کچھ نہیں

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

جانتا۔ میری دعا ہے کہ میں ایسا شور پھر کبھی نہ سنوں۔"

"میری بھی یہی دعا ہے۔" ہر جنسن نے کہا اور پھر اس نے زیرِ لب کچھ کہا۔ اینڈرسن نے خیال کیا کہ وکیل نے کتاب زبور میں سے آخری الفاظ دہرائے تھے۔ لیکن اسے اس بات کا یقین نہیں تھا۔

"لیکن ہمیں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔" اینڈرسن نے کہا...... "میرا مطلب ہے ہم تینوں کو۔ ہم ساتھ والے کمرے میں جا کر تفتیش نہ کریں؟"

"لیکن وہ تو ہر جنسن کا کمرہ ہے۔" ہوٹل کے مالک نے گویا وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ خود اسی کمرے سے آئے ہیں۔"

"مجھے اس حد تک یقین نہیں ہے۔" جنسن نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں ضرور چل کر دیکھنا چاہیے۔"

موقع پر جو حفاظتی ہتھیار مل سکے، ان میں ایک چھڑی اور ایک چھاتا شامل تھا۔ ہم باہر گلیارے میں پہنچے۔ لیکن وہ لرزے بغیر نہ رہ سکے۔ باہر بالکل سکوت تھا۔ اور ساتھ والے دروازے کے نیچے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اینڈرسن اور جنسن وہاں پہنچے۔ موخر الذکر نے ہینڈل گھمایا اور ایک زوردار دھکا دیا۔ لیکن بے سود۔ دروازہ مقفل تھا۔

"ہر کولیس" جنسن نے کہا۔ "آپ ذرا جا کر اپنے ملازموں میں سے سب سے زیادہ مضبوط آدمی کو ساتھ لائیں۔ ہم اسے ضرور دیکھیں گے۔"

"یہ نمبر ۱۳ ہے، دیکھ لیجیے" موخر الذکر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ کا دروازہ وہ رہا اور میرا دروازہ ادھر ہے۔" جنسن نے کہا۔

"دن میں میرے کمرے کی تین کھڑکیاں ہوتی ہیں۔" اینڈرسن نے اپنی خوفزدہ ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔

"بخدا! اسی طرح میری ہیں!" وکیل نے اینڈرسن کی طرف مڑتے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ عین اس وقت دروازہ کھلا اور ایک بازو باہر آیا جس نے اس کے کندھے پر اپنا پنجہ مارا۔ یہ بازو کسی پھٹے پرانے اور زردی مائل کپڑے میں ملبوس تھا۔ اور بازو کا جو حصہ ننگا دکھائی دیتا تھا، اس پر لمبے اور سفید بال اگے ہوئے تھے۔

اینڈرسن نے کراہیت اور خوف سے چیختے ہوئے جنسن کو بروقت کھینچ کر اس کی دسترس سے بچا لیا اور پھر دروازہ جلدی سے بند ہو گیا اور ہنسنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

جنسن نے کچھ نہیں دیکھا تھا لیکن جب اینڈرسن نے جلدی سے اسے بتایا کہ وہ کس قدر خطرے میں گرفتار ہونے والا تھا تو اسے شدید اضطراب ہوا اور وہ کہنے لگا کہ انہیں اس جگہ سے بھاگ کر کسی کمرے میں جا کر دروازہ مقفل کر لینا چاہیے۔

تاہم ابھی وہ یہ منصوبہ بنا ہی رہے تھے کہ ہوٹل کا مالک دو تنومند آدمیوں کو لے کر وہاں آ پہنچا۔ سب سنجیدہ اور محتاط نظر آ رہے تھے۔ جنسن نے انہیں جھٹ ساری تفصیل سنائی جس سے ان کے حوصلوں پر گویا پانی پھر گیا۔

وہ آدمی جو لوہے کی موٹی سلاخیں لے کر آئے تھے، انہیں پھینک کر کہنے لگے کہ وہ شیطان کی کوٹھری میں گھسنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہوٹل کے مالک کی حالت بڑی عجیب تھی۔ وہ بے حد پریشان اور متذبذب تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ اب اگر خطرے کا مقابلہ نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ اس کا ہوٹل کبھی نہ چلے۔ مگر وہ خود اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔ خوش قسمتی سے اینڈرسن نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے بھاگتی ہوئی فوج پھر جم گئی۔

"کیا ڈنمارک کے لوگوں کی بہادری یہی ہے۔" اس نے کہا۔ "جس کے متعلق میں نے بہت کچھ سن رکھا ہے؟ اندر کوئی جرمن تو نہیں ہے، اور اگر ہو بھی، تو ہم ایک کے مقابلے میں پانچ ہیں۔"

دونوں ملازم اور جنسن یہ سنتے ہی مستعد ہو گئے اور انہوں نے دروازے پر بلہ بول دیا۔

"ٹھہرو!" اینڈرسن نے کہا۔ "یوں اپنے سر نہ توڑو۔ ایک شخص روشنی لے کر یہاں ٹھہرے اور دو آدمی دروازے کو توڑیں لیکن دروازہ کھلنے پر اندر نہ جائیں۔"

ان آدمیوں نے سر کو جنبش دی اور ان میں سے چھوٹا آگے بڑھا۔ اس نے لوہے کی سلاخ اٹھائی اور چوکھٹ کے اوپر ایک شدید ضرب لگائی جس کا نتیجہ ان کی توقع کے خلاف نکلا۔ لکڑی کے ٹوٹنے یا چٹخنے کی آواز کی بجائے صرف ایک بھدی سی آواز آئی جیسے ٹھوس دیوار پر ضرب لگی ہو۔ اس آدمی نے چلاتے ہوئے اپنا اوزار پھینک دیا اور اپنی کہنی کو ملنا شروع کر دیا۔ اس کی چیخ سن کر سب اس کی طرف حیرانی سے متوجہ ہوئے اور پھر اینڈرسن نے دروازے کی طرف دیکھا۔ لیکن دروازہ غائب ہو چکا تھا اور پلستر کی دیوار اس کے سامنے تھی جس پر شدید ضرب کی جگہ ایک نشان پڑ گیا تھا۔ نمبر ۱۳ کا وجود اب نہیں تھا۔

کچھ دیر تک وہ سب اسی جگہ اپنے سامنے سادہ دیوار پر نظریں جمائے ساکت کھڑے رہے۔ نیچے صحن میں کسی جلد باز مرغے کی اذان سنائی دی اور جب اینڈرسن نے آواز کے رخ پر دیکھا تو گلیارے کے سرے پر ایک کھڑکی میں سے مشرقی آسمان پر صبح کاذب کے آثار نظر آ رہے تھے۔

"شاید" ہوٹل کے مالک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "آپ حضرات آج رات کسی دوسرے کمرے میں سونا پسند کریں گے...... دو بستروں والے کسی کمرے میں؟"

جنسن اور اینڈرسن میں سے کسی نے بھی اس تجویز کو ناپسند نہ کیا۔ وہ اپنے تجربے کی بنا پر اکٹھے ایک کمرے میں قیام کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ جب وہ اپنے اپنے کمرے میں رات کے لیے ضروری چیزیں لانے کے لیے جانے لگے تو بہتر یہی سمجھا گیا کہ دونوں یکے بعد دیگرے دوسرے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کے ساتھ موم بتی لے کر چلیں۔ دونوں نے نمبر ۱۲ اور نمبر ۱۴ میں تین تین کھڑکیاں دیکھیں۔

اگلی صبح وہ سب کمرہ نمبر ۱۲ میں پھر اکٹھے ہوئے۔ یہ قدرتی بات تھی کہ ہوٹل کا مالک بیرونی امداد حاصل کرنے سے اجتناب کرنا چاہتا تھا تاہم یہ نہایت ضروری بات تھی کہ عمارت کے اس حصے سے جو اسرار وابستہ تھا اسے صاف کیا جائے۔ بالآخر دونوں ملازموں کو تہ خانوں کا کام کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ کمرے کا تمام ساز و سامان ہٹا دیا گیا اور بہت سے فرشی تختوں کے ناقابل تلافی نقصان کو برداشت کرتے ہوئے فرش کا وہ حصہ اکھاڑ گیا جو کمرہ نمبر ۱۴ کے قریب تر تھا۔

آپ قدرتی طور پر یہ خیال کریں گے کہ وہاں سے کوئی پنجر...... مثلاً میگ نکولاس فریکین کا ڈھانچہ...... برآمد ہوا ہوگا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ چھت کی کڑیوں کے درمیان سے ایک تانبے کا ڈبہ ضرور برآمد ہوا جس میں ایک چرمی دستاویز بڑی اچھی طرح لپیٹ کر رکھی ہوئی تھی۔ اس پر تقریباً بیس سطروں کی عبارت تھی۔ اینڈرسن اور جنسن دونوں اس دریافت سے بڑے جوش میں آئے جس سے غیر معمولی مظاہرے کا عقدہ حل ہونے کی توقع تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو قدیم عبارات کا ماہر ثابت کرنے کی کوشش کی۔

میرے پاس جو کتابوں کا ذخیرہ ہے اس میں ایک نجوم کی کتاب ہے جسے میں نے کبھی نہیں پڑھا۔ اس کے پہلے صفحے پر ایک چوبی بلاک سے چھپی ہوئی ایک تصویر ہے جس میں ہانس سیبالڈ بیہام نے چند داناؤں کو ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے دکھایا ہے۔ اس تفصیل کی روشنی میں ممکن ہے اہل علم اس کتاب کو پہچان لیں۔ مجھے بہر حال اس کا نام یاد نہیں ہے اور اتفاق سے وہ کتاب اس وقت قریب بھی نہیں ہے لیکن اس کے شروع کے سادہ اوراق پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ تقریباً دس سال کے دوران یعنی جب سے میرے پاس یہ کتاب رہی ہے، میں اس تحریر کی زبان تو کجا یہ تک معلوم نہیں کر سکا مذکورہ عبارت کدھر سے پڑھی جا سکتی ہے۔ کچھ اسی قسم کی صورتِ حال سے اینڈرسن اور جنسن کو سابقہ پڑا تھا۔ جب کہ انہوں نے تانبے کے ڈبے سے نکلنے والی دستاویز کی عبارت کو پڑھنے کی بے حد کوشش کی تھی۔

دو دن کی سوچ بچار کے بعد جنسن نے، جو نسبتاً زیادہ باہمت تھا، دل کڑا کر کے یہ تاویل پیش کی کہ دستاویز کی زبان یا تو لاطینی ہے یا پھر قدیم ڈینش۔

اینڈرسن نے اس ضمن میں کوئی قیاس آرائی کرنے کی جسارت نہ کی۔ بلکہ وہ شدت سے اس بات کا خواہاں تھا کہ یہ پراسرار ڈبہ اور دستاویز وائی بورگ کی تاریخی انجمن کے حوالے کر دیں تاکہ وہ انہیں اپنے عجائب خانے میں رکھ لیں۔

میں نے یہ ساری کہانی چند مہینوں کے بعد سنی تھی۔ جب کہ ہم اپسالا کی لائبریری سے نکل کر قریب کے درختوں تلے بیٹھے تھے جہاں ہم...... یا کم از کم میں...... اس معاہدے پر ہنسا تھا جس کی رو سے ڈینئل سالتھینئس نے (جو اپنی زندگی کے اواخر میں کونکسبرگ میں عبرانی زبان کا پروفیسر رہا)

اپنے ضمیر کو شیطان کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اینڈرسن کے لیے یہ واقعہ کوئی خوش ہونے کی بات نہ تھی۔

"بیوقوف جوان" اس کا روئے سخن سالتھینئس کی طرف تھا جو اس وقت محض انڈر گریجوایٹ تھا جب اس نے وہ حماقت کی۔ "اسے کیا پتا تھا کہ وہ کس سرزمین میں قدم رکھ رہا ہے۔"

اور جب میں نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ اینڈرسن جیسا معقول آدمی ایسی باتوں کو سچ سمجھتا ہے اور اپنی طرف سے کچھ تاویلیں پیش کیں تو وہ ناراضگی سے بڑبڑایا۔ اسی دن دوپہر کے بعد اس نے مجھے وہ کہانی سنائی جو آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ لیکن اس نے اس کہانی سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے اور میری کسی تاویل سے انکار کر دیا۔ اس نے تو گویا شیطان کا وجود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

تصویر کا انتقام

میری چھوٹی بہن لیٹی میرے ساتھ رہتی تھی۔ شادی سے قبل گھر کی دیکھ بھال وہی کیا کرتی تھی۔ میری شادی کے بعد وہ میری بیوی کی عزیز ترین سہیلی بن گئی۔ پھر میرے بچے ہوئے تو وہ لیٹی سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کرتے۔ ہر قسم کا آرام و سکون میسر ہونے کے باوجود لیٹی کے چہرے پر سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ اس سنجیدگی کے پس منظر میں ایک دردناک کہانی ہے جسے آپ محبت کی ناکامی کہہ سکتے ہیں یا ٹوٹے ہوئے دل کا المیہ۔ اسی غم نے اسے دنیا سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اب وہ حزن و ملال کا ایک حسین مجسمہ ہے۔

جارج میسن میری بیوی کا چچازاد بھائی تھا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ سمندر میں ملاحی کی زندگی بسر کرنے میں گذرا تھا۔ اس کی اور لیٹی کی ملاقات میری شادی کے موقع پر ہوئی اور دونوں ایک دوسرے میں دلچسپی لینے لگے۔ جارج کے والد کی زندگی بھی سمندر میں گذری تھی اور قطب شمالی اور جنوبی کی مہم پر جانے والے ملاحوں کی مہم کا بانی وہی تھا لیکن ناکام رہا۔ جارج نے اس ناکام مہم کو سر کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کا یہ شوق فطری تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹیم پائنیر (Pioneer) نامی جہاز پر قطب شمالی کی مہم پر روانہ ہونے والی تھی۔ جارج بھی اس میں شامل تھا۔

لیٹی کو جارج کے اس ارادے سے بالکل اتفاق نہیں تھا لیکن جارج نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ اتنی دور نہیں جائیں گے کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔ چنانچہ لیٹی دل پر پتھر رکھ کے خاموش ہو گئی لیکن وہ مطمئن نظر نہ آتی تھی وہ بالکل نہ چاہتی تھی کہ جارج اتنے طویل عرصے کے

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

لیے اس سے جدا ہو اور اس قدر پر خطر مہم پر جائے اس کے چہرے پر اداسی کے بادل چھا جایا کرتے تھے یہ اداسی اب اس کی زندگی کا جزبن گئی ہے۔

میرا چھوٹا بھائی ہیری ان دنوں مصوری کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ تمام مصوروں کی طرح اس کے ذہن میں بھی فنی نظریات پروان چڑھ رہے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ جارج کے چہرے میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک فن کار کی توجہ کا مرکز بن سکتی ہیں اور جن کو تخلیق کرتے میں ایک فن کار مسرت محسوس کر سکتا ہے چنانچہ اس نے شب و روز کی محنت کے بعد جارج کی ایک قد آدم تصویر بنائی۔ تصویر بہت جاذب نظر تھی۔ اور ہیری کی فنکارانہ صلاحیتوں کی عکاسی کرتی تھی تصویر کا پس منظر بہت گہرا اور تاریک تھا۔ اس کی وجہ سے جارج کا سرخ و سپید چہرہ تصویر میں بہت نمایاں ہو گیا تھا۔ جیسے وہ تاریکیوں میں سے اچانک سامنے نکل آیا ہو۔ تصویر میں جارج کا صرف ایک ہاتھ نظر آتا تھا جسے اس نے تلوار کے قبضے پر رکھا ہوا تھا۔ جارج اس تصویر کو دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ وہ تصویر لیٹی کو بہت پسند تھی۔ اس نے اس پر نفیس فریم چڑھوانے کے بعد کھانے کے کمرے میں آویزاں کروادی جہاں وہ ہماری نظروں کے سامنے رہتی۔

جارج کے رخصت ہونے کا وقت قریب آتا جارہا تھا۔ پائنیر روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھا اور ملاح صرف حکم کے منتظر تھے۔ جارج کی دوستی جہاز کے ڈاکٹر ونسٹ گریو سے ہو گئی۔

ایک روز جارج نے مجھ سے اپنے اس نئے دوست کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "بے چارہ بالکل تنہا ہے میرے علاوہ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔"

اور ایک روز جارج ڈاکٹر گریو کو میرے گھر لے آیا۔ اس کے بعد بھی وہ ایک دو بار کھانے پہ ہمارے گھر آیا۔ سچ پوچھئے تو میں اس سے مل کر ذرا بھی خوش نہیں ہوا بلکہ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ڈاکٹر گریو کو اپنے گھر آنے کی اجازت دی۔ وہ دراز قد اور زرد رو نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی روشنی جھلکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیوانیت کی چمک تھی۔ بہر حال یہ شخص مجھے بالکل پسند نہ آیا۔

سب سے زیادہ ناگوار بات یہ تھی کہ وہ ضرورت سے زیادہ لیٹی کی سمت متوجہ نظر آتا تھا۔ اس کا اس حد تک لیٹی میں دلچسپی لینا مجھے قطعاً پسند نہ تھا۔ وہ ہر وقت لیٹی کے پیچھے لگا رہتا اور بالکل عاشقانہ انداز میں اس سے گفتگو کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ خود جارج کو بھی اس کی یہ حرکت پسند نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی وہ دوستی کے خیال سے خاموش رہتا تھا۔ لیٹی کو بھی اس کا یہ رومانی انداز اچھا نہ لگتا تھا۔

لیکن ڈاکٹر کو ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ بے حد خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ میں نے ایک عجیب بات محسوس کی، جارج کی قد آدم تصویر کو دیکھ کر وہ مضطرب ہو جایا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب اس نے پہلی مرتبہ تصویر کو دیکھا تو اس کے چہرے پر اضطراب کا نمایاں تاثر آگیا

تھا۔ پھر میں نے خاص طور پر دیکھا جیسے وہ تصویر سے نظریں چرا رہا ہو۔ اس پر اضطرابی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور جب ڈنر کا وقت آیا تو اتفاق سے اسے تصویر کے بالکل مقابل جگہ ملی۔ وہ ذرا سا ہچکچایا لیکن کرسی پر بیٹھ گیا مگر بیٹھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ...... یہ تصویر بہت عجیب ہے!"...... اس نے کہا۔

"معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ میں اس تصویر کے سامنے بیٹھ نہیں سکتا۔"

"تصویر میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ مسٹر گریو۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں آپ کیا محسوس کر رہے ہیں۔"

"مجھے مصوری سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ تصویر کچھ اس طرح گھورتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ میں اس کی نظروں کی تاب نہیں لا سکتا۔ مصوری کے متعلق یہ احساس مجھے وراثت میں ملا ہے۔ میری ماں نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی اور جب میں پیدا ہوا تو سنا ہے کہ ماں کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی جب اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی اور جنونی کیفیت میں افاقہ ہوا تو اس نے سب سے پہلی بات یہ کہی کہ سامنے لٹکی ہوئی میرے نانا کی تصویر کمرے سے ہٹادی جائے۔ کیونکہ وہ ہر لحہ اسے ڈراؤنے انداز میں گھورتی رہتی تھی۔ یہ بات آپ کو کچھ عجیب سی معلوم ہو گی اور آپ اسے واہمہ قرار دیں گے۔ لیکن میں نے فطری طور پر وہی طبیعت پائی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں اس تصویر کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں"...... وہ اپنا صحیح نفسیاتی تجزیہ کر رہا تھا جو میرے لیے قابل فہم تھا۔

ہم نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر ہمارے ہاں آئے لیکن ایک روز وہ بن بلائے آگیا۔ اس روز کے بعد وہ ہر روز کسی نہ کسی وقت آنکلتا اب وہ جارج سے بھی زیادہ میرے گھر آنے لگا تھا۔ کیونکہ جارج کو اپنے فرائض کی انجام دہی سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد آزاد ہو جاتا تھا۔ لیٹی اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے سے اس سے ضرور ملاقات کر لیتا۔ عام طور پر وہ جارج کی طرف سے کوئی نہ کوئی فرضی پیغام لے کر آتا تھا۔ اسی طرح اس کی رسائی لیٹی تک آسان ہو جاتی تھی۔

جارج کے جہاز کی روانگی سے ایک روز قبل لیٹی بہت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئی اور مجھے بتایا کہ ڈاکٹر گریو نے اس سے اظہار محبت کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اس کی منگنی کے متعلق جانتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی محبت کی راہ میں کوئی چیز حائل نہ ہو گی۔ لیٹی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے بہت سختی سے ڈاکٹر کو ڈانٹ دیا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے ڈھٹائی سے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ مایوسی کے سوا کچھ نہ دو گی۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اظہار محبت میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ کیونکہ مستقبل میں بہت سے ایسے واقعات پیش آسکتے ہیں جن سے تمہارا اور جارج کا رشتہ منقطع ہو سکتا ہے۔ اور اس وقت مجھے امید ہے کہ تم اس شخص کو فراموش نہیں کرو گی جس نے

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اپنے دل میں تمہاری محبت کی شمع روشن کر لی ہے۔

میں غصے کے عالم میں اس ذلیل شخص سے باز پرس کے لیے اٹھا۔ لیکن لیٹی نے بتایا کہ وہ جا چکا ہے اور میں نے صاف صاف اسے منع کر دیا ہے کہ اب وہ کبھی ہمارے گھر میں قدم نہ رکھے۔ دراصل وہ معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر جارج کو اس کا علم ہوا تو بات بڑھ جائے گی اور معلوم نہیں کیا ہو جائے۔

جہاز کی روانگی کے دن ڈاکٹر گریو ہمارے گھر نہ آیا۔ جارج شام ہی سے ہمارے گھر آ گیا تھا اور صبح تک ہمارے ہاں ہی رہا۔ صبح ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس کو الوداع کہنے کے بعد جب میں گھر آیا تو بے چاری لیٹی ایک صوفے پر پڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔ کمرے میں دھندلکا سا چھایا ہوا تھا۔ میری نظر نادانستہ طور پر سامنے لگی ہوئی جارج کی تصویر پر جا پڑی اور مجھے اس کا چہرہ عجیب مایوسانہ انداز میں لیٹی کو گھورتے ہوئے محسوس ہوا۔ کسی نامعلوم جذبے کے تحت میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور تصویر کو دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ تصویر پر نمی سی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ لیٹی کے آنسوؤں کی نمی ہو گی میں اس کی محبت کی دیوانگی کو خوب جانتا تھا۔

تھوڑے دنوں بعد ایک روز میں ہیری سے بات کر رہا تھا کہ لیٹی کس حد تک جارج سے محبت کرتی ہے۔ اس ضمن میں میں نے اس واقعے کا بھی ذکر کیا۔ لیٹی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ جارج کی تصویر کے قریب بھی نہیں گئی اور نہ اس کا آنسو تصویر پر گرا ہے۔

”دھندلکے کی وجہ سے رنگ کی چمک کو تم نے نمی سمجھ لیا ہو گا۔“ ہیری نے کہا اور بات ٹال دی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ بات ہرگز نہ تھی۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ اتنا واضح اور نمایاں تھا کہ کسی غلطی کا امکان بھی نہ تھا۔

”پائنیر“ جہاز اپنے مسافروں کو لے کر قطب شمالی کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد لیٹی کو جارج کے دو خط ملے۔ دوسرے خط میں جارج نے لکھا تھا کہ ”اب وہ شاید ہی کوئی خط لکھ سکے۔ کیونکہ وہ قطب شمالی کے اس ویران علاقے میں داخل ہو چکے ہیں جہاں رسد و رسائل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور جس جگہ اب تک سیاحوں اور مہم جوؤں کے قدم نہیں پہنچے۔“ وہ سب اس خطرناک مہم پر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک نئی منزل کی جستجو ان کو مسلسل آگے بڑھنے پر اکسا رہی تھی۔ وہ سب خوش و خرم تھے اور ڈاکٹر گریو بھی آزادی کے ساتھ ان کی دلچسپیوں میں شریک تھا کیونکہ جہاز کی روانگی کے بعد سے اب تک صرف ایک شخص بیمار ہوا تھا۔

اس کے بعد ایک طویل خاموشی طاری رہی اور پورا سال گزر گیا۔ بے چاری لیٹی کے لیے ہر لمحہ صبر آزما تھا۔ ایک مرتبہ اخبار کے ذریعے اس مہم کی خبر معلوم ہوئی۔ وہ بدستور کامیابی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے اور اب اس بحری علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ جہاں ہر سمت برف ہی برف تھی آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے جہاز کو لنگر انداز کر دیا۔

ایک اداس شام کو ہم کھانے کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ لیٹی ایک صوفے کی پشت سے سر ٹکائے کسی سوچ میں غرق تھی میں اس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ہیری کھڑکی کے پاس کھڑا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ میں میز کے پاس بیٹھا لیمپ کی روشنی میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک کمرے میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ہوا کا ایک یخ جھونکا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے بالکل ساکت و جامد تھے لیکن موت کی سی سرد لہر کمرے میں پھیل گئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے میں اور لیٹی دونوں ایک ساتھ کپکپا اٹھے۔ اس نے میری سمت دیکھا ”کیسی سخت سردی ہو گئی تھی۔ میں تو کانپ اٹھی تھی۔“ اس نے کہا۔

”ہاں سرد ہوا کی لہر سی آ گئی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جیسے یہ جھونکا سیدھا جارج کے پاس سے آیا ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ بے چارہ تو برفانی ہواؤں میں گھرا ہوا ہو گا۔“

اس لمحہ میری نظر نادانستہ طور پر جارج کی تصویر کی جانب اٹھ گئی اور پھر جو کچھ میں نے دیکھا اس نے مجھے دم بخود کر دیا اور خوف سے ایک بار پھر میرا دل کانپ اٹھا۔ کمرے میں ایک لیمپ روشن تھا۔ لیکن اس کی روشنی سے پورا کمرہ روشن نہیں تھا۔ میری نظر جارج کی تصویر پر پڑی اور میں نے ایک عجیب بھیانک منظر دیکھا۔ تصویر میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ہوئی میں نے بالکل نمایاں طور پر اس تبدیلی کو دیکھا۔ اتنا نمایاں اور واضح کہ کسی غلطی یا واہمے کا قطعاً امکان نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ تصویر میں جارج کے سر کی جگہ اچانک ایک کھوپڑی نے لے لی ہے۔ ہڈیوں کی خالی اور بھیانک کھوپڑی کو میں نے غور سے دیکھا۔ لیکن یہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ میں صاف طور پر اس کی آنکھوں کی جگہ دو سوراخ دیکھ رہا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے دانت خوفناک طور پر چمک رہے تھے۔ وہ صاف طور پر بلکہ گوشت پوست کی ایک کھوپڑی تھی۔ گالوں کی جگہ صرف چند ہڈیاں تھیں...... موت کا چہرہ تھا...... بھیانک موت کا......!

میں حیرت زدہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تصویر کی سمت بڑھا لیکن جوں ہی میں قریب پہنچا۔ شدید سرد ہوا کی ایک لہر پھر محسوس ہوئی میں کانپ گیا۔ جب میں تصویر کے عین مقابل پہنچا تو وہ کھوپڑی غائب ہو چکی تھی اور جارج کا چہرہ حسب معمول موجود تھا۔

”آہ...... جارج......“ میں نے اسی عالم میں کہا۔

لیٹی چونک پڑی۔ میرے لہجے نے اسے ڈرا دیا ”کیا، کیا مطلب ہے؟ کیا تم نے کچھ سنا؟ اوہ! رابرٹ خدا کے لیے مجھے سچ سچ بتاؤ“ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گئی اور میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔

”نہیں میری عزیز بہن نہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ ویسے ہی جارج کی تنہائی اور مصیبت کا خیال آ گیا تھا۔ سردی کی اس لہر نے مجھے اس کی یاد دلا دی۔“

”سردی......؟“ ہیری نے مڑتے ہوئے چونک کر پوچھا۔

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو...... اس جیسی گرم شام میں سردی؟ تمہیں وہم تو نہیں ہو گیا؟"

"میں نے اور لیتی نے ایک یا دو منٹ قبل سردی کی ایک تیز لہر محسوس کی تھی، کیا تم کو احساس نہیں ہوا......؟"

"بالکل نہیں، حالانکہ میں کھڑکی کے پاس کھڑا تھا" ہیری نے کہا۔ "اگر سردی کی کوئی لہر آتی بھی تو پہلے مجھے اس کا احساس ہونا چاہیے تھا۔"

بات عجیب تھی۔ بلاشبہ ذرا دیر پہلے کمرے میں ایک لحہ کی کپکپا دینے والی سردی کی شدید لہر دوڑ گئی تھی۔ حالانکہ ہوا بند تھی۔ مجھے یقین سا ہونے لگا جیسے وہ کوئی آسیبی لہر ہو اور قطب شمالی سے آئی ہو۔

"آج کون سی تاریخ ہے ہیری......؟" میں نے پوچھا۔

"آج...... آج ۲۳ فروری ہے...... لیکن کیوں؟"

جب لیتی کمرے سے نکل گئی تو میں نے ہیری کو بتایا کہ میں نے کیا محسوس کیا اور کس طرح وہ بھیانک کھوپڑی مجھے نظر آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ آج کی تاریخ اور دن نوٹ کر لے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ غریب جارج کو کوئی ہولناک حادثہ پیش آیا ہے۔

"تم کہتے ہو تو اپنی نوٹ بک میں لکھے لیتا ہوں رابرٹ سچ پوچھو تو تم اور لیتی مجھے واہمے کے مریض نظر آتے ہو۔ تم دونوں کا ہاضمہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا، اسی لیے تم دونوں کو سردی محسوس ہوئی ہوگی اور وہ کھوپڑی محض تمہارا واہمہ ہے اور کچھ نہیں۔"

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور بات کو ٹال دیا۔ لیکن ہم دونوں نے اپنی اپنی نوٹ بک میں وہ تاریخ درج کر لی۔ لیتی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری بیوی آ گئی۔ "تم لوگ کھڑکیاں کھول کر مت بیٹھا کرو۔" میری بیوی نے کہا۔ "اس میں شک نہیں کہ آج کل موسم گرم ہے مگر بعض اوقات ہوا کے سرد جھونکے آ جاتے ہیں۔ لیتی کو شاید سردی لگ گئی ہے۔ وہ سردی سے کانپ رہی ہے۔"

میں نے اسے کچھ بھی نہ بتایا، مگر رات کو جب ہم اپنے کمرے میں اپنے بستروں پر دراز ہو گئے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اپنی بیوی کو بتا دیا کہ میں نے کیا دیکھا تھا اور یہ کہ مجھے کس بات کا خدشہ ہے، وہ اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ بعد میں مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا کہ کیوں اسے یہ باتیں بتائیں۔

دوسری صبح لیتی کی طبیعت ٹھیک ہو چکی تھی۔ میں نے اور میری بیوی نے گذشتہ شب کے واقعات کا اس کے سامنے بالکل تذکرہ نہیں کیا۔ چند روز بعد وہ واقعہ ذہن سے تقریباً اتر گیا۔ البتہ اس دن سے میں کسی بری خبر سننے کا منتظر تھا۔ میرے خدشات درست نکلے، وہ منحوس خبر آ ہی گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی اور ہیری اندر داخل ہوا۔ اتنی صبح ہیری کبھی نہیں آتا تھا۔ اس لیے مجھے

تعجب ہوا اس کا چہرہ زرد اور وہ گھبرایا ہوا سا تھا۔

"لیتی کہاں ہے؟" اس نے پوچھا اور اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا۔ اس نے پھر پوچھا۔ "آج کل تم کون سا اخبار پڑھتے ہو؟"

"ڈیلی نیوز...... لیکن کیوں؟" میں نے اس کے بدحواس چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا

"شکر ہے خدا کا...... لو پڑھو!"

اس نے جیب سے ایک مڑا تڑا اخبار نکالا اور میری سمت بڑھا کر سرورق کی ایک خبر کی طرف اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ کیا خبر ہوگی۔ جوں ہی اس نے لیتی کا نام لیا تھا میں سب سمجھ گیا تھا۔

خبر تھی...... "قطب شمالی کی مہم پر جانے والے جہاز "پائنیر" کے ایک افسر کو ہولناک حادثہ!

تفصیل میں لکھا تھا...... "مہم پر جانے والا جہاز برفانی بحری علاقے میں گھرا ہوا ہے اور فی الحال اس کے آگے جانے کی کوئی امید نہیں۔ اشیاء خوردنی اور ضروریات کی چیزوں کی کمی کے باعث جہاز عنقریب واپس ہونے والا ہے اور مہم ملتوی کر دی گئی ہے۔ اسی اثناء میں بدقسمتی سے ایک ہولناک حادثہ پیش آ گیا۔ جہاز کا ایک نوعمر اور ہر دلعزیز افسر جارج میسن برف پر شکار کھیلتے ہوئے موت کی نذر ہو گیا۔ وہ جہاز کے ڈاکٹر کے ہمراہ سفید ریچھ کا شکار کھیلنے نکلا تھا۔"

"شکر ہے کہ ڈیلی نیوز میں یہ خبر نہیں چھپی۔" ہیری نے کہا۔

"لیکن پھر بھی تم بہت محتاط رہو۔ یہ خبر لیتی تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ وہ اچانک جارج کی موت کے صدمے کی تاب نہ لا سکے گی حالانکہ اس بے چاری کو ایک نہ ایک دن یہ المناک خبر ضرور سننا ہے۔ لیکن اس کے لیے اسے رفتہ رفتہ تیار کرنے کی ضرورت ہے۔"

ہم دونوں نے پرنم آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"لیکن اسے یہ اندوہناک خبر بہرحال سنانا ہی ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

میں نے اپنی بیوی کو بلایا اور اسے بھی اس المناک خبر سے مطلع کیا۔ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہنے لگی۔ "لیکن میں کس طرح لیتی کو یہ منحوس خبر سناؤں؟ آہ مجھ میں اتنی ہمت......"

"ہش......!" ہیری نے جلدی سے اس کا بازو دباتے ہوئے دروازے کی سمت اشارہ کیا...... میں نے گھوم کر دیکھا۔ لیتی سامنے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید تھا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کرب و غم کا اتھاہ سمندر موجزن تھا۔ وہ دم بخود کھڑی ہمیں گھور رہی تھی۔ نہ معلوم کب سے وہ ہماری بے خبری میں وہاں کھڑی تھی۔ ہم ایک دم ساکت ہو گئے۔ وہ سب کچھ سن چکی تھی اور جب ہم اس کی سمت بڑھے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہم سب کو ایک طرف کر دیا اور خاموشی کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے زینے طے کرتی اوپر چلی گئی۔ میری بیوی اس کے پیچھے بھاگی اور جب وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو لیتی فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔

ڈاکٹر کو فوری طور پر بلایا گیا۔ وہ ہوش میں آ گئی۔ لیکن غم نے اسے تھوڑی ہی دیر میں بے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

حد کمزور کر دیا تھا۔ اس کا علاج ہم میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔ جارج اس کو زندگی کی راہوں پر تنہا بھٹکنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ جارج کی موت نے اس سے زندگی کا ہر احساس چھین لیا تھا۔ وہ زندہ تھی لیکن اس کی روح مر چکی تھی۔ اس کی مسرتوں کا چمن خاکستر ہو چکا تھا۔ اس کی مسکراہٹ چھن چکی تھی۔ تقریباً ایک ماہ بعد وہ اس قابل ہو سکی کہ نیچے والی منزل تک آ سکے۔ انہی دنوں میں ایک اخبار میں جہاز پامبر کی واپسی کی خبر پڑھی۔ لیکن اب یہ خبر ہمارے لیے کسی مسرت کا باعث نہ تھی اس لیے میں نے گھر پر کسی سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یوں بھی لیلی اس خبر سے غم زدہ ہونے کے علاوہ اور کیا کرتی اور میں اس کے دکھتے ہوئے دل کے زخموں کو تازہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

ایک روز میں کمرے میں بیٹھا خط لکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی مجھے کسی نے پکارا۔ آواز کچھ مانوس سی معلوم ہوتی تھی۔ اچانک میری نظریں جارج کی تصویر پر پڑیں تو میں سہم گیا۔ اف میرے خدا...... میں خواب دیکھ رہا تھا یا یہ حقیقت تھی، جیسا کہ میں شروع میں بتا چکا ہوں کہ تصویر میں جارج کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر رکھا ہوا تھا اور اب میں نے دیکھا کہ اس کی کلمہ کی انگلی میری جانب اٹھی ہوئی تھی جیسے خبردار کر رہی ہو۔ میں نے غور سے اسے دیکھا کہ یہ واہمہ تو نہیں؟ میں نے دیکھا کہ تصویر میں جارج کے چہرے پر تازہ اور سرخ خون کے دو قطرے چمک رہے تھے۔ میں اٹھ کر تصویر کی طرف بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی یہ منظر معدوم ہو جائے گا لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ اٹھی ہوئی انگلی ایک بڑی اور سفید مکھی میں تبدیل ہو گئی جو تصویر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سرخ قطرے خون کے نہیں تھے بلکہ خون کی طرح کسی رقیق مادے کے قطرے تھے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ قطرے کہاں سے آئے ہیں۔

مکھی بری طرح تڑپ رہی تھی' اس لیے میں نے اسے پکڑ لیا اور مینٹل پیس سے ایک گلاس اٹھا کر اس پر رکھ دیا۔ اتنے میں میرا ملازم ایک کارڈ لیے کمرے میں داخل ہوا میں نے کارڈ دیکھا اس پر لکھا تھا...... "ڈاکٹر ونسنٹ گریو"

"میں نے انہیں ہال میں بٹھا دیا ہے۔" ملازم نے کہا۔

ادھر خدا کا شکر ہے کہ لیلی گھر میں موجود نہیں ہے۔ میں نے سوچا اور پھر ملازم سے کہا۔ انہیں یہاں لے آؤ۔ مالکہ اور لیلی واپس آ جائیں تو ان سے کہنا کہ میں ایک صاحب کے کاروباری سلسلے میں مصروف ہوں اس لیے وہ اس کمرے میں نہ آئیں۔"

میں نے ڈاکٹر گریو کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے دروازے کے اندر چند قدم رکھے ہی تھے کہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ "اس تصویر کو ڈھانپ دیجیے، تب میں اندر آؤں گا۔" اس نے اپنی دحشت پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ جارج کی تصویر دیکھ کر مجھے اب روحانی تکلیف ہوتی ہے۔"

مگر میں اس کی وحشت کا راز سمجھ چکا تھا۔ میں نے میز سے میز پوش اٹھا کر تصویر پر ڈال دیا اور تب ڈاکٹر گریو اندر داخل ہوا۔ وہ بہت لاغر اور کمزور نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے تھے اور رخسار اندر کو دھنس گئے تھے۔ اس کے چہرے سے ایک عجیب قسم کی وحشت اور ہراس ٹپک رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ رہ رہ کر چونک پڑتا ہے اور ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے کسی شخص سے خوف زدہ ہو یا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی اچانک پیچھے سے حملہ کر دے گا۔ میں نے کبھی اسے پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا اور اب تو یہ ناپسندیدگی شدید نفرت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میں اس سے گفتگو کو بھی تیار نہ تھا۔ میں نے اس سے صاف، صاف کہہ دیا کہ مجھے اس کی آمد سے قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوئی اور یہ کہ اب آئندہ میرے گھر آنے کی زحمت گوارا نہ کرے۔ میں صرف اس قدر اجازت دے سکتا ہوں کہ وہ جارج کی موت کے متعلق تمام واقعات سنا دے لیکن اسے کسی حالت میں بھی اپنی بہن سے ملنے کی اجازت نہیں دوں گا۔

اس نے خاموشی سے میری باتوں کو سنا اور پھر ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ تھوڑی دیر تک وہ خلا میں گھورتا رہا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ ۲۳ فروری کا منحوس دن تھا۔ جارج اور وہ سفید ریچھ کے شکار پر گئے ہوئے تھے کہ دور ایک برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی پر انہیں ریچھ کا ایک جوڑا نظر آیا۔ وہ اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ اسی سمت میں ایک گہری کھائی تھی۔ برف کی وجہ سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اوپر پہنچ کر جارج ریچھ کا نشانہ لینے کے لیے ڈھلوان کی سمت اترنے لگا۔ میں نے چیخ کر اسے منع کیا اور اسے خبردار کیا کہ ڈھلوان پر اترنا خطرناک ہے وہ میری آواز پر چونک کر رکا اور واپس مڑنے لگا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ چکنی ڈھلوان سے لڑھک گیا۔ میں خوف سے چیخ مار کر اس کی سمت لپکا اور فوراً اپنا کوٹ اتار کر بندوق سے باندھ کر اس کی سمت بڑھایا لیکن اتنی دیر میں وہ بہت نیچے جا چکا تھا اور میری پہنچ سے باہر تھا۔ اس کے بچاؤ کی اس وقت اور کوئی صورت بھی نہ تھی جارج نے چلا کر مجھے الوداع کہی اور کہا کہ میں آپ اور لیلی تک اس کا آخری سلام پہنچا دوں۔

ڈاکٹر کی آواز لرز اٹھی اس نے کہا۔ "اور دوسرے لمحے سب کچھ ہی ختم ہو گیا۔ جارج تیزی سے گہرائیوں کی طرف پھسلتے ہوئے ایک بار پھر مجھے نظر آیا...... اور پھر موت کی اس گہری کھائی میں روپوش ہو گیا۔

ڈاکٹر کا چہرہ بھیانک طور پر زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں جیسے باہر کو ابل آئیں۔ وہ اچھل کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری پشت پر کسی کو اشارہ کیا اور پھر اچانک ایک خوف ناک چیخ مار کر وہ فرش پر گر پڑا جیسے کسی نے اسے گولی مار دی ہو۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا اس کے کھلے ہوئے منہ سے سفید جھاگ بہہ رہا تھا۔

میں نے جلدی سے پلٹ کر اپنی پشت کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ جارج کی تصویر سے کپڑا ہٹ کر نیچے گر پڑا تھا۔ اور جارج کی آنکھیں بے ہوش ڈاکٹر کو گھور رہی تھیں۔ میں نے ملازم

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ عین اسی وقت خوش قسمتی سے ہیری بھی آ گیا۔ میں نے مختصراً اسے سب واقعہ بتایا۔ ملازم کے آنے پر ہم تینوں نے مل کر بے ہوش ڈاکٹر کو صوفے پر لٹا دیا۔ اس کا جسم ذرا ذرا دیر کے وقفے کے بعد کانپ اٹھتا تھا جیسے اس پر خوف و ہراس کا شدید لرزہ طاری ہو۔

تھوڑی دیر بعد جب ہوش میں آیا تو اس نے بتایا کہ کچھ عرصے سے اس پر اس قسم کے دورے پڑتے ہیں اور اسی کے باعث اس کی صحت بے حد خراب ہو گئی ہے۔ اس نے بہت بے چینی کے ساتھ دریافت کیا کہ دوران بے ہوشی اس نے کوئی خاص بات یا حرکت تو نہیں کی تھی؟ اور جب میں نے یقین دلایا تو اس نے معافی مانگی کہ اس کے دورے کی وجہ سے ہم سب کو اس قدر زحمت برداشت کرنی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔ معاً اس کی نظر مینٹل پیس پر رکھے ہوئے گلاس پر پڑی جس میں میں نے جارج کی تصویر سے وہ سفید مکھی پکڑ کر ڈال دی تھی۔

"اوہ! تو میری آمد سے قبل بھی یا پئیر جہاز سے کوئی یہاں آ چکا ہے؟" اس نے اضطراب کے ساتھ کہا۔

"نہیں تو...... یہاں تم سے پہلے اور کوئی نہیں آیا......!" میں نے حیرت سے کہا۔

"تو پھر یہ مکھی کہاں سے آئی؟ یہ دنیا کے اس حصے میں کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔ صرف قطب شمالی کی آخری حدوں میں ایسی مکھیاں ہوتی ہیں...... یہ آپ کو کہاں سے ملی؟"

"یہ تو میں نے اس کمرے میں سے پکڑی تھی۔" میں نے دانستہ طور پر جارج کی تصویر کا ذکر نہ کیا۔

"تعجب ہے...... تو یہاں بھی خون کی بارش ہوئی ہو گی؟"

"کیا مطلب......؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ مکھیاں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔" اس نے کہا۔ "ان کے جسم سے خون کی طرح ایک رقیق مادہ رستا رہتا ہے۔ قطب شمالی کے بعض برفانی علاقوں میں اکثر دور دور تک ایسے سرخ قطرے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سفید سفید برف پر خون کی بارش ہوئی ہو۔ حالانکہ وہ اس مکھی کے پیٹ سے رستا ہوا مادہ ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے دیکھا تو گلاس کی تہہ میں بھی متعدد سرخ قطرے چمک رہے تھے۔ میں یوں ہی حالیہ واقعہ کے متعلق سوچتا ہوا سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا میں نے ڈاکٹر کو گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ سڑک پر آیا تو اچانک مجھے ایک بہت عجیب بات نظر آئی۔ میں نے جلدی سے ہیری کو پکارا۔ وہ فوراً ہی میرے پاس آ گیا۔

"کیا بات ہے رابرٹ؟"

"تم ایک مصور ہو مجھے بتاؤ کہ اس جاتے ہوئے شخص میں تمہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آ رہی ہے؟"

"نہیں کچھ نہیں"...... ہیری نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر فوراً ہی اس کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ "ہاں...... ہاں...... میرے خدا یہ کیا...... اس کی دو پرچھائیاں ہیں......!!"

اور پھر مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر کیوں چونک چونک کر ادھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا۔ بظاہر اس کے آس پاس کوئی نظر نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی اس کے برابر کسی اور کی پرچھائیں روشنی میں برابر دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ میں اور ہیری حیرت زدہ اسے دیکھتے رہے جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے ہیری کو تاکید کی کہ آج کے واقعہ کے متعلق کسی سے کوئی ذکر نہ کرے۔

اس واقعہ کے ہفتہ بھر بعد ایک روز جب میں ہیری کے سٹوڈیو میں سے گھر واپس پہنچا تو گھر کے سب افراد کو عجیب پریشانی کے عالم میں دیکھا۔ لیٹی نے میرے استفسار پر مجھے بتایا کہ وہ تنہا کھانے کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر گریو بلا دستک دیئے اندر داخل ہوا۔ لیٹی نے دیکھا کہ وہ جارج کی تصویر سے نظریں چرا رہا تھا اور اس لیے بجائے اس کے سامنے بیٹھنے کے وہ جارج کی تصویر کے نیچے رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ لیٹی نے اسے فوراً باہر نکل جانے کے لیے کہا لیکن اس نے کوئی توجہ کیے بغیر اظہارِ محبت شروع کر دیا۔ اتنے میں جارج کی تصویر دیوار پر سے اس زور سے ڈاکٹر کے سر پر گری کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ لیٹی نے ملازموں کی مدد سے اسے اوپر میرے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ جس نے زخم دیکھنے کے بعد بتایا کہ زخم گہرا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ ڈاکٹر گریو کو دماغی بخار کیوں کر ہو گیا ہے۔ جب لیٹی نے بتایا کہ وہ حال ہی میں قطب شمالی کی مہم سے واپس آیا ہے تو ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا کہ ممکن ہے وہاں کی صعوبتوں نے اس کے دماغ کو کمزور کر دیا ہو۔

میں نے فوری طور پر ڈاکٹر گریو کی تیمارداری کے لیے ایک نرس کو مقرر کر دیا۔ اسی رات کو نصف شب کا واقعہ ہے کہ ایک بھیانک چیخ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں بھاگا ہوا ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا۔ لیٹی مجھ سے پہلے پہنچ کر فرش پر بے ہوش پڑی ہوئی نرس کو اٹھا رہی تھی۔ ڈاکٹر مسہری پر پڑا گہری سانسیں لے رہا تھا۔ نرس نے ہوش میں آنے کے بعد بتایا کہ ڈاکٹر گریو اچانک جنون کے عالم میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ایسی خوفناک اور بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا کہ نرس جا کر لیٹی کو بلا لائی اور ان کی نظر ایک ساتھ مسہری پر پڑی۔ خوف زدہ نرس نے جب دیکھا کہ مسہری پر دوہری پرچھائیاں ہیں تو چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ لیکن لیٹی نے جنون میں بکتے ہوئے ڈاکٹر کے الفاظ سن لیے جو اعتراف جرم سے کم نہیں تھے۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھا ہوا مسلسل کسی کو گھور رہا تھا اور خوف و دہشت سے لرزتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تم جانتے ہو میں نے جان بوجھ کر جرم نہیں کیا تھا۔ مجھ پر اچانک دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں کسی صورت میں بھی لیٹی کی محبت کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا تھا...... آہ!! اس کا معصوم چہرہ، اس

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کے حسن اور اس کی محبت نے میرے دل پر ایک جنونی کیفیت طاری کر دی تھی ورنہ میں بھی تمہیں اس پہاڑی سے دھکا نہ دیتا۔ میں ہر قیمت پر لیلیٰ کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس وہ اب بھی مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اسے شاید معلوم ہے کہ میں نے تمہیں قتل کیا ہے۔"

یہ واقعہ لیلیٰ مجھے اپنے کمرے میں سنا رہی تھی کہ اچانک نرس جو ہوش میں آنے کے بعد دوبارہ ڈاکٹر کی دیکھ بھال کر رہی تھی بھاگی ہوئی آئی۔ "ڈاکٹر کریو کہیں چلا گیا ہے۔ وہ جنون کے عالم میں اٹھا اور بھاگ گیا ہم نے ڈاکٹر کو بہت تلاش کیا لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ البتہ دو دن بعد اس کی لاش دریا سے برآمد ہوئی۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

راکھشش

ماورئیت کے عمیق اور خاموش سینے میں ہزارہا ایسے راز پنہاں ہیں کہ ان تک خرد کی رسائی نہیں دنیا کی چھوٹی چھوٹی روایات جن کو ہم لوگ ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہیں بعض اوقات ایسے گل کھلاتی ہیں کہ دنیا مبہوت ہو جاتی ہے۔

میری آپ بیتی بھی قرون اولیٰ کے ایک راز کی حامل ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں ہم دو بھائی بہن تھے اور ہماری بیوہ خالہ' میرے والدین فوت ہو چکے تھے اس لئے خالہ نے میری پرورش کی تھی۔ میرا وطن جھنگ ہے ہیر کے مقبرے کے قریب موضع مرادیائی میں ہمارا مکان تھا اور ہماری حویلی گاؤں کے آخری سرے پر ایک ویرانے میں واقع تھی۔

یہ حویلی کسی پرانے زمانے کی بنی ہوئی قلعہ نما عمارت تھی جو اتنی وسیع تھی کہ اس میں ایک اچھا خاصہ گاؤں آباد ہو سکتا تھا اسے کسی زمانے میں ہمارے آبائے سلف نے گاؤں فتح کر کے حاصل کیا تھا اس کے ایک حصہ میں ہم لوگ رہتے تھے اور دوسرے میں مویشی اور ان کے رکھوالے وغیرہ باقی تمام خالی پڑی تھی۔

ہمارے احاطہ کے ایک کونے میں ببول کے درختوں سے گھرا اتھا' پنڈت دینا تھ رہتے تھے یہ میرے دادا کے وقت کے بڈھے کارندہ تھے۔ اور ساری زندگی خدمت کرتے رہے تھے۔

بھائی جان جو مجھ سے اٹھارہ سال بڑے تھے تنہائی پسند اور گوشہ نشین تھے حویلی کے بالا خانے پر شور و غل سے دور بالکل سنسان جگہ ان کا کمرہ تھا جہاں دو دن رات پڑے رہتے تھے۔ کسی سے ان کا میل جول نہ تھا ہمارا یہ مختصر سا کنبہ اس غیر آباد حویلی کے سکوت اور نحوست کو دور کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا ہر طرف شہر خموشاں کا نقشہ دکھائی دیتا تھا۔

ایک طویل عرصہ تک مرمت نہ ہونے سے حویلی کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی کئی جگہ

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

سے زینے اور منقلیاں بالکل شکستہ ہو چکی تھیں فصیلوں اور دمدموں پر جا بجا کائی جمی ہوئی تھی تمام چھتوں پر ایک خاردار بوٹی بکثرت پھیلی تھی ویران کمروں میں پلستر گرنے سے کوڑا کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے چھتوں میں جا بجا ابابیلوں کے گھونسلے اور بھڑوں کے چھتے نظر آتے تھے بڑے بڑے تناور درختوں نے اکثر کمروں کو بالکل تیرہ و تار بنا رکھا تھا صرف وہی چند کمرے اچھی حالت میں تھے جو ہم لوگوں کے زیر استعمال تھے۔

ہماری کوئی لمبی چوڑی برادری بھی نہ تھی کہ کبھی اس قید تنہائی سے نجات ملتی صرف میرے ایک چچا تھے جو ہمارے گاؤں سے آٹھ میل کے فاصلہ پر اپنی جاگیر میں رہتے تھے ان کی بیوی بھی فوت ہو چکی تھی صرف ارشد اور عزیز دو لڑکے تھے جو تعلیم حاصل کرنے بیرون ملک گئے ہوئے تھے ان کے بڑے لڑکے ارشد سے میں منسوب تھی۔

میں آٹھ سال کی بچی تھی۔ اس ویرانے میں جہاں در و دیوار سے حسرت اور اداسی برستی تھی میری طبیعت بہت گھبرا لیا کرتی تھی اگر پنڈت جی کا مکان قریب نہ ہوتا تو یقیناً ایسے ماحول میں میری زندگی دشوار ہو جاتی۔

پنڈت جی کا کنبہ بھی بالکل مختصر تھا ایک تو خود پنڈت جی تھے دوسری ان کی دائم المریض بیوی اور ایک لڑکی کملا جو مجھ سے پانچ سال بڑی تھی مجھے کملا سے بڑی محبت تھی اور میں اکثر اس کے گھر کھیلنے جایا کرتی تھی۔

دوپہر کے وقت جب کملا کی ماں آرام کرتی اور پنڈت باہر کام پر ہوتے تو میں اور کملا مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتیں' یا پنڈت جی کے ٹھاکر دوارے میں جہاں کئی مورتیاں رکھی تھیں' ایک بڑے قد آور بت کو پگڑی باندھ کر اپنا دولہا بناتیں اور اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر وہ گیت گایا کرتیں جو قلندر قوم کے فقیر ہمارے علاقہ میں گا کر بھیک مانگا کرتے تھے۔

بالاخانے کی سیڑھیوں کے قریب ایک بڑا بھاری اور فراخ کنواں تھا ہم دونوں عموماً اس کنوئیں پر جاتیں' اور اس میں اونچی آواز سے پکارتیں جس کے جواب میں ہمیں اسی طرح کی آواز سنائی دیتی' اور ہم بہت خوش ہوتیں بھائی جان ہمیں اس کنوئیں پر جانے سے منع کیا کرتے اور ڈرایا کرتے کہ اس کنوئیں میں بھوت رہتے ہیں۔

خالہ جان بھی مجھے اس کنوئیں پر جانے سے روکا کرتیں وہ کہا کرتی تھیں کہ یہاں پہلے ایک چبوترہ تھا بھائی جان کو کسی ذریعے سے اس جگہ کنوئیں کی موجودگی کا علم ہو گیا۔ میں اس وقت چھوٹی تھی چنانچہ انہوں نے اس کنوئیں کو جو کئی صدیوں سے بند پڑا تھا کھول کر از سر نو مرمت کروایا۔ اسی سال میری ماں اس کنوئیں پر کسی بھوت سے ڈر کر بیمار ہوئیں اور دوسرے دن جاں بحق تسلیم ہو گئیں اگرچہ ہم یہ سب باتیں غور سے سن لیا کرتی تھیں مگر وہاں جانے سے باز نہ آتیں کیونکہ ہمیں اس کنوئیں سے کچھ انس سا ہو گیا تھا۔

چند سال تک میں اسی طرح بے سر و سامانی سے کھنڈروں کی دنیا ہی میں پرورش پاتی رہی۔ آخر زمانے کے انقلاب نے مجھے کچھ سے کچھ بنا دیا یعنی میں نے بچپن کی منزل طے کر کے شباب کے زینے پر قدم رکھا کملا مجھ سے پانچ سال بڑی تھی اس وقت وہ عین شباب میں تھی اور حسن کا ایک نایاب پھول معلوم ہوتی تھی اس کا صندلی رنگ نشیلی انکھڑیاں اور پیوستہ ابرو اس کی شان حسن کو دوبالا کر رہے تھے اس کی خوبصورتی دلوں کو تڑپا دینے والی تھی اور حسن بے حد جاذبیت رکھتا تھا۔

پنڈت جی پرانے خیال کے آدمی تھے جوں جوں اس چنبیلی کی کلی کو چٹکتے دیکھتے ان پر خواب و خور حرام ہوتا جاتا تھا جوان لڑکیوں کو گھر بٹھانا ان کے نزدیک مہاپاپ تھا اس لئے انہوں نے بہت جلد کملا کی شادی کا بندوبست کر لیا اور تاریخ مقرر ہو گئی۔

شادی سے ایک دن پیشتر کملا اور اس کے والدین حسب معمول سو رہے تھے آدھی رات کے قریب کسی نے کملا کا شانہ ہلایا کمرے میں مکمل تاریکی تھی طاقچہ پر رکھی ہوئی لالٹین بجھ چکی تھی کملا اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس کر کے خوف سے گھبرا گئی۔

یکایک کسی ہاتھ نے جو برف کی طرح سرد اور لوہے کی طرح سخت تھا ایک پرچہ اس کے ہاتھ میں دے دیا کملا لرز اٹھی اس نے گلوگیر آواز سے پنڈت جی کو پکارا دونوں میاں بیوی جاگ اٹھے پنڈت جی نے تاریکی میں ٹٹولتے ہوئے دیا سلائی تلاش کر کے بتی جلائی تو لرزہ بر اندام کملا نے ان سے یہ واقعہ بیان کر کے پرچہ ان کے ہاتھ میں دیدیا۔

یہ پرچہ پنڈت جی کے رجسٹر سے پھاڑ لیا گیا تھا اور کوئلہ سے اس پر چند سطریں کسی مردہ زبان میں جو سنسکرت سے ملتی جلتی تھی لکھی گئی تھیں۔

کملا سخت خوفزدہ تھی' مگر اس کے والدین کا خیال تھا کہ کملا نے خواب کی حالت میں کوئی کاغذ اٹھا لیا ہے۔

رات کو کملا کی بارات تھی بڑے ٹھاٹھ سے برات کے استقبال کا سامان ہو رہا تھا آج سہ پہر کو ہماری حویلی میں خوب رونق تھی' ہمارے مردانہ کمرے دلہن کی طرح سجے ہوئے تھے باہر چھڑکاؤ سے سوندھی مٹی کی خوشبو آ رہی تھی کمرے میں بارات کے لئے پھولوں کے طشت بھرے پڑے تھے جن سے عطر بیز لپٹیں آ رہی تھیں کھانوں سے زعفران اور کیوڑے کی مہک اٹھ رہی تھی گاؤں کی نوخیز لڑکیاں رنگین لباس پہنے گا رہی تھیں۔

میں آج بہت خوش تھی کیونکہ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ میں نے چہل پہل دیکھی تھی شام کے

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

قریب بارات آئی اور رات گئے تک بارات کی خاطر تواضع ہوتی رہی میں بھی رات کو دیر سے سوئی مجھے کملا کی جدائی کا روح فرسا خیال ماہی بے آب کی طرح تڑپا رہا تھا۔

ابھی میری آنکھ جھپکی ہی تھی کہ میں شور و غل کی آواز سے جاگ اٹھی رات بھیگی ہوئی تھی ستارے جھلملا رہے تھے گیس کی روشنی بدستور جگمگا رہی تھی مگر جو جگہ تھوڑی دیر پہلے عشرت کدہ تھی اب ماتم کدہ بن رہی تھی پنڈت صاحب کے مکان سے چیخوں کی دردناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں سب چھوٹے بڑے سراسیمگی سے احاطہ کی طرف بھاگ رہے تھے میں حیران تھی کہ کیا معاملہ ہے اتنے میں بھائی جان میرے پاس سے گذرے ان کے بال پریشان اور چہرہ اترا ہوا تھا وہ بدحواسی سے بھاگے جا رہے تھے دالان میں خالہ جان کھڑی تھیں مجھے دیکھتے ہی کہنے لگیں "زرینہ کملا کا شوہر قتل ہو گیا ہے اور اس کی ماں کوئی دم کی مہمان ہے خالہ جان کے یہ الفاظ سن کر میرے دل کو دھکا سا لگا اور میں دوڑتی ہوئی کملا کے گھر گئی اس کی ماں واقعی جاں بلب تھی اس کی نبضیں چھوٹی ہوئی تھیں ایک ڈاکٹر جو بارات کے ساتھ آئے ہوئے تھے اس کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے ان کا خیال تھا کہ یکایک ڈر جانے کا نتیجہ ہے۔

پنڈت جی پچھاڑیں کھا رہے تھے کملا بالکل خاموش اور سہمی ہوئی تھی وہ تو ملتانی مٹی کا مت معلوم ہو رہی تھی صبح سویرے ہی پنڈت جی کی بیوی چل بسیں۔

باہر لوگوں کا بڑا ہجوم تھا پولیس بیان لکھ رہی تھی دولہا کی لاش کا معائنہ کیا گیا ڈاکٹر کے قول کے مطابق قاتل نے لوہے کے دستانے پہن کر جرم کا ارتکاب کیا تھا کئی دن تک پولیس کی تحقیقات جاری رہی مگر باوجود انتہائی تفتیش کے قاتل کا سراغ نہ ملا۔

کملا کی بیوگی کو ایک سال گذر گیا اس کی شوخی اور شگفتگی کافور ہو چکی تھی وہ اپنا غم ظاہر نہ کرتی تھی تاہم کچھ سوچتی اور سرد آہیں بھرتی رہتی اس کا حسن ماند پڑ چکا تھا اور اس کا شباب جاڑے کی چاندنی کی طرح بیکار دکھائی دیتا تھا۔

میں بھی اب جوان ہو چکی تھی ارشد اور عزیز بھی امریکہ سے واپس آگئے تھے چچا اور چچی جان میری شادی کے لئے اصرار کرنے لگے خالہ جان کا خیال تھا کہ ہم دونوں بھائی بہن کی ایک ہی وقت میں شادی ہو مگر بھائی جان نے اپنی شادی سے تو صاف انکار کر دیا اور میری شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

شادی سے چار دن قبل میں اور کملا رات کو دیر تک جاگتی رہیں ہماری بوڑھی ماما ہمیں آدھی

رات تک کہانیاں سناتی رہی اسلئے میں لیٹتے ہی غافل سو گئی۔

آخر شب میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا کہ ایک دیو میرے پلنگ کے قریب کھڑا مجھے ایک پرچہ دے رہا تھا مجھ پر یک لخت دہشت طاری ہو گئی بے اختیار میری چیخ نکل گئی آنکھ کھلی تو میں پسینہ میں شرابور تھی ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی دیو وغیرہ دکھائی نہ دیا۔

یک دم میری نظر سرہانے کے قریب پڑے ہوئے ایک کاغذ کے پرچے پر پڑی میرے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کملا نے جو میری چیخ سن کر بیدار ہو گئی تھی مجھے سنبھالا۔

کچھ دیر بعد جب مجھے ہوش آیا تو پورا گھر جاگ رہا تھا میں نے حواس بجا ہونے پر پھر اس پرچہ کی طرف توجہ کی جو ابھی تک بدستور وہیں پڑا تھا وہ پرچہ اٹھا کر میں نے بھائی جان کو دے دیا اور خواب بھی من و عن کہہ سنایا انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔

وہ اس ناگہانی واقعہ سے متوحش نظر آتے تھے ان کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی یہ پرچہ بھی کسی پرانے رجسٹر سے پھٹا ہوا معلوم ہوتا تھا جس پر کسی غیر معروف زبان میں کوئلے سے چند سطریں لکھی تھیں بھائی جان پہلے تو سراسیمگی اور مایوسی کی حالت میں کھڑے سوچتے رہے اور پھر چپ چاپ باہر نکل گئے۔

صبح کو چچا جان بوکھلائے ہوئے میرے پاس آئے ان کے ہمراہ بھائی جان بھی تھے چچا جان نے میری زبانی سب واقعہ سنا اور دیر تک اس معاملہ پر بحث ہوتی رہی ان کا خیال تھا کہ یہ کسی دشمن کی کارستانی ہے اور شادی کو روکنے کے لئے اس تدبیر سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے مگر بھائی جان اپنی ہٹ پر قائم رہے اور شادی کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دی گئی۔

چند دن تک لوگوں میں یہ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں جب بات پرانی ہو گئی اور لوگ اس تذکرہ کو بھول گئے تو بالکل خفیہ طور پر میرا نکاح ارشد سے ہو گیا لیکن تقدیر کا لکھا ٹل نہ سکا اور دوسرے دن ارشد بستر پر مردہ پایا گیا اس کے گلے پر بھی کسی ایسے ہاتھ کے نشانات تھے جس پر کوئی لوہے کا دستانہ چڑھا ہوا ہو۔

ارشد کی جواں مرگی کا تمام علاقے میں شور مچ گیا ایسا سنگین جرم اور قاتل کا بچ نکلنا پولیس کی بدنامی کا باعث تھا چنانچہ بڑے بڑے افسر جائے وقوع کا معائنہ کرنے آئے اور قاتل کا سراغ لگانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا مگر نتیجہ خاک نہ نکلا اور کملا کے شوہر کی طرح ارشد کی موت بھی ایک معمہ بن کر رہ گئی۔

ارشد کی موت سے میری زندگی تلخ ہو گئی بھائی جان کا دل بھی دنیا سے اچاٹ ہو گیا پنڈت جی کو جو اپنی بیوی کی موت کے بعد بچھے بچھے بہال رہتے تھے ہمارے خاندان سے دلی محبت کی وجہ سے اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بھی جانبر نہ ہو سکے اور شمع کی طرح چند دن میں گھل گھل کر ختم ہو گئے۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

میں اور کملا زندگی کے فضول اور خاموش دن کاٹنے لگیں بھی بھی عزیز ہم دونوں سے ملنے آیا کرتا اس کے آنے سے دو گھڑی کے لئے ہمارے دل بہل جایا کرتے ورنہ پھر وہی تنہائی اور افسردگی گھیرے رکھتی ہم اس زندگی سے بہت بیزار تھیں ہماری زندگی ایک ناکام زندگی تھی جس کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نہ تھی ہمارا مستقبل ایسا تاریک تھا جس میں امید کی شعاع باقی نہ تھی ہمیں ایک ایسا روگ لگ چکا تھا جس کا علاج اس زندگی میں ناممکن تھا۔

ارشد کی موت کو تین سال گزر گئے بہار کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد بہار آتی رہی لیکن ہماری زندگی میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا۔

خزاں کا موسم تھا درختوں کے پتے جھڑ رہے تھے ہر چیز بے رونق اور بے نور ہو رہی تھی شام قریب تھی آفتاب آخری ہچکیاں لے رہا تھا اس کی زرد اور لرزاں شعاعیں کسی دم توڑتے ہوئے مریض کی طرح زندگی کی موہوم امید پر سنبھلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں کوے غول در غول اڑتے اور اپنی کھوکھلی آواز میں کائیں کائیں کرتے جنگل میں بسیرا کرنے جا رہے تھے مویشی اور ان کے چرواہے تھکے ماندے سست قدم اٹھاتے گھر واپس آ رہے تھے گاؤں کے ہر ایک گھر سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے ہر طرف اداسی اور افسردگی مسلط تھی۔

اتنے میں عزیز آ گیا اور ہم دونوں فصیل کی مہتابیوں پر ٹہل کر وقت گزارنے لگے جب آفتاب غروب ہو گیا اور ہوا میں خنکی پیدا ہونے لگی تو میں نیچے اترنے کے لئے مڑی مگر عزیز کہنے لگا۔

"اب تو بھائی جان کا کمرہ قریب ہے' چلو ان سے بھی مل لیں' آج ان کو دیکھے بہت دن ہو گئے ہیں"۔

چنانچہ ہم بالا خانہ پر چڑھ گئے' نزدیک پہنچے تو اندر سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

"بھائی جان تو کسی سے باتیں کر رہے ہیں"۔

"بھائی جان کے پاس بالا خانہ پر کون آ سکتا ہے' آؤ دیکھیں تو سہی" میں حیرت سے آگے بڑھنے لگی۔

"اس طرح اندر جانا مناسب نہیں چلو اس سامنے والی بغلی سہ دری میں چل کر جھروکے سے دیکھیں" عزیز نے کہا۔

ہم دونوں سہ دری میں گھس گئے یہ سہ دری بہت طویل اور تاریک تھی گو باہر بھی شام کافی

تاریک ہو چکی تھی مگر سہ دری میں بالکل اندھیرا تھا۔

کملا کھڑکی کی کانس پر بیٹھی تھی اس کا گلابی رنگ نیلا ہو رہا تھا اور ہونٹ بالکل سفید و خشک جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی بھائی جان اس کے قریب جھکے ہوئے کھڑے تھے ان کی پشت ہماری طرف تھی اور کملا کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کسی چیز کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

ابھی ہم لوگ وہاں بمشکل چند سیکنڈ ٹھہرے تھے کہ آسمان پر شہاب ثاقب ٹوٹا آہ! اس کی مہیب روشنی میں ہم نے سہ دری کے اندر ایک ایسا خطرناک سین دیکھا کہ ہمارے کلیجے دھک سے رہ گئے شدت خوف سے میرے حواس جاتے رہے اور مجھے غش آ گیا۔

جب مجھے ہوش آیا میں اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑی تھی اور عزیز سہما ہوا میرے قریب ایک کرسی پر بیٹھا تھا میں نے ہوش میں آتے ہی کہا۔

"عزیز خدا کے لئے جا کر بھائی جان کو بلا لاؤ ان کی زندگی خطرے میں ہے"

عزیز نے میرا آخری فقرہ نہ سنا اور جلدی سے باہر نکل گیا میں بھائی جان کو دیکھنے کے لئے بہت بیتاب تھی اس لئے بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

خدا خدا کر کے عزیز واپس آیا بھائی جان بھی اس کے ساتھ تھے "کیوں زرینہ کیا تکلیف ہے؟"۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔

"بھائی جان میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتی ہوں.................. کہ آپ کی زندگی سخت خطرے میں ہے آج جس وقت آپ کملا سے باتیں کر رہے تھے میں اور عزیز آپ سے ملنے کے لئے بالا خانے کی طرف گئے اندر سے باتوں کی آواز سن کر مجھے بہت تعجب ہوا اور ہم دونوں یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں سہ دری میں گھس گئے۔

یکایک شہاب ثاقب ٹوٹا اور اس کی سرخ روشنی میں میں نے دیکھا کہ ایک گراں ڈیل اور قوی ہیکل شخص جو زرہ بکتر پہنے تھا سہ دری کے آخری جھروکے کے قریب کھڑا آپ کی باتیں سن رہا تھا میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ مجھے غش آ گیا اگر عزیز ساتھ نہ ہوتا تو خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا"۔

"زرینہ کچھ فکر نہ کرو وہ مردود جلد ہی اپنے کیف کردار کو پہنچنے والا ہے اگر اس وقت مجھے اس کی موجودگی کا پتہ لگ جاتا تو میں اس وقت اسے سزا دیتا" بھائی جان نے کہا

"تو کیا آپ اسے جانتے ہیں' وہ کون شخص ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وقت آنے پر تم خود اسے دیکھ لو گی فی الحال میں اس سے روشناس نہیں ہوں"۔ بھائی جان بولے۔

"بھائی جان کملا بالا خانہ پر آپ کے پاس کیوں گئی تھی اور اس کے ہاتھ میں کیا چیز تھی؟"۔ میں نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ ایک خاص وجہ سے گئی تھی اور اس چیز کی بابت بھی تھوڑے دنوں تک بتا دیا جائے گا اور اس

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کے علاوہ میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے کملا سے محبت ہے اور وہ بھی مجھے چاہتی ہے اور میری زوجیت میں آنے پر رضامند ہے۔"

اس کے بعد میں نے بھائی جان سے التجا کی کہ وہ بالاخانہ کو چھوڑ کر یہیں آجائیں چنانچہ انہوں نے میری بات پر عمل کیا اور میرے ساتھ والے کمرے میں اٹھ آئے صبح کملا میرے پاس آئی تو میں نے اس سے بھی اس چیز کی بابت دریافت کیا جو رات کو اس کے ہاتھ میں تھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کچھ خیال کر کے کانپنے لگی البتہ اس نے اتنا کہا کہ مجھے تمہارے بھائی جان سے محبت ہے اور انہیں بھی میرے ساتھ اس قدر انس ہے اسی لئے وہ ابھی تک مجرد ہیں میں اس سے کبھی شادی کا وعدہ نہ کرتی مگر وہ یقین دلاتے ہیں کہ انہیں اس سے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔"

اگرچہ بھائی جان بھی اپنے کو محفوظ بتاتے تھے تاہم میرے دل کا خدشہ دور نہ ہوتا تھا میں نے کئی دفعہ انہیں شادی سے روکا مگر شنوائی نہ ہوئی۔

اس واقعہ کے دسویں دن سہ پہر کو کملا کا نکاح بھائی جان سے بالکل سادے طریقے پر ہو گیا کملا عروسی لباس میں ایک شاندار پیکر نورانی معلوم ہوتی تھی بھائی جان آج بہت خوش تھے مگر ہم سب غمگین ہو رہے تھے خالہ جان آنکھیں پرنم کئے مصلے پر آزردہ خاطر بیٹھی تھیں میں بھی تصویر یاس بنی اپنے کمرے میں پڑی تھی اور پاس عزیز اداسی سے منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔

جوں جوں شام ہو رہی تھی میرے دل میں خوف پیدا ہو رہا تھا آج رات چچا جان اور عزیز بھی یہیں رہے میں نے عزیز سے صلاح کی کہ رات کو جاگ کر بھائی جان کی حفاظت کرنا چاہئے ہم دونوں اس دروازے کے قریب جو میرے اور بھائی جان کے کمرے کے درمیان کھلتا تھا کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ٹارچ اپنے پاس رکھ لی تاکہ اگر کوئی لیمپ گل کر دے تو روشنی بہم پہنچا سکیں۔

خزاں کی راتیں عموماً پریشان کن ہوتی ہیں لیکن آج تو رات خاص کر ڈراونی اور تاریک تھی جس کو الو کی بھیانک چیخیں اور بھی خوفناک بنا رہی تھیں باہر آوارہ کتے دردناک آواز میں رو رہے تھے اور پتوں کی سرسراہٹ جھینگر کی منحوس آواز کے ساتھ مل کر نہایت ہولناک سماں پیش کر رہی تھی۔

ایک بجے کے قریب یکایک کملا کی چیخ سنائی دی اور ہم جھپٹ کر اندر جا پہنچے وہاں ہم نے ایسا نظارہ دیکھا جس کو عقل سلیم کبھی باور نہیں کر سکتی اور قیاس کبھی تسلیم نہیں کر سکتا بھائی جان مسہری پر پڑے تھے اور ایک قوی ہیکل بت جسے میں اور کملا بچپن میں اپنا دولہا بنا کر دو دولہوں والا گیت گایا کرتی تھیں اپنے آہنی پنجوں سے ان کا گلا دبانے کی کوشش کر رہا تھا ہم دونوں فوری موقع پر پہنچ گئے اور چچا جان بھی جو ہماری طرح جاگ رہے تھے فوراً آپہنچے۔

ہمارے آتے ہی بت بے حس و حرکت مسہری پر گر پڑا اور ہم سب نے مل کر بھائی جان کو اس بت کے نیچے سے نکالا ہر کوئی اس عجیب و غریب انکشاف سے ششدر تھا اور اس بت کو خوف و حقارت سے دیکھ رہا تھا۔

بھائی جان کے کہنے پر ہم سب لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے پرانے کنوئیں تک لے گئے اور اسے اس میں پھینک دیا بھائی جان نے تانبے کی ایک بڑی چادر جو بالاخانے پر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھی ملازموں سے منگوائی اس تمام چادر پر غیر معروف زبان میں کوئی عبارت کندہ تھی اس سے کنوئیں کا منہ ڈھانپ دیا گیا اور اس پر سلیں چن دی گئیں جو قریب کی ایک کوٹھری میں پڑی تھیں اس کارروائی کے بعد ہم سب واپس آگئے۔

بھائی جان واپس آتے ہی کہنے لگے "اس کنوئیں کی جگہ کبھی ایک خوبصورت چبوترہ تھا جب میں بچہ تھا تو دوپہر کے وقت اپنا بستہ لیکر اکثر اس چبوترہ پر آبیٹھتا اور اپنا سبق یاد کرتا اس وقت چبوترے پر سلوں کا فرش تھا کئی سلوں پر کچھ کھدا ہوا تھا پنڈت جی نے مجھے بتایا کہ وہ سنسکرت کے کچھ الفاظ ہیں انٹرنس پاس کرنے کے بعد جب میں علیگڑھ گیا تو میری دوستی ایک جرمن پروفیسر سے ہو گئی جو مردہ زبانوں کا ماہر تھا اس کی ہم جلیسی میں میں اس فن کا ماہر ہو گیا میں دو سال اس کے زیر تعلیم رہا اس کے بعد وہ جرمنی چلا گیا مگر اس عرصہ میں میں نے اس فن میں کافی مہارت حاصل کر لی۔

جب میں فارغ التحصیل ہو کر گھر آیا تو میں نے چبوترے کی سلوں والی عبارت پڑھنے کی کوشش کی یہ مختلف راجاؤں کے عہد کی تحریریں تھیں جن کا یہ مطلب تھا کہ اس کنوئیں میں بلا بند ہے کچھ سلوں پر بہت پرانے زمانے کی تحریریں تھیں اس لئے میں وہ نہ پڑھ سکا لیکن طرز تحریر سے میں نے قیاس کیا کہ ان سلوں پر بھی کسی وقت کے بادشاہوں نے کنوئیں کی ممانعت کے متعلق کچھ لکھوایا ہو گا۔

انسان کی فطرت ہے کہ جس کام سے اسے روکا جائے اس کام کی بے حد خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے یہی حال میرا بھی تھا آخر میں اپنی طبیعت کے جوش کو نہ روک سکا اور سلیں اکھڑوا ڈالیں سلوں کے نیچے کسی مصالحہ کے پلستر کی ایک بہت موٹی تہ تھی جو بہت مشکل سے اکھاڑی گئی اس تہ کے نیچے یہی تانبے کی موٹی چادر تھی جو اب کنوئیں کے منہ پر رکھی گئی ہے میں اس چادر کا ایک حرف بھی نہ پڑھ سکا اس لئے میں نے وہ چادر بالاخانہ کی دیوار کے ساتھ رکھوا دی۔

کنواں کھل گیا مگر مجھے اطمینان نہ ہوا میں تمام رات سوچتا رہا کہ یہ کنواں کیوں بند کیا گیا تھا اور کیوں اس کے کھولنے کی ممانعت کی گئی تھی دوسرے دن میں نے اپنے بوڑھے ملازم کو کنوئیں میں اتارا تو اس نے بتایا کہ کنوئیں میں پانی کے اندر ایک گز کی گہرائی پر تانبے کا جال پڑا ہے جس میں بہت برتن اور دوسری چیزیں موجود ہیں۔

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

میرے کہنے پر اس نے ایک برتن جو گاگر کی قسم کا تھا باہر نکالا یہ برتن دیر تک نمناک مٹی میں پڑا رہنے سے سیاہ ہو رہا تھا مگر کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ سونے کا ہے میں نے شک دور کرنے کے لئے ریتی سے اسے کاٹا اور دوسرے دن جھنگ لے جا کر سنار کو دکھایا اس نے بھی اسے سونے ہی کا بتایا۔

انتہائی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک کٹھالی خریدی اور رات کے وقت اپنے کمرے میں اس برتن کو گلا کر اینٹوں کی شکل میں تبدیل کر لیا بعد ازاں میں دوسرے تیسرے دن اس بوڑھے ملازم سے ایک برتن نکلواتا اور رات کو پگھلا کر اینٹیں بنا لیتا اسی خفیہ طریقے سے میں نے کچھ عرصے میں وہ برتن ٹھکانے لگا دیئے۔

باقی سامان بہت وزنی لوہے وغیرہ کا تھا جو اکیلے آدمی سے نکلنا محال تھا اس لئے اب یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا چنانچہ میں نے اپنے قیمتی خزانے کی خیر مناتے ہوئے کنوئیں کا باقی ماندہ سامان پنڈت جی کی تحویل میں دے دیا وہ مزدوروں کے ساتھ خود کنوئیں میں اترے اور سامان کی فہرست بنا کر مجھے دکھلائی۔

گو مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا کیا چیزیں تھیں مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ چیزیں میرے مصرف کی نہ تھیں اس لئے میں نے پنڈت جی سے کہا یہ چیزیں لاہور کے عجائب گھر میں بھجوا دی جائیں سو وہ چیزیں پنڈت جی ہی نے نکلوائیں اور عجائب گھر میں بھیج دیں میں اس وقت موجود نہ تھا پنڈت جی چونکہ پرانے خیال کے آدمی تھے انہوں نے اس بت کو کسی دیوتا کی مورتی سمجھ کر اپنے ٹھاکر دوارے میں رکھ لیا ہو گا بہر حال مجھے اس بت کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا چادر کی عبارت پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا اس لئے میں ہر وقت اسی میں محو رہنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں گوشہ نشین مشہور ہو گیا۔

کملا سے مجھے بچپن سے محبت تھی مگر مذہب کے تفاوت سے اظہار نہ کر سکا اور تمام عمر مجرد رہنے کا ارادہ کر لیا کملا کی شادی کے موقعہ پر مجھے بہت رنج ہوا تاہم میں نے حوصلہ نہ ہارا اور شادی میں سرگرمی سے حصہ لیتا رہا۔

شادی سے ایک رات پہلے جو پرچہ کملا کو ملا تھا اس کے حروف چادر کے حروف سے بالکل ملتے جلتے تھے اگرچہ میں اسے بھی نہ پڑھ سکا لیکن وہ پرچہ میں نے پنڈت جی سے لے کر رکھ لیا اور بعد ازاں جب زرینہ کو ویسا ہی پرچہ ملا تو میں نے اس کی شادی ملتوی کر دی اور باوجود انتہائی حفاظت و رازداری کے بھی ارشد کی موت واقع ہو گئی۔

اس واردات سے مجھے یقین ہو گیا کہ تانبے کی چادر کے سوا کسی شے سے قاتل کا سراغ دستیاب نہیں ہو سکتا چنانچہ میں اس عبارت کے پڑھنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگا اور تین سال کی لگا تار محنت کے بعد کامیاب ہو گیا۔

اس تحریر سے معلوم ہوا کہ کئی ہزار سال پہلے [illegible] راکھشش [illegible] رہا کرتا تھا

ظالم تھا لوٹ مار کے علاوہ حسین عورتوں پر بھی ہاتھ صاف کیا کرتا تھا یہاں سے پانچ میل کے فاصلہ پر کنولا شہر آباد تھا کنولا راجہ دیپک کی راجدھانی تھی راجہ بڑا اودھرماتما تھا رعایا کی تکلیف دور کرنے کے لئے اس نے کئی دفعہ اس راکھشش پر فوج کشی کی مگر اسے زیر نہ کر سکا۔

کنولا کے قرب و جوار میں ایک نہایت حسین عورت رہا کرتی تھی یہ عورت شوجی کی پجارن تھی برلاس اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اس پر بھی دست درازیاں کرنے لگا اور پجارن نے اس کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر شوجی سے امان چاہی چنانچہ شیوجی کی پھٹکار سے اس راکھشش کی صورت مسخ ہو گئی اور اس کا گھر کنواں بن گیا جس میں وہ مع اپنے خزانے کے قید کر دیا گیا اس کنوئیں کا منہ تانبے کی چادر سے ڈھانپ کر شیوجی نے اس پر ان واقعات کے علاوہ ایک منتر بھی لکھ دیا تاکہ راکھشش کسی صورت باہر نہ نکل سکے۔

اس چادر میں واضح طور پر درج تھا کہ اس کنوئیں کا کھولنا خلاف مصلحت ہے لیکن اگر کوئی سونے کے لالچ میں اس کو کھول بھی لے تو اسے چاہئے کہ وہ راکھشش کو ہرگز نہ نکالے اور سونا لے کر کنوئیں کو پہلے کی طرح بند کر دے اب اس عبارت کی مدد سے میں نے وہ پرچے بھی پڑھ لئے جو شادی سے پہلے کملا اور زرینہ کو ملے ان پرچوں کا مضمون واحد تھا جس کا مطلب تھا کہ تم بچپن میں مجھے اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہو اب کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتیں۔

اس عبارت سے مجھ پر عیاں ہو گیا کہ یہ برلاس ہی کی تباہ کاریاں ہیں جو دیگر سامان کے ساتھ کنوئیں سے نکالا جا چکا ہے اب میرے لئے یہ معمہ حل طلب تھا کہ برلاس کہاں ہے اور کس شکل و صورت میں ہے پنڈت جی نے کنوئیں کے سامان کی جو فہرست مجھے دی تھی ضائع ہو چکی تھی وہ خود بھی زندہ نہ تھے کہ ان سے سراغ ملتا۔

آخر کار میں نے اس سلسلہ میں لاہور کا سفر کیا اور اپنی دی ہوئی چیزیں عجائب گھر میں جا کر دیکھیں مگر ان میں کوئی چیز ایسی نہ دکھائی دی جس پر راکھشش کا گمان کیا جا سکتا۔

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کملا کو شادی پر رضامند کیا جائے اور اس ترکیب سے راکھشش کو رقیب بن کر دیکھا جائے ایک دن میں نے موقع پا کر کملا سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا چونکہ وہ بھی مجھے چاہتی تھی اس لئے اس نے شادی کا وعدہ کر لیا۔

اس کے بعد مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی سو میں نے اس منتر کو جو تانبے کی چادر پر کندہ تھا کاغذ کے ٹکڑوں پر تعویذ کی طرح لکھ کر ایک ایک تعویذ بالاخانے کے سب دروازوں پر لگا دیا اور ایک اپنے گلے میں باندھ لیا جس شام زرینہ اور عزیز ہمیں جھروکے سے دیکھ رہے تھے میں جس چیز کا معائنہ کر رہا تھا وہ راکھشش کا ایک اور پرچہ تھا جو اب کی مرتبہ کملا کو ملا تھا۔

جب تک ہم دونوں کمرے میں کھڑے رہے راکھشش باہر کھڑا جھروکے سے ہمیں دیکھ کر دانت پیستا رہا اور اندر نہ آسکا کیونکہ تمام دروازوں پر تعویذ لگے ہوئے تھے اس شام زرینہ اسی راکھشش

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کو دیکھ کر بیہوش ہو گئی تھی۔

آج رات بدلا اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی اس کا غرور خاک میں مل رہا تھا میں نے اور سب دروازوں پر وہی تعویذ لگا دیئے تھے لیکن سامنے والی دیوار میں چور دروازے کا مجھے علم نہ تھا یہ راستہ اس کے لئے کھلا تھا اس نے اس چور دروازے کے ذریعے اندر آکر دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے کی کوشش کی مگر اس تعویذ کی برکت سے اس کے ہاتھ وہیں شل ہو گئے اور وہ گر پڑا جس کے بوجھ سے دب کر میں نیم جان سا ہو گیا باقی سب حالات آپ کو معلوم ہیں۔

دوسرے دن انہیں سلوں کا چبوترہ معمار سے بدستور ہوا دیا گیا اور ایک سل پر بھائی جان نے اردو میں اس کنوئیں کو کھولنے کی ممانعت کندہ کر دی۔

اسی اثنا میں مجھے عزیز سے کافی انس ہو گیا تھا چنانچہ میری شادی اس سے ہو گئی اور ہم سب نے اس حویلی کو خیرباد کہہ دیا۔

اب بھی اگر کوئی سیاح موضع مرادیانی کی طرف جا نکلے تو وہ اس چبوترے کو جس کے نیچے راکھشش دفن ہے موجود پائے گا لیکن میں اسے متنبہ کرتی ہوں کہ وہ ہرگز اس چبوترے کو کھدوانے کا قصد نہ کرے ورنہ گرفتار بلا ہو جائے گا۔

جنونی شیطان

ہر وہ شخص جسے مشرقی انگلستان میں سفر کرنے کا موقع ملا ہے ضرور جانتا ہو گا کہ اس علاقے میں دیہاتی لوگوں کے چھوٹے چھوٹے اور مرطوب سے مکانات بکھرے نظر آتے ہیں جو عام طور پر اطالوی طرز تعمیر کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے گرد اسّی سے سو ایکڑ تک کے سبزہ زار پھیلے ہوتے ہیں۔ میرے لیے ہمیشہ ان سبزہ زاروں میں بے حد جاذبیت رہی ہے جن کے چاروں طرف جنگلے کے طور پر شاہ بلوط کے بھورے رنگ کی لکڑیاں گڑی ہوتی ہیں، عمدہ قسم کے درخت اُگے ہوتے ہیں، اور اس سے پرے جنگل کی حد نظر آتی ہے۔ اس کے بعد مجھے وہ ستون دار پیش دہلیزیں پسند ہیں جو شاید سرخ اینٹوں والے، ملکہ این کے دور کے بنے ہوئے مکانات کا نمایاں حصہ ہیں اور جن پر اٹھارھویں صدی کے اواخر کے ذوق اور یونانی طرز کی استرکاری کی ہوئی ہے۔ ان عمارات کے اندر بڑے بلند ہال ہوتے ہیں جن کی گیلریاں ارغنون سے آراستہ ہوتی ہیں مجھے یہاں کی لائبریریاں بھی پسند ہیں جہاں تیرھویں صدی کی کتاب مناجات سے شیکسپیئر کی کوارٹوز تک ہر چیز دستیاب ہو سکتی ہے۔ یہاں کی تصویریں مجھے واقعی اچھی لگتی ہیں۔ ان میں سے اکثر تصویریں اس دور کی زندگی کی عکاس ہیں جب یہ عمارات تعمیر ہوئی تھیں ان تصویروں سے جاگیرداروں کی خوشحالی کا عہد جھلکتا ہے اور یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ ان دنوں دولت اگرچہ اتنی فراواں نہ تھی اور رجحانات آج کی نسبت مختلف تھے تاہم زندگی کچھ کم دلچسپ نہ تھی۔ میری خواہش ہے کہ ایک ایسا ہی مکان میرے پاس ہوتا اور بہت سی دولت بھی ہوتی تاکہ میں اپنے دوستوں کی تواضع بڑی شان سے کرتا۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ ایک ایسے ہی مکان میں، جس کی تفصیلات کا ذکر کرنے کی میں نے کوشش کی ہے، عجیب و غریب واقعات کا سلسلہ ظہور پذیر ہوا۔ اس عمارت کا نام کاسٹر نگہم ہال ہے جو سفوک میں واقع ہے۔ میرا خیال کہ میری کہانی کا دور جہاں سے شروع ہوتا ہے اس وقت سے اب تک اس عمارت میں کافی تبدیلی واقع ہو چکی ہے تاہم وہ سب ضروری چیزیں اب بھی موجود ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے..... اطالوی طرز کی محرابی دہلیز، سفید رنگ کی مرکزی عمارت، سبزہ زار جس کے کنارے جنگل کی حد شروع ہو جاتی ہے اور مکان کا اندر سے نسبتاً زیادہ قدیم دکھائی دینا' البتہ ایک چیز اب موجود نہیں ہے 'یعنی سبزہ زار کی طرف سے دیکھا جاتا تو مکان کی دائیں طرف ایک پرانا بلوط کا درخت نظر آتا جس کا تنا مکان کی دیوار سے بمشکل چھ گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کی شاخیں عمارت کو تقریباً چھو رہی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ درخت یہاں اس وقت سے موجود تھا جب سے کاسٹر نگہم قلعہ بند عمارت نہ رہی اور جب سے ارد گرد کی کھائی پُر کر دی گئی اور یہ ملکہ ایلزبتھ کے دور کا رہائشی مکان بنا۔ بہر حال یہ درخت ۱۶۹۰ء میں اپنے پورے پھیلاؤ کو پہنچا تھا۔

اسی سال اس ضلع میں جس میں یہ ہال واقع ہے جادوگرنیوں کے کچھ مقدمات پیش ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ٹھوس واقعیت کا صحیح تخمینہ لگانا بہت دقت طلب کام ہے جو زمانہ قدیم سے جادوگرنیوں کے عالمگیر خوف کی تہ میں مضمر ہے۔ بہت سے سوالات ہیں جو میری دانست میں ابھی تک حل نہیں ہو سکے۔ مثلاً کیا وہ اشخاص جن پر اس "جرم" کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ واقعی یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں کسی قسم کی غیر معمولی طاقت حاصل ہے۔ یا اگر طاقت نہیں تو کم از کم ان کی قوت ارادی ہی اس نوعیت کی ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں کو کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں یا ان کے اعترافات محض ان کے مخالفوں کے ظلم سے اگلوائے جاتے ہیں؟ میں ان تمام سوالوں کا جواب اپنی طرف سے نہیں دیتا بلکہ قارئین آگے چل کر خود صحیح اندازہ لگا لیں گے۔

کاسٹر نگہم نے عوامی عدالت کو ایک "شکار" بہم پہنچایا۔ مسز مدرسول اس کا نام تھا۔ اور وہ دیہاتی جادوگرنیوں کے معمولی غول سے صرف اس حد تک مختلف تھی کہ ان سے قدرے بہتر تھی اور زیادہ اثر و رسوخ رکھتی تھی۔ علاقے کے کئی مشہور زمینداروں نے اسے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی اور اس کے نیک کردار کی تصدیق کی اور بعد میں جیوری کے فیصلے پر گہری تشویش کا اظہار کیا۔

اس عورت کے حق میں سب سے زیادہ مہلک گواہی کاسٹر نگہم ہال کے مالک سر میتھیو فیل نے دی۔ انہوں نے حلفیہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں نے اسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے تین مختلف موقعوں پر دیکھا ہے۔ ہر موقع پر وہ پورے چاند کی روشنی میں میرے مکان کے قریب بلوط کے درخت سے ٹہنیاں اکٹھی کرتی پائی گئی۔ وہ درخت کی مو[illegible]

صرف ایک لمبی قمیض پہنی ہوتی، اور ایک عجیب سے خمیدہ چاقو سے ٹہنیاں کاٹنے لگتی۔ ایسے موقع پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔ ہر بار سر میتھیو فیل نے اس عورت کو پکڑنے کی بڑی کوشش کی لیکن ہمیشہ اسے کسی حادثاتی شور سے اس کا علم ہو جاتا اور جب وہ باغ میں پہنچتے تو انہیں صرف ایک خرگوش نظر آتا جو گاؤں کی طرف پگڈنڈی پر بھاگ رہا ہوتا۔

تیسری رات انہوں نے ہمت کر کے اپنی پوری رفتار سے اس کا پیچھا کیا اور سیدھے مسز مدرسول کے مکان پر جا پہنچے۔ تقریباً پندرہ منٹ تک انہیں دروازے پر زوردار دستک دیتے ہوئے رکنا پڑا اور جب باہر نکلی تو بظاہر اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں جیسے وہ ابھی بستر سے نکل کر آئی ہو، اور وہ اپنی آمد کی اچھی طرح وضاحت کرنے سے بھی قاصر رہے۔

زیادہ تر اسی شہادت کی بناء پر، اور دوسرے کلیسائی حلقوں کی جانب سے کم و بیش اسی انداز کی تائید کے باعث مسز مدرسول پر فرد جرم عائد کر دی گئی اور اسے موت کی سزا سنا دی گئی مقدمے کے ایک ہفتہ بعد اسے پانچ یا چھ اور افراد کے ساتھ سینٹ ایڈمنڈز کے قبرستان کے پاس پھانسی دے دی گئی۔

سر میتھیو فیل، جو اس وقت عدالت کے نائب افسر تھے، پھانسی دینے کے موقع پر موجود تھے۔ مارچ کی ایک مرطوب صبح تھی 'جب ہلکی ہلکی بوندا باندی میں ایک چھکڑا گھاس سے ڈھکی ہوئی بھدی پہاڑی پر شمالی دروازے کے باہر آ کر رکا جہاں پھانسی دی جانے والی تھی۔ دوسرے ملزم بڑے بد دل اور خستہ حال نظر آ رہے تھے۔ لیکن مسز مدرسول کا مزاج سب سے مختلف تھا۔ اس عہد کے ایک نامہ نگار کے لفظوں میں اس کا زہر آلود غصہ تماشائیوں پر، حتیٰ کہ جلاد پر، اس بری طرح اثر انداز ہوا کہ سب کی متفقہ رائے میں وہ کسی جنونی شیطان کا زندہ عکس نظر آ رہی تھی۔ تاہم اس نے قانون کی بجا آوری کرنے والے افسروں کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ محض اپنے مخالفوں کو اس قدر خوفناک اور زہر آلود نظروں سے دیکھتی رہی کہ ان میں سے ایک شخص نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس منظر کے تصور ہی سے چھ ماہ تک اس کے ذہن پر اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ آخری وقت وہ کچھ کہہ رہی تھی جو بظاہر بے معنی الفاظ تھے: "ہال میں مہمان آنے والے ہیں۔" اس نے یہ فقرہ دبی زبان سے دو ایک دفعہ دہرایا تھا۔

سر میتھیو فیل اس عورت کے آخری طرز عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے علاقے کے پادری سے اس موضوع پر کچھ گفتگو بھی کی تھی جو ان کے ساتھ پھانسی کے معاملے سے فارغ ہو کر گھر واپس آ رہا تھا۔ مقدمے میں ان کی گواہی کچھ زیادہ خوشی سے نہیں دی گئی تھی اور نہ وہ خاص طور پر جادوگرنیوں کو ڈھونڈنے کا خبط رکھتے تھے۔ تاہم انہوں نے اس وقت اور بعد میں بھی یہی کہا کہ وہ اس معاملے کی جس قدر تفصیل بیان کر چکے ہیں اس کے علاوہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتے اور اس امر کا ہرگز امکان نہیں کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا۔ اس میں انہیں کوئی غلط فہمی پیدا

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ہوئی ہو۔ البتہ یہ سب کارروائی اگرچہ ان کی طبع کے خلاف تھی مگر انہوں نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا اپنا فرض سمجھا اور اسے سرانجام دیا۔ ان کے جذبات کا اظہار یہی خلاصہ تھا جس کی پادری نے تعریف کی۔ کوئی بھی معقول شخص یہی کچھ کرتا۔

چند ہفتے بعد جب مئی کا پورا چاند نکلا ہوا تھا، پادری اور جاگیردار ایک بار پھر باغیچے میں ملے اور اکٹھے ہال کی طرف آئے۔ لیڈی فیل کی والدہ سخت بیمار تھیں لہٰذا وہ اپنے میکے گئی ہوئی تھیں اور سر میتھیو گھر میں اکیلے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پادری کروم رات کا کھانا وہیں کھانے پر بآسانی رضامند ہو گیا۔

اس شام سر میتھیو رفاقت کا حق اچھی طرح ادا نہ کر سکے۔ گفتگو زیادہ تر خاندان اور کلیساء کے معاملات کے بارے میں ہوئی اور پھر سر میتھیو نے اپنی جائیداد کے متعلق اپنی خواہشات اور عزائم کی یادداشت تحریر کی جو اتفاق سے بعد میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔

جب پادری کروم نے گھر چلنے کا ارادہ کیا تو رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ سر میتھیو اور وہ عمارت کے پچھواڑے پختہ گذرگاہ کی طرف مڑے ہی تھے کہ رک گئے۔ جس واقعے سے پادری چونک اٹھا وہ یہ تھا: وہ دونوں بلوط کے درخت کے سامنے تھے جس کی شاخیں عمارت کی کھڑکیوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سر میتھیو نے اچانک کہا:

"یہ کیا چیز ہے جو بلوط کے درخت پر کبھی چڑھ رہی ہے اور کبھی نیچے اتر رہی ہے؟ گلہری تو ہرگز نہیں ہو سکتی، کیونکہ گلہریاں تو اس وقت اپنے ٹھکانوں میں چلی جاتی ہیں۔"

پادری نے اس طرف دیکھا۔ کوئی چیز متحرک تھی، لیکن وہ چاند کی روشنی میں اس کا رنگ نہ پہچان سکا۔ تاہم ایک لمحے کے لیے اس نے اس کی ہیئت کی جھلک دیکھی جو اس کے ذہن پر ثبت ہو گئی اور وہ حتمی طور پر یہ کہہ سکتا تھا کہ متحرک جاندار، خواہ وہ گلہری ہو یا کوئی اور چیز، چار سے زیادہ ٹانگوں والا تھا۔

اس کے باوجود وہ دونوں اس منظر سے کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے اور جلد ہی ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔

اگلے دن سر میتھیو فیل چھ بجے صبح نیچے نہ اترے، جیسا کہ وہ ہر روز کیا کرتے تھے۔ سات بجے، حتیٰ کہ آٹھ بج گئے۔ اس پر ملازم اوپر گئے اور ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں یہ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ انہوں نے تشویشناک انداز سے کمرے میں سے کچھ سننے کی کوشش کی اور بار بار دروازے کو زور سے پیٹتے رہے۔ آخر دروازہ باہر کی طرف سے کھلا اور انہوں نے دیکھا کہ ان کا مردہ پڑا ہے اور اس کا رنگ سیاہ ہو چکا ہے۔ اتنا سیاہ، جتنا کہ آپ قیاس کر سکتے ہیں۔ جائے واردات پر تشدد کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ البتہ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔

ایک آدمی پادری کو بلا لایا اور پھر اس کی ہدایات کے مطابق غیر طبعی موت کی تفتیش کرنے

والے افسر کو اطلاع دینے کے لیے چلا گیا۔ پادری کروم تیزی سے ہال میں پہنچا اور پھر اسے اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں لاش پڑی تھی۔ پادری نے اپنے کاغذات میں کچھ یادداشتیں چھوڑی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں سر میتھیو کے لیے کس قدر مخلصانہ احترام اور اس حادثے پر گہرا افسوس تھا۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل عبارت بھی ملی جو میں اس خیال سے نقل کر رہا ہوں کہ اس سے نہ صرف مذکورہ واقعات پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اس وقت کے عام اعتقادات بھی منظر عام پر آتے ہیں۔

"کمرے میں کسی کے بزور داخل ہونے کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی مگر کھڑکی ضرور کھلی تھی جیسا کہ میرے مرحوم دوست کا اس موسم میں عام طور پر دستور تھا۔ رات کو وہ چاندی کے ایک جام میں تھوڑی سی شراب پیا کرتے تھے۔ لیکن گزشتہ رات انہوں نے جام بالکل خالی نہیں کیا تھا۔ باقی ماندہ شراب کا قریب کے ایک ڈاکٹر مسٹر ہوجکنس سے معائنہ کرایا گیا جس نے تفتیش کرنے والے افسر کی تحقیقات سے پہلے ہی بتا دیا کہ لاش کی سیاہ رنگت اور بدن پھول لینے کے پیش نظر ہمسایوں میں زہر کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ میت بستر میں بڑی بے نظمی سے مڑی ہوئی پڑی تھی، جس سے غالباً یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ میرے لائق دوست اور مربی کی موت بڑی اذیت اور روحانی تکلیف سے واقع ہوئی ہو گی۔ اور جو بات اب بھی وضاحت طلب ہے اور جس سے اس وحشیانہ قتل کا ارتکاب کرنے والوں کے مکروہ اور عیارانہ ارادے کا پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ جن دو عورتوں کو میت کے کفن دفن پر مامور کیا گیا تھا، وہ میرے پاس آئیں۔ انہیں ذہنی کوفت کے علاوہ جسمانی تکلیف بھی تھی۔ جو کچھ انہوں نے کہا اس سے میرے پہلے نظریے کی تصدیق ہوتی تھی کہ جونہی انہوں نے لاش کی چھاتی کو اپنے ننگے ہاتھوں سے چھوا ان کی ہتھیلیوں میں درد سا ہونے لگا جو بڑھتے بڑھتے ان کے بازوؤں تک جا پہنچا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کے ہاتھ اور بازو متورم ہو گئے اور درد بھی بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ بعد میں کئی ہفتوں تک وہ اپنے فرائض انجام دینے سے قاصر رہیں۔ البتہ ان کی جلد پر کوئی نشان نہ تھا۔

یہ سن کر میں نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا، جو ابھی مکان میں تھا اور پھر ہم نے ایک چھوٹے سے آتشی شیشے کی مدد سے جسم کے اس حصہ کا بغور معائنہ کرنے کی کوشش کی مگر اس آلے سے ہم سوائے دو باریک سوراخوں کے جلد پر اور کوئی اہم چیز معلوم نہ کر سکے جن کے بارے میں ہم نے سوچا کہ ان ہی سوراخوں سے جسم میں زہر پھیلا ہو گا۔ ہمیں یاد آیا کہ پچھلی صدی میں اٹلی میں پراسرار قاتل ایک قسم کی انگوٹھی کی مدد سے مقتول کے جسم میں زہر پہنچایا کرتے تھے۔

"یہاں تک تو لاش پر علامات کا ذکر تھا۔ میں اس ضمن میں جو کچھ اضافہ کر رہا ہوں۔ وہ محض میرا ذاتی تجربہ ہے جسے میں آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر رہا ہوں تاکہ وہ خود محسوس کریں کہ اس میں کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔ میرے دوست کے بستر کے پاس میز پر ایک چھوٹی تقطیع کی انجیل پڑی

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

تھی جس میں سے مرحوم رات کو اور صبح اٹھ کر کچھ حصہ پڑھا کرتے تھے۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ معاً میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اشارۂ غیبی معلوم کرنے کی غرض سے مقدس کتاب سے استفادہ کیا جائے کیونکہ بے بسی کے ایسے موقعوں پر ہم اس ہلکی سی جھلک کی طرف بھی مائل ہو جاتے ہیں جس سے ہمیں روشنی کی امید ہوتی ہے۔ فال نکالنے کے اس قدیم طریق کار کو میں نے آزمانے کا ارادہ کر لیا جس کی ایک بڑی مثال شاہ چارلس اور میرے کرم فرما فاکلینڈ کے واقعہ سے ملتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے اس کوشش سے کچھ زیادہ مدد نہ ملی تاہم میں اس خیال کے پیش نظر کہ ان خوفناک واقعات کا اصل باعث بعد میں دریافت ہو جائے گا، فال نکالنے کے نتائج تحریر کرتا ہوں۔ اس ضمن میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان سے مذکورہ واقعہ کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے جو ذہین افراد فوراً بھانپ لیں گے۔

فال نکالنے کے لیے میں نے انجیل کو تین بار کھولا اور کہیں انگلی رکھ کر ان لفظوں کو پڑھا پہلی بار لوقس ۱۳۔ ۷ کے یہ الفاظ تھے: اسے کاٹ ڈالو۔ دوسری دفعہ یسعیاہ ۱۳/۲۰ کی یہ عبارت تھی: یہ کبھی آباد نہ ہوگا۔ اور تیسری کوشش سے ایوب ۲۹/۳۰ کی یہ آیت نکلی: اس کے بچے بھی خون چوس لیتے ہیں۔"

پادری کروم کے کاغذات میں سے اتنے ہی بیان کا حوالہ ضروری تھا۔ سر میتھیو فیل کی میت کو مناسب طریقے سے تابوت میں رکھ کر دفن کر دیا گیا۔ اگلی اتوار کو مجلس ماتم میں پادری کروم نے جو تقریر کی اسے "ناقابل تفتیش راستہ یا انگلستان کا خطرہ اور عیسائیت کے دشمن کی مکروہ حرکت" کے عنوان سے چھپوا دیا گیا۔ یہ پادری کا نظریہ تھا، جس سے قرب وجوار کے لوگ بھی متفق تھے کہ جاگیردار کسی مذہبی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔

ان کے بیٹے سر میتھیو ثانی کو خطاب اور جاگیر سے نوازا گیا اور اس طرح کاسٹر نائیم کے المیے کا پہلا باب ختم ہوا۔ یہاں ایک امر قابل ذکر ہے۔ اگرچہ یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ نئے جاگیردار صاحب کبھی اس کمرے میں نہیں رہے، جہاں ان کے والد فوت ہوئے تھے نہ کبھی ان کے دور میں کوئی اور ہی وہاں سویا البتہ کبھی کبھار کوئی ملاقاتی یہ کمرہ دیکھنے کے لیے آ جاتا تھا۔ ان کی موت ۱۷۳۵ء میں واقع ہوئی اور ان کے دور اقتدار میں کوئی خاص طور پر اہم واقعہ رونما نہیں ہوا سوائے اس کے کہ ان کے مویشی ایک موقع پر ایک ایک کر کے مرنے لگے تھے۔ اور اس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔

انہوں نے آخرکار اس کے لیے ایک سادہ سی تدبیر کی یعنی ہدایت کی کہ تمام مویشی رات کو باڑے میں بند کیے جائیں اور کوئی جانور باہر نہ رہے۔ کیونکہ انہوں نے یہ مشاہدہ کیا تھا کہ بند جانوروں کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ اس ... آفت جنگلی پرندوں اور شکاری جانوروں کی طرف ... ہوئی۔ لیکن ہمیں چونکہ مویشیوں کی بیماری کی علامات کی کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملی اور راتوں کو جاگ کر چوکیداری کرنے کا نتیجہ بھی خاطر خواہ نہیں نکلا ...

"کاسٹر نائیم کی بیماری" کہتے تھے۔
بحث نہیں کرتا جسے سفوک کے کسان
جیسا کہ پیشتر ازیں بیان کیا جا چکا ہے سر میتھیو ثانی ۱۷۳۵ء میں فوت ہو گئے اور پھر ان کے بیٹے سر رچرڈ جانشین بنے۔ ان کے عہد میں علاقے کے گرجے کی شمالی جانب ایک عظیم خاندانی نشست گاہ تعمیر ہوئی۔ جاگیردار کے منصوبے اتنے وسیع تھے کہ عمارت کے اس رخ پر کئی قبروں کو وہاں سے ہٹا کر ان کی ضروریات کی تسکین کی گئی۔ ان میں مسز مدر سول کی قبر بھی شامل تھی جس کا محل وقوع پادری کروم کے بنائے ہوئے نقشے سے اچھی طرح واضح تھا۔

جب یہ بات گاؤں کے لوگوں کو معلوم ہوئی کہ مشہور جادوگرنی کی قبر کھودی جائے گی۔ جس کی یاد اب بھی کسی حد تک باقی تھی تو ان میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی اور جب یہ معلوم ہوا کہ اس کا تابوت مضبوط اور صحیح و سالم ہونے کے باوجود اندر سے خالی تھا اور اس میں اس کی ہڈیوں یا خاک کا کوئی نشان نہ تھا، تو سب بڑے متعجب ہوئے اور واقعی یہ بڑی عجیب بات تھی۔ کیونکہ جب اسے دفن کیا گیا تھا تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی اس تابوت کو یہاں سے ہٹائے گا۔ لاش کو نکالنے کی کوئی معقول وجہ تحریک بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اگر وہ پھانسی کے بجائے کسی اور طریقے سے مرتی تو چیر پھاڑنے کے لیے ہسپتال لے جانے کی ضرورت ہی پیش آ سکتی تھی۔ مگر ایسا نہ ہوا تھا۔

اس واقعہ سے جادوگرنیوں کے مقدمات اور ان کی "معرکوں" کی تمام کہانیاں کچھ دیر کے لیے ... گئیں جو چالیس سال سے محو ہو چکی تھیں۔ سر رچرڈ نے حکم دیا کہ تابوت کو جلا دیا جائے ... کی تعمیل تو ہو گئی لیکن اکثر لوگ اسے ایک معقول بات نہ سمجھتے تھے۔

یہ بات یقینی تھی کہ سر رچرڈ ناپسندیدہ قسم کے جدت طراز تھے۔ ان کے اقتدار سے پہلے ہال سرخ اینٹوں کی ایک عمدہ عمارت تھی لیکن سر رچرڈ اٹلی کی سیاحت کر چکے تھے اور اطالوی ذوق سے بے حد متاثر تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس دولت بھی اپنے آباؤ اجداد کی نسبت زیادہ تھی۔ لہٰذا انہوں نے انگریزی طرز کے مکان کو ایک اطالوی محل بنانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اینٹوں کو سنگریزوں کے پلستر سے ڈھک دیا گیا۔ ڈیوڑھی اور باغوں میں بے رنگ قسم کے اطالوی سنگ مرمر کا کام کیا گیا۔ جھیل کے کنارے طیوولی میں واقع سبیل کے گرجے کا نمونہ بنا دیا گیا اور کاسٹر نائیم نے بالکل ہی نئی صورت اختیار کر لی مگر اس کی دلکشی کم ہو کر رہ گئی۔ بعد کے زمانے میں قرب وجوار کے لوگوں نے البتہ اس کی بڑی تعریف کی اور اسے ایک مثالی عمارت قرار دیا۔

۱۷۵۴ء میں ایک صبح جب سر رچرڈ جاگے تو رات کی بے چینی سے ان کی طبیعت بڑی پراگندہ تھی۔ گزشتہ رات ہوا زور سے چلتی رہی تھی اور چونکہ سردی بہت زیادہ تھی اس لیے انہیں آگ جلائے رکھنا پڑی، جس سے دھواں بکھرتا رہا۔ اس کے علاوہ کوئی چیز کھڑکی سے اس طرح ٹکراتی رہی کہ کسی کے لیے اس کمرے میں ایک لمحے کے لیے بھی سونا دشوار تھا۔ اور پھر اگلے دن کچھ معزز

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem
Uploaded By Muhammad Nadeem ندیم

مہمانوں کے آنے کی توقع بھی تھی جو شکار وغیرہ کھیلنے کا پروگرام رکھتے تھے اور چونکہ سر رچرڈ اس ضمن میں خاصی شہرت رکھتے تھے اس لیے وہ قدرے فکر مند ہو رہے تھے۔ لیکن دراصل انہیں اس بات کی زیادہ فکر تھی کہ رات کی نیند حرام ہوئی۔ انہوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس کمرے میں پھر نہیں سوئیں گے۔

ناشتے کے وقت ان کے غور و فکر کا اہم موضوع یہی رہا اور اس کے بعد انہوں نے مختلف کمروں کا باقاعدہ معائنہ شروع کیا تاکہ دیکھیں کہ کونسا کمرہ ان کے خیال کے مطابق موزوں رہے گا۔ کافی دیر بعد انہیں ایک کمرہ کچھ جچا۔ مگر اس کی ایک کھڑکی مشرق کی جانب کھلتی تھی اور اس کے دروازے کے سامنے سے نوکروں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ وہ اپنا پلنگ اس کمرے میں لانا پسند کرتے تھے وہ چاہتے تھے کہ کمرے کی کھڑکی مغرب کی جانب کھلتی ہو تاکہ سورج کی کرنیں انہیں صبح سویرے ہی نہ جگا دیں اور کمرہ باقی مکان سے ذرا علیحدہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ گھر کی منتظمہ سے رائے لی گئی۔

"سر رچرڈ" اس نے کہا۔ "آپ جانتے ہی ہوں گے کہ مکان میں ایک ہی کمرہ ہے جو اس قسم کا ہے۔"

"وہ کونسا ہے؟" سر رچرڈ نے پوچھا۔ "سر میتھیو والا۔ مغربی کمرہ۔"

"ٹھیک ہے، مجھے ادھر لے چلو۔ میں آج رات وہیں سونا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "کدھر ہے وہ کمرہ؟ میں دیکھ لوں۔" اور وہ ادھر مڑ گئے۔

"لیکن سر رچرڈ، اس کمرے میں تو چالیس سال سے کوئی بھی نہیں سویا۔ جب سے سر میتھیو فوت ہوئے، اس کی تو ہوا بھی شاید ہی تبدیل ہوئی ہو۔"

یہ کہہ کر وہ ان کے پیچھے ہو لی۔

"آؤ دروازہ کھولو مسز چیڈوک۔ میں کمرے کو ایک نظر دیکھ تو لوں۔"

آخر دروازہ کھلا اور واقعی اندر سے عجیب گھٹی ہوئی اور سیلی سیلی بو آئی۔ سر رچرڈ کھڑکی کی طرف گئے اور جلدی سے چٹخنی گرا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ یہ کمرہ مکان کے اس سرے پر تھا جس میں بہت کم تبدیلیاں ہوئی تھیں اور بلوط کے عظیم درخت سے کسی حد تک چھپا ہوا تھا۔

"آج اسے بالکل صاف کر دو چیڈوک، اور میرا پلنگ وغیرہ شام سے پہلے ہی یہاں لے آؤ اور کلموز کے پادری کو میرے پرانے کمرے میں ٹھہرا دینا۔"

"معاف کیجئے گا سر رچرڈ" ایک نئی آواز نے گفتگو کو قطع کرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں گے؟"

سر رچرڈ نے مڑ کر دیکھا۔ ایک شخص سیاہ کپڑوں میں ملبوس دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔

"میں اس بے جا مداخلت پر آپ سے چشم پوشی کی درخواست کروں گا سر رچرڈ۔ آپ نے غالباً مجھے نہیں پہچانا ہو گا۔ میرا نام ولیم کروم ہے اور میرے دادا آپ کے دادا کے دور میں اس علاقے کے پادری تھے۔"

"بہت خوب" سر رچرڈ نے کہا۔ "کروم کا نام ہمیشہ کاسٹر نگھم کے لیے ایک پاسپورٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے اس دوستی کی تجدید سے خوشی ہے جو تین پشتوں سے قائم ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ آپ کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بڑی جلدی میں ہیں۔"

"آپ کا قیاس درست ہے جناب۔ میں نارروچ سے آ رہا ہوں اور بری سینٹ ایڈمنڈ جانے والا ہوں۔ راہ میں اس لیے ٹھہرا ہوں کہ آپ کو کچھ ضروری کاغذات دے دوں۔ یہ کاغذات میرے دادا نے چھوڑے تھے۔ میں نے سوچا کہ آپ شائد ان میں سے کچھ خاندانی نوعیت کے معاملات پڑھنے سے دلچسپی لیں۔"

"آپ کا بہت شکریہ مسٹر کروم، اور اگر آپ کچھ دیر توقف کریں تو بیٹھک میں چل کر اکٹھے کچھ پئیں۔ اس اثناء میں ہم دونوں ان کاغذات کو ایک نظر دیکھ لیں گے۔ اور مسز چیڈوک، تم اس کمرے کو صاف کرانے کا بندوبست کرو...... یہ ٹھیک ہے کہ اسی کمرے میں میرے دادا فوت ہوئے تھے...... اور یہ بھی درست ہے کہ اس درخت کے سائے کی وجہ سے جگہ کچھ مرطوب سی ہو گئی ہے...... لیکن میں اس قسم کی اور باتیں سننا نہیں چاہتا۔ مہربانی سے مجھے خائف کرنے کی کوشش مت کرو۔ اب تم جاؤ اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو...... کیا آپ میرے ساتھ آئیں گے جناب؟"

وہ دونوں مطالعہ گاہ میں پہنچے۔ نوجوان مسٹر کروم جو پلندہ لائے تھے۔ اس میں مرحوم پادری نے سر میتھیو فیل کی موت کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اور سر رچرڈ کو پہلی بار انجیل سے فال نکالنے کے معاملے سے سابقہ پڑا جس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان باتوں میں انہوں نے خاصی دلچسپی لی۔

"ہاں تو" انہوں نے کہا۔ "میرے دادا مرحوم کی انجیل نے بڑی عمدہ نصیحت کی ہے...... اسے کاٹ ڈالو۔ اگر اس کا اشارہ بلوط کے درخت کی طرف ہے تو انہیں مطمئن رہنا چاہیے کہ میں اس کام کو نظر انداز نہیں کروں گا۔ ایسا نزلے اور بخار کا گھر تو کبھی دیکھنے میں نہ آیا ہو گا۔"

بیٹھک میں کئی خاندانی کتابیں موجود تھیں جو تعداد میں بہت زیادہ نہیں تھیں۔ سر رچرڈ نے اٹلی میں ایک ذخیرہ جمع کیا تھا۔ مگر ان کے لیے ایک خاص کمرہ بنانے کے پروگرام پر تاحال عمل نہیں ہوا تھا۔

سر رچرڈ نے کاغذات سے نظر اٹھا کر کتابوں کی الماری کی طرف دیکھا۔

"دیکھیں" انہوں نے کہا۔ "آیا وہ پرانی پیشین گوئی اب بھی یہیں ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کہ وہ اب بھی انہیں کچھ بتا سکتی ہے۔"

وہ اٹھے اور ایک ضخیم انجیل نکال لائے جس کے سرورق پر اب بھی تحریر تھا: "میتھیو فیل کیلئے، اس کی پیار کرنے والی دیٹی ماں، این آلڈس کی طرف سے۔ ۲ ستمبر ۱۹۵۹ء"

"اسے اگر پھر آزمایا جائے تو کیسا رہے، مسٹر کروم؟ لیجئے میں اسے کھولتا ہوں۔ ہوں! یہ کیا نکلا ہے؟ "تو صبح کو مجھے تلاش کرے گا لیکن میں نہیں ہوں گا۔" بہت خوب! آپ واو اس سے بڑی عمدہ فال لیتے۔ ٹھیک ہے نا؟ لیکن مجھے کسی فال کی ضرورت نہیں! یہ سب قصہ کہانی کی باتیں ہیں۔ بہر حال مسٹر کروم، میں ان کاغذات کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے خیال ہے کہ آپ جلدی جانا چاہتے ہیں۔ اجازت دیجئے کہ آپ کو ایک گلاس اور پیش کروں۔"

اس قسم کی مہمان نواز فضا میں 'جو واقعی بے لوث تھی (کیونکہ سر رچرڈ نوجوان مہمان کے مرتبے اور حقوق سے واقف تھے) وہ ایک دوسرے سے وداع ہوئے۔

سہ پہر کو متوقع مہمان آگئے جن میں کلمور کا پادری، لیڈی میری ہروی، سر ولی کینفیلڈ وغیرہ شامل تھے۔ پانچ بجے شام کا کھانا ہوا۔ پھر شراب، تاش اور رات کے ہلکے طعام کا دور چلا اور سب سونے کے لیے منتشر ہو گئے۔

اگلی صبح سر رچرڈ نے سب کے ساتھ اپنی بندوق اٹھانے سے تامل کیا۔ وہ کلمور کے پادری سے گفتگو کرتے رہے۔ یہ پادری 'اپنے زمانے کے کئی آئرستانی پادریوں کے برعکس' اس علاقے کی سیر کر چکا تھا اور کافی عرصے تک قیام بھی کر چکا تھا۔ اس صبح جب دونوں باغیچے کی گذرگاہ پر ٹہلتے ہوئے مکان کی ترمیم اور تبدیلی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو پادری نے مغربی کمرے کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"آپ میرے آئرستانی گروہ میں سے کسی بھی شخص کو اس کمرے میں سونے پر آمادہ نہیں کر سکتے، سر رچرڈ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، میر محترم؟ یہ تو میرا کمرہ ہے۔"

"خوب 'لیکن ہمارے آئرستانی دہقان تو ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ بلوط کے درخت کے قریب سونا نحوست لاتا ہے اور آپ کے قریب تو خوب پھولا پھلا ہوا بلوط کا درخت ہے جو آپ کے کمرے کی کھڑکی سے بمشکل دو گز کے فاصلے پر ہو گا۔ شاید" پادری نے مسکرا کر کہا۔ "یہ آپ کو اپنی عفت کا کرشمہ پہلے ہی دکھا چکا ہو گا کیونکہ آپ کی حالت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ گزشتہ رات کی نیند کے بعد تر و تازہ نظر نہیں آ رہے، جیسا کہ آپ کے دوست آپ کو دیکھنا پسند کرتے۔"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے جناب، میں بارہ بجے سے غالباً چار بجے تک ہی سویا ہوں گا۔ لیکن یہ درخت کل ضرور کٹ جائے گا، لہٰذا مجھے اس کے متعلق کچھ اور سننا ہی نہیں پڑے گا۔"

"مجھے آپ کا ارادہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے۔ تازہ ہوا تو اتنے گنجان پتوں سے چھن کر مشکل ہی سے آسکتی ہے اور آپ یہاں سانس لیتے رہے ہیں۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں، جناب۔ لیکن گزشتہ رات تو میں نے یہ کھڑکی بند ہی رہنے دی تھی۔ کچھ شور سا ہوتا رہا جس سے مجھے نیند نہ آئی۔ شاید ٹہنیاں کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتی رہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہو گا سر رچرڈ۔ یہاں سے دیکھیے۔ قریب ترین شاخیں بھی آپ کی کھڑکی سے نہیں چھو سکتیں تاوقتیکہ آندھی نہ چل رہی ہو اور گذشتہ رات ایسی کوئی بات نہ تھی۔ یہ شاخیں کم از کم ایک فٹ پرے رہتی ہیں۔"

"نہیں تو 'لیکن ٹھیک ہے جناب۔ تو پھر وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جس نے کھڑکی پر خراشیں ڈالیں اور اسے کھٹکھٹایا' اور کھڑکی کی چوکھٹ پر دھول ڈالی جس پر لکیریں اور نشان ہیں؟"

آخر کار دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ چوہے عشق پیچاں کی بیل کے ذریعے اوپر چڑھ آئے ہوں گے۔ یہ پادری کا خیال تھا جس پر سر رچرڈ اچھل پڑے۔

دن بڑے آرام سے گزرا اور رات ہوئی۔ سب لوگ سر رچرڈ کو شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اور اب ہم ان کے سونے کے کمرے میں ہیں۔ روشنی بجھ چکی ہے اور وہ اپنے بستر میں ہیں۔ چونکہ یہ کمرہ باورچی خانے کے اوپر ہے، اور باہر ہوا ساکن اور گرم ہے اس لیے کھڑکی کھلی ہے۔ پلنگ کے قریب بہت ہی کم روشنی ہے۔ لیکن وہاں ایک عجیب سی حرکت ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر رچرڈ اپنا سر تیزی سے ادھر اُدھر ہلا رہے ہیں اور مدھم سی آواز آ رہی ہے۔ نیم تاریکی اس قدر مغالطہ خیز ہے کہ آپ اب یہ قیاس کریں گے کہ ان کے کئی سر ہیں گول اور بھورے جو پیچھے اور آگے کی طرف، حتیٰ کہ نیچے ان کی چھاتی کی جانب حرکت کر رہے ہیں۔ یہ منظر بڑا وحشتناک ہے۔ کیا یہ کوئی اور چیز تو نہیں ہے؟ یہ لیجئے۔ کوئی چیز نیچے فرش پر ہلکی سی آواز کے ساتھ گری 'جیسے بلی کودتی ہے، اور تیزی سے کھڑکی کے راستے باہر نکل گئی۔ پھر اسی طرح ایک اور...... حتیٰ کہ چار...... اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"تو صبح کو مجھے تلاش کرے گا۔ لیکن میں نہیں ہوں گا۔"

مسٹر میتھیو کی طرح سر رچرڈ بھی اپنے بستر میں مردہ اور سیاہ پائے گئے!

جب یہ خبر پھیلی تو زرد رو اور خاموش مہمان اور ملازم کھڑکی کے نیچے جمع ہو گئے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، قیاس آرائیوں میں اطالوی زہر خوران، پوپ کے سازشی اور گندی ہوا وغیرہ کا ذکر آیا۔ کلمور کے پادری نے درخت کی طرف دیکھا، جس کے نچلے حصے میں ایک دوشاخ پر ایک بلی جھکی ہوئی درخت کے تنے میں بنے ہوئے سوراخ میں جھانک رہی تھی 'جیسے وہ درخت کے اندر کسی چیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی ہو۔

اچانک وہ اٹھی اور گردن مزید آگے بڑھائی۔ اتفاقاً تنے کی چھال کا وہ حصہ جس پر وہ کھڑی

Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

تھی۔ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے گر گیا اور اس کے ساتھ ہی بلی بھی پھسل کر اس سوراخ میں جا پڑی۔ گرنے کی آواز سن کر ہر شخص نے اوپر کی طرف دیکھا۔

ہم میں سے اکثر لوگ یہ جانتے ہیں کہ بلیاں روتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جیسی آواز بلوط کے تنے سے آئی بہت ہی کم لوگوں نے سنی ہو گی۔ دو یا تین تیز چیخوں کی آواز سنائی دی اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی گتھم گتھا ہو رہا ہو۔ لیڈی میری ہروی کو تو وہیں غش آ گیا اور گھر کی منتظمہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بھاگی لیکن باغیچے کی گذرگاہ تک پہنچ کر گر پڑی۔

کلمور کا پادری سر ولیم کیتھفیلڈ وہیں کھڑے رہے۔ اگرچہ یہ صرف ایک بلی کے چیخنے کی آواز تھی۔ اس کے باوجود وہ بھی کسی حد تک سہم سے گئے تھے۔ سر ولیم نے دو ایک دفعہ جیسے کچھ لگنے کی کوشش کی اور کہا:

"معلوم ہوتا ہے کہ اس درخت کے اندر ہمارے عمل سے کچھ زیادہ ہی اہم معاملہ در پیش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا پتہ چلاؤں۔"

اور وہ اس پر متفق ہو گئے۔ ایک سیڑھی لائی گئی اور ایک مالی نے اس پر چڑھ کر نیچے سوراخ میں جھانکا لیکن اسے صرف اتنا ہی نظر آیا کہ کچھ ہل رہا ہے۔ ایک لالٹین منگوائی گئی تا کہ اسے ایک رسی سے درخت کے کھوکھلے تنے میں لٹکایا جائے۔

"ہمیں اس کھوہ کی تہ میں دیکھنا چاہیے۔ میری زندگی بے شک چلی جائے میرے آقا لیکن ان وحشت ناک موتوں کا راز ضرور یہیں ہے۔"

مالی لالٹین لے کر پھر سیڑھی پر چڑھا اور اسے بڑی احتیاط سے سوراخ میں لٹکانے لگا۔ وہ سوراخ پر جھکا۔ زرد روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اچانک اس کے چہرے پر دہشت و کراہت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ خوفناک آواز سے چیختا ہوا سیڑھی سے گر پڑا۔ خوش قسمتی سے دو آدمیوں نے اسے دبوچ لیا۔" لالٹین چھوٹ کر درخت کے سوراخ میں گر گئی۔

وہ بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک اس کے منہ سے ایک بھی لفظ نہ نکل سکا۔

اتنے میں انہوں نے ایک اور چیز دیکھی۔ لالٹین غالباً گرتے ہی ٹوٹ گئی تھی' جس سے اندر پڑے سوکھے پتوں کو آگ لگ گئی۔ چند منٹ بعد سیاہ دھواں اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دیا اور پھر شعلے لپکنے لگے۔ آگ کے شعلوں نے بلوط کے درخت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

تماشائیوں نے کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے ایک بے ترتیب سا حلقہ بنا لیا۔ سر ولیم اور پادری نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ وہ کچھ ہتھیار وغیرہ لے آئیں کہ آگ سے مجبور ہو کر درخت کے اندرونی چھت سے نکلنے والے موذیوں کے خلاف استعمال کئے جا سکیں۔

اور ایسا ہی ہوا۔ پہلے تو درخت کے دو شاخہ پر انہیں آگ سے لپٹی ہوئی ایک گول سی چیز نظر آئی جو انسانی سر کے برابر تھی۔ وہ ایک دم برآمد ہوئی

سے واپس گر پڑی۔ اسی طرح پانچ چھ مرتبہ یہ عمل دہرایا گیا۔ پھر ایک اسی قسم کا گیند سا ہوا میں اچھلا اور گھاس پر آ رہا۔ جہاں وہ ایک لمحے کے بعد ہی ساکت ہو گیا۔ پادری نے ہمت سے کام لے کر اس کے قریب تر جا کر دیکھا۔ ایک عظیم الجثہ زہریلی مکڑی کا پژمردہ لاشہ تھا! جب ذرا آگ دھیمی ہوئی تو اس قسم کے اور بھی کئی وحشت ناک جسم بلوط کے درخت کی کھوہ سے نکلنے شروع ہوئے۔ ان کے بال بھورے تھے۔

سارا دن درخت جلتا رہا اور لوگ اس کے گرد کھڑے رہے۔ وقتاً فوقتاً باہر نکلنے والی مکڑیوں کو مار دیا جاتا۔ حتیٰ کہ ان کا سلسلہ بند ہو گیا اور انہوں نے پاس جا کر درخت کی جڑوں کا احتیاط سے جائزہ لیا۔

کلمور کے پادری کا کہنا ہے کہ اس کے نیچے زمین میں ایک گہرا گڑھا تھا جہاں اسی قسم کے تین چار لاشے پڑے تھے جن کی موت غالباً دھوئیں سے گھٹ کر واقع ہوئی تھی۔ اور جس چیز سے زیادہ تعجب ہوا وہ یہ تھی کہ گڑھے میں ایک طرف ایک انسانی ڈھانچہ جھکا ہوا کھڑا تھا جس کی ہڈیوں پر سوکھی ہوئی جلد مڑھی تھی اور کچھ سیاہ بال بھی نظر آ رہے تھے۔ اس ڈھانچے کا معائنہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ وہ ایک عورت کا جسم تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی موت پچاس سال پیشتر ہوئی تھی۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

معلم کا راز

حسن میرے بچوں کا معلم علم و فضل میں یکتا تھا نہایت محنت اور تندہی سے بچوں کو تعلیم دیتا تھا اس میں دیگر معلموں کی طرح رعونت اور خود پسندی نام کو نہ تھی اس لئے وہ ہمارے خاندان میں بہت جلد ہر دلعزیز ہو گیا اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی وہ دبلا پتلا لمبے قد کا آدمی تھا اس کا رنگ بالکل سرسوں کے پھول کی طرح زرد تھا چہرے کے خدوخال جو کسی زمانے میں موزوں اور دلفریب ہوں گے بجھ چکے تھے گال پچکے ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی لاغری کی وجہ سے پیشانی حد سے زیادہ چوڑی اور کان بہت لمبے لمبے دکھائی دیتے تھے مگر ان تمام نقائص کے باوجود اس کے چہرے پر ملاحت ضرور تھی۔ بچے اس سے محبت کرتے تھے وہ بھی بچوں کو دل سے چاہتا تھا جہاں اس میں یہ سب خوبیاں تھیں وہاں ایک عیب بھی تھا وہ یہ کہ قمری مہینے کے آخری تین چار دن د
ضرور رخصت پر گزارتا۔

جب وہ رخصت کے دن گزار کر واپس آتا تو اس کی حالت بہت ہی خراب ہوتی شکل و صورت
بھی بالکل ڈراؤنی ہو جاتی تھی ہمیں اس کی عجیب و غریب عادت اور بد تر حالت پر تعجب ہوا کرتا۔

ساون کا مہینہ تھا میری ملازمہ صبح سویرے وضو کرنے باہر نل پر گئی اس نے دیکھا کہ عش
پیچاں کی بیل کے نیچے ایک کالا پھن دار سانپ رینگتا ہوا جا رہا ہے ملازمہ نے شور مچایا اس کی آواز
دوسرے ملازم لاٹھیاں لے کر آپہنچے لیکن اتنے عرصہ میں سانپ نوکروں کے گھروں سے آگے بڑ
کر حسن کے کمرے کی طرف چلا گیا اور ایک روزن کے ذریعے اس میں داخل ہو گیا۔

حسن کا کمرہ مقفل تھا کیونکہ اسے رخصت پر گئے دوسرا دن تھا اب اگر سانپ کو یونہی چھو
جاتا تو خطرے سے خالی نہ تھا اس لئے یہ صلاح ٹھہری کہ قفل توڑ کر سانپ کو مار دیا جائے قفل تو
جب اندر داخل ہوئے تو ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی حسن چارپائی پر اوندھے منہ پڑا تھا

Uploaded By Muhammad Nadeem ندیم
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے منہ سے کف جاری تھا اس کا داہنا ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا جسے سانپ نے ابھی کاٹا تھا۔

سانپ مار دیا گیا اور حسن کو ہم نے ہسپتال میں داخل کرا دیا حسن کے متعلق لوگوں کو بڑی الجھن تھی مگر وہ جلدی صحتیاب ہو گیا آخر حسب معمول وہ چوتھے دن اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا اس نے کسی بات کا جواب نہ دیا لیکن جب میں نے زیادہ مصر ہو کر اس عجیب و غریب راز سے آگاہ ہونا چاہا تو وہ بولا یہ ایک بڑی اندوہناک داستان ہے جو میں بچوں کے سامنے بیان نہیں کر سکتا کیونکہ وہ شاید اس راز سے آگاہ ہو کر ڈر جائیں اور مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔

رات کا وقت تھا آم کے درخت پر کوئل اپنی دردناک آواز میں کوک رہی تھی حسن ایک تخت پر بیٹھا اپنی داستان سنا رہا تھا۔

"میرا نام حسنات احمد ہے ریاست جموں کے موضع اکھنور کا رہنے والا ہوں میرے دادا گاؤں کے چودھری تھے ہماری کاشتکاری وسیع پیمانے پر ہوتی تھی میرا باپ بچپن ہی میں فوت ہو چکا تھا دادا ہی میرے اور میری بیوہ ماں کے کفیل تھے میرے چچا تحصیلدار تھے دادا کو میرے باپ سے بہت محبت تھی اور مجھے ان کی نشانی سمجھ کر چاہتے تھے میرے چچا کی ایک لڑکی تھی جس کا نام سکینہ تھا یہ مجھ سے چار سال چھوٹی تھی۔

ہمارا مکان موضع اکھنور سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک فردوس نما خطہ ارضی میں واقع تھا جس کے اردگرد کئی ایکڑ زمین ہماری ملکیت تھی ہمارا مکان بہت وسیع اور شاہانہ طرز کا بنا ہوا تھا اس میں کئی ایک ڈیوڑھیاں غلام گردشیں وغیرہ اور آڑے ترچھے کمرے بنے ہوئے تھے۔

مکان کے اردگرد ہمارا شاندار باغ تھا جو کئی بیگھوں میں پھیلا ہوا تھا اس میں جابجا چھوٹی چھوٹی نہریں جاری تھیں جو پاس کی ایک پہاڑی ندی سے کاٹ کر لائی گئی تھیں باغ سے آگے نکل کر ایک عظیم الشان ارضی میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی زعفران اور دھان کے کھیت ہوا میں لہراتے دکھائی دیتے تھے دائیں بائیں ہار سنگار کے درختوں کا سلسلہ میلوں تک چلا گیا تھا۔ پچھواڑے کی طرف ندی کے کنارے میرے دادا نے ایک کنال زمین میں بانس کے درخت لگوا رکھے تھے۔ یہ خوبصورت درخت اتنے گھنے اور سرسبز تھے کہ تھوڑی سی زمین بانسوں کا اچھا خاصہ جنگل معلوم ہوتی تھی۔

اس عالیشان گھرانے میں میں اور سکینہ ہی صرف دو بچے

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem

اور بچپن کی اس بستی میں پرورش پا رہے تھے۔ میری اور سکینہ کی آپس میں بڑی محبت تھی۔ ہم دونوں کی تعلیم کے لئے ایک معلم کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جب میں نے جموں جا کر مڈل کا امتحان دیا میری عمر سولہ سال کی تھی۔ جب نتیجہ نکلا تو سب لڑکوں میں میرا نمبر اول تھا۔ اب چچا کی رائے تھی کہ مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے جموں بھیج دیا جائے۔

میرے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مجھے اپنے عزیز و اقارب اور خصوصاً سکینہ کی جدائی بہت شاق تھی۔ میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ سکینہ بھی بہت مغموم نظر آتی تھی میری اور سکینہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی وہ یہ بسور رہی تھی کہ .... میں بھیا کو نہ جانے دوں گی دادا اس کو دلاسا دے رہے تھے۔ میں خود پریشان تھا۔ مگر میں نے بڑے ضبط سے کام لیا اور بادل ناخواستہ ان لوگوں سے رخصت ہوا۔

دو سال گزر گئے۔ میں کئی دفعہ چھٹیوں میں گھر آیا۔ مگر سکینہ سے ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ اکثر ایسا اتفاق ہوتا رہا کہ اس موقع پر یا تو وہ ننہال گئی ہوتی یا اپنے باپ کے پاس اودھم پور۔

آخر جب میں میٹرک کا امتحان دے کر گھر آیا تو سکینہ وہاں موجود تھی اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ دو سال کے قلیل عرصہ میں وہ کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ اب وہ بجائے ایک معصوم اور شوخ لڑکی کے ایک سنجیدہ اور شرمیلی دوشیزہ تھی۔ وہ حسن اور رعنائی کا شاداب پھول تھی۔ اس کی چشم غزالیں میں غضب کا جادو تھا۔ نقش بھی بہت دلکش تھے۔ بوٹا سا قد اور گدرایا ہوا بدن محشر بپا کر رہا تھا۔ اس کے لاثانی حسن میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ جس سے میں مسحور ہو گیا۔ اور مجھے اس کو مخاطب کرنے کی جرات نہ ہو سکی۔

وہ نگاہیں نیچی کئے خاموش بیٹھی تھی لیکن کبھی کبھی کنکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتی۔ و
بہت خوش معلوم ہوتی تھی اس کے گال تمتما رہے تھے۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے کی متمنی تھی۔ مگ
باوجود انتہائی کوشش کے میں زبان نہ ہلا سکا۔ چند دنوں میں ہماری ہچکچاہٹ دور ہو گئی اور میں محسو
کرنے لگا کہ سکینہ میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہے۔

ایک دن دوپہر کے وقت میں باہر مردانے میں سو رہا تھا میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ دادا اور
ایک طرف بیٹھے کچھ باتیں کر رہے تھے دادا کہہ رہے تھے۔ بیٹا اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں جانے کس وقت وعدہ پورا ہو جائے۔ مجھے حسرت ہے کہ حسنات کا سہرا دیکھ لوں۔"

"ابا جان میرا ارادہ ہے کہ حسنات کو اعلیٰ تعلیم دلواؤں۔ اگر ابھی اس کی شادی کر دی گئی تو

سے محروم رہ جائے گا۔ دوسرے سکینہ بھی نادان ہے۔ تین چار سال کوئی بڑی بات نہیں۔" چچا بولے۔

"اس سکینہ سے میری شادی؟" میری رگ رگ میں شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر آنکھیں بند کئے چپکا پڑا رہا۔ دادا اور چچا دیر تک اس امر پر بحث کرتے رہے۔

خوشی کے دن چشم زدن میں گزر جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا انٹرنس پاس کرنے کے بعد مجھے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ اب میرے اور سکینہ کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن چند ماہ بعد اس کے خط دیر سے آنے لگے۔ اور پھر رفتہ رفتہ بالکل بند ہو گئے۔

گرمی کی چھٹیوں میں جب میں گھر آیا تو وہ مجھے ملی۔ مگر بہت سرد مہری سے۔ اس کی بے رخی پر میں بہت حیران تھا۔ لیکن اس کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

دن گزر چکا تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ ہار سنگار کے درختوں پر سورج کی آخری کرنیں پڑنے سے تمام جنگل شعلہ جوالہ بن رہا تھا۔ سکینہ باغ کے سرے پر دیوار کے قریب کھڑی تھی ہار سنگار کے نارنجی پھولوں کا عکس اس کے رخ زیبا پر عجیب بہار دیتا تھا۔ وہ جنگل کا پر کیف نظارہ دیکھنے میں محو تھی۔ اس کی گود میں ہرن کا ایک ننھا سا بچہ تھا اور ہاتھ میں شیشے کی بوتل تھی۔ جس سے وہ ہرن کے بچے کو دودھ پلایا کرتی تھی۔

اس وقت اس کا حسن حوران بہشت کو مات کر رہا تھا مجھ سے نہ رہا گیا دبے پاؤں اس کے پاس جا کھڑا ہوا "............ سکینہ ...." میں نے کہا۔

سکینہ میری طرف دیکھے بغیر بولی "حسن دیکھو کیسا اچھا سماں ہے۔"

"لیکن تم سے زیادہ حسین نہیں۔" میں نے کہا۔

"ایسی بیہودہ باتیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"میں دیکھتا ہوں کہ میرے ساتھ تم بہت بے اعتنائی سے پیش آتی ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔" سکینہ بولی۔

"نہیں، اس سے پہلے تمہیں میرے ساتھ بہت محبت تھی۔"

"محبت سے کس کو انکار ہے۔" سکینہ نے کہا۔ "خون کی محبت تو قدرتی ہوتی ہے مگر تم اس محبت کو اور ہی رنگ دینا چاہتے ہو۔"

سکینہ کے منہ سے یہ باتیں سن کر مجھے رنج ہوا [illegible] کھانا نہ کھایا اور چار

پائی پر پڑا رہا۔ چاندنی رات تھی ہوا کے نرم اور خوشگوار جھونکے راحت پہنچا رہے تھے۔ باغ کا چپہ چپہ خوشبو میں بسا تھا۔ سب دنیا محو خواب تھی۔ مگر مجھے نیند کہاں میں بے چینی سے کروٹیں لے رہا تھا۔

بارہ بجے کے قریب مجھے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو صحن کی باڑ کے پیچھے سایہ دکھائی دیا۔ میں بہت حیران تھا کہ آدھی رات کو گھر سے باہر کون جا رہا ہے آخر کھوج لگانے کے لئے اٹھا اور درختوں کے سائے میں اپنے آپ کو چھپاتا چپ چاپ تعاقب میں روانہ ہوا۔

جانے والا بہت دھیمی چال سے چل رہا تھا جب میں اس کے کچھ قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ سکینہ ہے وہ بانس کے جنگل کے قریب جا کر رک گئی اور میں ایک درخت کے پیچھے اسے چھپ کر دیکھنے لگا۔ اتنے میں بانس کی ڈالیاں ہٹیں اور ایک نوجوان جس کے مقابلے میں چاند کا حسن بھی پھیکا تھا نکلا اور اس کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

"او سکینہ آج کئی دن کے بعد تم سے ملاقات ہوئی۔"

"رفیق میں آج آخری دفعہ تمہیں ملنے آئی ہوں۔" سکینہ بولی۔

"سکینہ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔" نوجوان نے کہا۔

سکینہ بولی۔ "میں مجبور ہوں۔ کیونکہ میں عنقریب اپنے چچا کے لڑکے سے بیاہی جانے والی ہوں۔ اور میرے والدین کی یہی مرضی ہے۔"

"اچھی سکینہ دل شکن باتیں زبان سے نہ نکالو۔ اور بتاؤ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟"

"اگر محبت نہ ہوتی تو رات کے وقت ایسی جگہ کیا کرنے آتی۔"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ آخر کار کچھ دیر کے بعد وہ واپس آ گئی۔ مجھے سکینہ سے سچی محبت تھی۔ اس لئے میں نے دل سے عہد کر لیا کہ میں اس کی خوشی کو اپنی خواہشات پر قربان نہ کر دوں گا۔

چنانچہ میں اپنے کمرے میں گیا۔ اور دادا کے نام ایک خط لکھا۔

"میں نے سنا ہے کہ میری شادی سکینہ سے ہونے والی ہے اسی وجہ سے میں گھر چھوڑ رہا ہوں میں لکیر کا فقیر نہیں ہوں کہ آپ کے دقیانوسی خیالات کے مطابق ایک دیہاتی لڑکی سے شادی کر کے اپنی زندگی تباہ کر لوں"۔

راقم حسنات احمد

یہ خط ایک لفافے میں بند کر کے میں نے اپنے سرہانے رکھ دیا اور خود ایک پرانے دوست کے پاس پشاور چلا گیا۔ جہاں اس نے مجھے ایک پٹھان سردار کی جائیداد کی دیکھ بھال کے لئے تیس روپے ماہوار پر ملازم کرا دیا۔

ایک سال تک میں نے خوب محنت سے کام کیا۔ سردار صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے میرا ارادہ تھا کہ اپنی تعلیم جاری رکھوں انہوں نے مجھے اس کی اجازت دے دی اور نہیں غیر دکا خرچ بھی

ندیم Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اپنے ذمہ لے لیا......... غرضیکہ میں اپنی ڈیوٹی کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کرنے لگا۔

اس واقعہ کو چار سال گذر گئے اب میں بی اے پاس کر چکا تھا۔ شام کے قریب میں قصہ خوانی بازار سے گذر رہا تھا کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں نے دیکھا تو میرے گاؤں کا ایک آدمی تھا۔ میں نے اس سے اپنے عزیزوں کی خیر و عافیت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ چچا مر چکے ہیں اور چار سال کا عرصہ ہوا کہ سکینہ کی شادی رفیق نامی ایک امیر زادے سے ہو گئی ہے جو آج کل اکھنور کے قریب ہی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس نے بتایا۔ کہ داوا کی صحت خراب ہو چکی ہے اور مجھے یاد کر کے اکثر روتے رہتے ہیں۔ چچا کے انتقال کا مجھے از حد صدمہ ہوا۔ اور بوڑھے داوا کی افسوسناک حالت سن کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں گھر چلا آیا۔

مجھے دیکھ کر داوا گویا از سر نو زندہ ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے آوارگی کی وجہ پوچھی تو میں نے سکینہ اور رفیق والا سارا معاملہ انہیں سنا دیا۔ وہ میرے ایثار اور نیک نیتی سے بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھے اشارے سے سکینہ کا وہ عالیشان محل دکھایا جو بار سنگار کے خوبصورت جنگل میں کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔

میرے آنے کی خبر گرد و نواح میں ایک دم پھیل گئی۔ لوگ میری ملاقات کو آنے لگے۔ دوپہر کے قریب سکینہ بھی آئی۔ جسے دیکھ کر میرا دل بجھ گیا۔ اس کا شہابی رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ بالکل ہڈیوں کی مالا بن رہی تھی۔

"آہ سکینہ تمہیں کیا ہوا؟"۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اس کے زرد رخساروں پر ڈھلکتے نظر آئے۔ جنہیں دیکھ کو میرا دل بہت آزردہ ہوا۔ اور مجھے شک ہوا کہ شاید رفیق اس سے بدسلوکی کرتا ہے لیکن سب نے رفیق کی تعریف کی۔

دوسرے دن سکینہ کے گھر میری دعوت تھی۔ میں نے داوا سے عذر کیا۔ کہ رفیق مجھے ملنے نہیں آیا۔ اور شاید ابھی تک مجھے اپنا رقیب خیال کرتا ہے میں وہاں نہ جاؤں گا۔ داوا نے کہا۔ "تمہارا یہ خیال فضول ہے رفیق تو گوشہ نشین آدمی ہے اور شاذ و نادر ہی گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتا ہے"۔

سہ پہر کو میں اور داوا سکینہ کے گھر گئے۔ سکینہ کا مکان ایک ایسے خوبصورت باغ میں بنایا گیا تھا جس کا نظارہ بے حد دلفریب تھا صحن چمن پر بلا کا نکھار تھا۔ سرو و صنوبر کے خوشنما درخت اپنی موزوں

قامتی پر مغرور نہایت شان و شوکت سے ایستادہ تھے۔ باغ کی کانٹ چھانٹ کسی کاریگر کے کمال کی شاہد تھی۔ سمنٹوں حوضوں میں دلآویز فوارے چھوٹ رہے تھے چمن پھولوں سے پٹے ہوئے تھے۔ دلربا کشادہ روشوں کے گرد لالہ زار کھلا تھا۔ مکان اپنی انوکھی طرز تعمیر اور قیمتی فرنیچر اور دیگر آرائشی سامان کے لحاظ سے بالکل قصر شاہی معلوم ہوتا تھا۔

سکینہ نے مجھے اپنے مکان کا کونہ کونہ دکھایا پھر رفیق سے ملاقات ہوئی۔ در حقیقت رفیق نہایت ملنسار اور خلیق آدمی تھا۔ اس مختصر ملاقات ہی سے میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اور اس دن سے روزانہ سکینہ کے گھر جانے لگا۔ مجھے رفیق کے بغیر چین ہی نہ آتا تھا۔ انہیں ایام میں سکینہ کے طرز عمل سے مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے ناخوش ہے مجھے تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی افسردہ کیوں رہتی ہے مگر یہ راز کھل نہ سکا۔

رفیق تنہائی پسند تھا سوائے چند خاص آدمیوں کے کسی سے میل جول نہ رکھتا تھا علاوہ خوبیوں کے اس میں دو نقص بھی تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ موسیقی سے سخت نفرت کرتا تھا دوسرے درویشوں اور سیناسیوں کا سخت ترین دشمن تھا۔ سو یہ وجہ کوئی ایسی اہم نہ تھی کہ سکینہ کی رنجیدگی کا باعث ہوتی میں اکثر خیال کرتا شاید سکینہ کو مجھ سے بچھڑ جانے کا غم ہے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ اپالو دیوتا کی نورانی کشتی فلک کے نیلگوں سمندر کے عین منجدھار میں پہنچ چکی تھی۔ اس کی فیض رسانی سے کائنات کا ذرہ ذرہ سیل نور میں غرق ہو رہا تھا۔ یہ جاں فزا سماں دیکھ کر فرط انبساط سے دل کی کلی خود بخود کھل رہی تھی لیکن رفیق کو ان نیرنگیوں سے کچھ لگاؤ نہ تھا۔ وہ اپنے پر تکلف کمرے میں آتشدان کے قریب ایک صوفے پر بڑے وقار سے بیٹھا تھا۔ سامنے ایک سیاہ آبنوسی میز پر چند کتابیں پڑی تھیں۔ جن کے مطالعے میں وہ اکثر محو رہتا تھا۔ میں اور سکینہ باغ میں ٹہل رہے تھے پگڈنڈی پر ایک سپیرا جا رہا تھا۔ سکینہ نے سانپ کا کھیل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ابھی سپیرے نے بین ہی بجانا شروع کی تھی کہ رفیق بھاگتا ہوا موقع پر پہنچ گیا اور بیچارے سپیرے کو مار مار کر بھگا دیا۔ میں اپنی بے وقوفی پر شرمسار ہو گیا۔ لیکن سکینہ نے بہت برا مانا۔ اور کہا۔ رفیق تمہاری یہ حرکت بہت ہی قابل نفرت ہے تمہیں میری تفریح میں رکاوٹ ڈالنے کا کیا حق ہے چاہے تم ان باتوں کو پسند نہ کرو مجھے تو کھیل تماشے بہت بھاتے ہیں اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے"۔

"پیاری! یہ لوگ بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں حسینوں کا حسن چرا لیتے ہیں نوجوان کو بوڑھا کر دیتے ہیں۔ بہادروں کا خون چوس لیتے ہیں۔ اور عاشقوں کی زندگیاں تباہ کر دیتے ہیں تم کیا جانو ان کا

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

جادو بڑا سخت ہوتا ہے"۔ رفیق نے کہا۔

وہ یہ کہتے ہوئے ہم دونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا جاتا تھا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل خود بخود اس پر مائل ہو رہا ہے سکینہ کو بھی اپنی حرکت پر پشیمانی ہونے لگی۔ وہ بے اختیار اس سے بغلگیر ہو گئی۔ رفیق نے اسے نہایت محبت سے گلے لگایا۔ پھر وہ ہم دونوں کو اندر لے گیا اور بڑی نرمی سے دیر تک نصیحتیں کرتا رہا۔

شام کے قریب جب میں گھر واپس آیا۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا کسی نشے کا خمار اتر رہا ہے کسلمندی سے میرا بدن چور ہو رہا تھا میں بستر میں پڑ کر اپنی حالت پر غور کرنے لگا کہ کس طرح سکینہ رفیق کی بے جا سختی پر مشتعل ہوئی اور میں بھی بیزار ہوا۔ مگر اس کی ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے ہمارے دل موم کی طرح پگھل گئے۔ شاید وہ ہپناٹزم جانتا ہے یا اس کی آنکھوں میں کوئی شیطانی قوت ہے۔

اس واقعہ کے بعد مجھے رفیق سے نفرت سی ہو گئی لیکن جب اس کے سامنے جاتا دفعتہً میرے سینے میں اس کی محبت کا سمندر موجزن ہو جاتا اور میں ایک پالتو کتے کی طرح اس کے ادنٰی اشاروں پر چلنے لگا۔

ایک دن علی الصبح میں اپنے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک شخص سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ جس سے اس کا چہرہ پوری طرح دکھائی نہ دیتا تھا وہ آتے ہی کہنے لگا۔

"حضور مجھے ایک عرض کرنا ہے کسی تخلیئے کی جگہ پر میری بات سنیئے"۔

یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا کہ میں اس کی درخواست کو رد نہ کر سکا اور اسے ساتھ لئے بانسوں کے جنگل تک چلا گیا۔ اب اس شخص نے منہ سے کپڑا ہٹایا اور میں نے اسے پہچان لیا یہ وہی سپیرا تھا جس کی اس دن رفیق نے گت بنائی تھی۔

سپیرا بولا۔ "حضور میں اس دن والے صاحب کے متعلق چند ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کریں گے"۔

"میں ان کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایران کے جلاوطن امیر زادے ہیں۔ اور میرے چچا کی لڑکی ان سے بیاہی گئی ہے۔" میں نے کہا

"یہ تو میں لوگوں سے سن چکا ہوں لیکن کیا کوئی غیر فطری قوت بھی آپ نے ملاحظہ کی ہے؟

"

"ہاں ان کی آنکھوں میں کوئی کشش ضرور ہے۔ وہ آنکھیں جھپکتے بھی ہیں یا نہیں؟" سپیرا نے پوچھا۔

"اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں نے اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔ مگر تمہیں ان پر کیا شبہ ہے کیا تم انہیں جادوگر سمجھتے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اچھا آج آپ ان کی آنکھوں کا معائنہ کریں میں شام کو پھر حاضر

ہوں گا۔" یہ کہہ کر سپیرا چلا گیا۔

دس بجے کا وقت تھا۔ باد خنک کے تھپیڑے آفت برپا کر رہے تھے میں تیز رفتاری سے چلتا ہوا سکینہ کے مکان میں داخل ہوا۔ اتفاقاً کسی ملازم وغیرہ نے مجھے آتے نہ دیکھا۔ میں دبے پاؤں رفیق کے کمرے میں جا کر پردے کے پیچھے چھپ گیا۔

رفیق اس وقت ایک صوفے پر بیٹھا سگار پی رہا تھا سکینہ کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب ایک چوکی پر بیٹھی سلائیوں سے کچھ بن رہی تھی اس نے بالکل سادہ اور سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے خوبصورت دراز گیسوؤں کو باد تند کے گستاخ جھونکے اس کے حسین چہرے پر بکھیر رہے تھے۔

رفیق بظاہر سگار نوشی میں مشغول تھا۔ مگر اس کی آنکھیں سکینہ کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں دیر تک اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا رہا اور یہ معلوم کر کے کہ درحقیقت رفیق آنکھ نہیں جھپکاتا۔ مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ پھر میں نے سکینہ کو غور سے دیکھا۔ تو وہ غنودگی کی حالت میں بیٹھی تھی۔ گو اس کے ہاتھوں میں سلائیاں تھیں۔ لیکن اس کی انگلیوں میں حرکت مفقود تھی۔ میں یہ سوا س ہو کر چپکے سے باہر نکل آیا۔

شام کے قریب سپیرا مجھے پھر ملا اور کہنے لگا...... "حضور بتایئے کچھ پتہ چلا؟"۔

"ہاں آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ آنکھ نہیں جھپکاتا۔ اب کیا کیا جائے؟" میں نے جواب دیا۔

"حضور میں کوئی اسم پڑھنا چاہتا ہوں۔ کوئی مضبوط سے دروازے کا کمرہ ان کے مکان میں مل جائے۔ تو آپ کو اپنی فقیری کے کمالات دکھاؤں۔ صرف جگہ کی ضرورت ہے خواہ باہر علیحدہ ہی کوٹھڑی ہو۔ لیکن اس قدر نزدیک ہو کہ میری آواز اس کے کانوں تک پہنچ سکے"۔

"کسی نوکر کے گھر میں تو ایسی جگہ آسانی سے مل سکتی ہے۔" میں بولا۔

"لیکن وہاں تو ملازموں کے خلل انداز ہونے کا اندیشہ ہے سپیرا نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ کل شام کو لکھنؤ میں میلہ ہے اور تمام ملازم وہاں جانے والے ہیں میں بولا۔

سپیرا یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اور دوسری شام کو آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا صبح سویرے میں سکینہ کے گھر گیا۔ وہ لوگ ابھی بستروں میں آرام کر رہے تھے۔ میں نوکروں کے گھر دیکھتا بھالتا رہا۔ ان میں ایک کوٹھڑی سپیرے کی ہدایت کے مطابق بہت موزوں تھی اس میں کوئی کھڑکی یا روشندان وغیرہ نہ تھا اور دروازہ بہت مضبوط تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر واپس چلا آیا۔

رات کو بانس کے جنگل میں سپیرا میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم دونوں سکینہ کے مکان کی طرف ہو

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

لئے۔ قمری مہینے کی ستائیسویں رات تھی تاریکی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ سردی کی شدت سے یہ خطہ بے کیف تھا۔ مگر میری پیشانی خوف سے عرق آلود ہو رہی تھی۔

اگرچہ میں نے چلتے وقت احتیاطاً پستول بھر کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ پھر بھی میری ٹانگیں دہشت سے لڑکھڑا رہی تھیں لیکن میں گرتا پڑتا وہاں تک پہنچ گیا۔ یہاں مکمل سکوت تھا۔ رات کے سناٹے میں وہ مکان نہایت ڈراؤنا اور ہیبت ناک معلوم ہوتا تھا۔ گرد و نواح میں بھی ہر طرف خاموشی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ کسی وقت دور کے کسی گاؤں سے کتوں کے بھونکنے کی مدھم سی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہم دونوں کوٹھڑی میں داخل ہوئے سپیرے نے اندر سے کنڈی لگالی۔ پھر اپنے تھیلے سے ایک مٹی کا دیا نکال کر جلایا اور کوٹھڑی کے عین مرکز میں زمین کو گیلی مٹی سے لیپ کر اس کے گرد دائرہ کھینچا اور ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔

میں چپ چاپ اس کی حرکات دیکھ رہا تھا اس کے بعد اس نے ایک خوشبودار مصالحہ سا سلگا دیا۔ اور ایک عجیب قسم کے ساز پر کسی خاص زبان میں کچھ گانا شروع کیا۔ اور پندرہ بیس منٹ تک یہی راگ الاپتا رہا۔ یکایک دروازے پر زور سے دھکا لگا۔ اور ساتھ ہی رفیق کی نہایت کرخت آواز سنائی دی

"یہاں کون مردود طوفان بدتمیزی مچا رہا ہے۔ جلدی دروازہ کھولو"۔

میں کانپ اٹھا مگر سپیرے نے کچھ پروا نہ کی۔ وہ اپنے کام میں مشغول رہا دروازے پر زور زور سے دھکے پڑ رہے تھے اور رفیق گلا پھاڑ پھاڑ کر گالیاں دے رہا تھا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا جب اسے دروازے کو توڑنے میں مایوسی ہوئی تو تنگ آ کر کہنے لگا۔ "اگر تم دروازہ نہ کھولو گے تو میں کوٹھڑی کو آگ لگا دوں گا۔ اور تم جل بھن کر خاک ہو جاؤ گے" سپیرے پر اس دھمکی کا بھی اثر نہ ہوا۔ البتہ اس نے ساز رکھ دیا اور بین اٹھا کر بجانا شروع کی۔ رفیق کو جب یقین ہو گیا کہ سختی سے کام نہ چلے گا تو گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو"۔

مگر سپیرا اس سے مس نہ ہوا۔ رفیق ہماری ہٹ دھرمی سے مایوس ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگا معلوم ہوتا تھا کہ باہر گھوڑ دوڑ ہو رہی ہے۔

چند منٹ ایسا کرنے کے بعد وہ پھر دروازے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا "ظالم میری بربادی سے تجھے کیا حاصل ہو گا؟"۔

یہ کہتے ہوئے نہایت دردناک آواز میں گریہ وزاری کرنے لگا سپیرا زور شور سے بین بجاتا رہا۔ رفتہ رفتہ رفیق کی آواز بند ہو گئی۔

یکایک میں نے دیکھا کہ سپیرے کی پشت کی جانب کونے میں سے نالی کے ذریعے ایک بے حد موٹا سا پھنیر سانپ اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میری روح فنا ہو گئی لیکن میں نے دل کڑا کر کے اس پر پستول داغ دیا۔ سپیرے کے اوسان خطا ہو گئے۔ بین اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اور چھپے

بیٹھے دیدوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ہاتھ سے سانپ کی طرف اشارہ کیا۔ جب سپیرے نے ادھر دیکھا تو اسے اژدھا دم توڑتا ہوا دکھائی دیا۔ سپیرا سر پیٹ کر بولا۔

"آہ آپ نے ظلم کیا۔"

"تو کیا یہ تمہارا پالتو سانپ تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو رفیق صاحب تھے آہ ان کا بہت برا حشر ہوا"۔ انہوں نے کہا۔

"ہائیں رفیق .... یہ کس طرح؟ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ سپیرا بولا۔ "سانپ جب سو سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اسے اپنی ہیئت تبدیل کرنے پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔" میں اس عجیب و غریب انکشاف پر ہکا بکا سانپ کی طرف دیکھنے لگا اور بعد ازاں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گیا۔ اس نے یک دم اپنی بے نور آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ اور اپنا زخمی سر اٹھا کر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ لیکن کمزوری سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اور وہیں گر کر ڈھیر ہو گیا خون کی باریک سی دھار جو ابھی تک اس کے سر سے نکل رہی تھی میرے ہاتھ پر آ پڑی۔

دوسرے دن رفیق کی گمشدگی کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ دادا نے اس کی بہت تلاش کرائی۔ مگر بے سود۔ آخر کار وہ سکینہ کو اپنے گھر لے آئے۔ اور اس کا مکان مقفل کر دیا گیا وہ رفیق کے راز سے بالکل بے خبر تھی۔ کیونکہ رفیق کی آنکھوں کے جادو کی وجہ سے راتوں کو اکثر وہ بے ہوش سوئی رہتی تھی۔ اس واقعے کو تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ رات کے وقت سکینہ کے مکان میں خدا جانے کس طرح آگ لگ گئی شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔ ہر چند آگ بجھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ تمام دکان معہ باغ اور ہار سنگار کے جنگل کے جل کر بھسم ہو گیا۔

سکینہ کو اپنی بربادی کا بہت صدمہ تھا اور اسی غم سے اس کی صحت خراب ہوتی گئی جب اکھنور کے حکیموں سے فائدہ نہ ہوا۔ تو مجھے جموں کسی قابل ڈاکٹر کو لانے کے لئے جانا پڑا۔

قمری مہینے کی ستائیسویں رات تھی۔ آج رفیق کے انجام کو پورا ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ میں جموں میں دادا کے ایک دوست کے مکان پر سویا۔ صبح مجھے ڈاکٹر کو ساتھ لے کر گھر جانا تھا۔ یکایک میرے ہاتھ سے ایک قسم کی خوشبو آنے لگی۔ جس سے میرا جی متلانے لگا میں نے اپنی طبیعت کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر لاحاصل۔ فوراً ہی بڑے زور سے استفراغ ہوا۔ میں چارپائی کی پٹی پر جھکا ہوا قے کر رہا تھا۔ میرا ہاتھ ذرا نیچا ہوا۔ تو مجھے سخت ٹیس محسوس ہوئی۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا تو ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ آخر میرا بازو شدت درد سے ٹوٹنے لگا میں بے چین ہو

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کر اٹھ بیٹھا۔ اچانک میری نظر کمرے کے فرش پر پڑی تو وہاں سانپ رینگ رہے تھے۔ میں تھرا گیا ایک دردناک چیخ منہ سے نکلی اور میں بے ہوش ہو گیا۔

دو تین دن تک میرا علاج ہوتا رہا۔ جب کچھ آرام ہوا تو میں ڈاکٹر کو لے کر اپنے گھر آگیا۔ دادا نے دیر کی وجہ پوچھی تو میں نے کسی بہانے سے ٹال دیا۔ ایک ماہ بعد جب پھر قمری مہینے کی ستائیسویں رات آئی۔ تو میرے ہاتھ سے خوشبو آنے لگی جس سے میں مدہوش ہو گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ مجھے پھر سانپ نے ڈس لیا ہے۔ دادا نے جب یہ سنا کہ دو مہینے سے متواتر مجھ پر یہ حادثہ گذر رہا ہے تو وہ بہت متفکر ہوئے۔ کئی ڈاکٹروں اور سپیروں سے میرا علاج کرایا گیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اب ہر مہینے کی ستائیسویں رات کو بدستور مجھے سانپ نے کاٹنا شروع کیا۔ سکینہ کو ایک تو اپنا گھر بار تباہ ہو جانے کا قلق تھا۔ دوسرے میری انوکھی بیماری کا رنج، روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ آخر کار چھ ماہ کے اندر اندر بے چاری ناشاد و نامراد اس دنیا سے اٹھ گئی۔

میری بیماری اور سکینہ کی بے وقت موت نے دادا کی کمر توڑ دی اور وہ اسی غم میں دو مہینے کے بعد چل بسے۔ اب اتنے بڑے گھر میں صرف میں تھا یا میری والدہ۔ گو میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا مگر والدہ کا خیال کرتے ہوئے میں نے زمینداری کا کام سنبھال لیا۔

ایک سال تو فصل بہت اچھی رہی لیکن دوسرے سال کھیت میں ایک خاص قسم کی ٹڈی پڑ گئی۔ جس نے فصل کو دیمک کی طرح چاٹ لیا مجھے اس سال بڑا نقصان رہا۔ اور بڑی تگ و دو سے اس بلا کو کھیتوں سے دور کیا گیا۔ دوسرے سال جب فصل پک کر تیار ہوئی۔ تو پھر اسی مصیبت کا سامنا ہوا۔ اس سال مجھے اتنا نقصان ہوا کہ میری زمینداری کا کاروبار بگڑ گیا اور میں مقروض ہو گیا۔

اب ہر سال کھیتوں پر ایسی ہی آفتیں نازل ہونے لگیں رفتہ رفتہ میری حالت یہ ہو گئی کہ میں دیوالیے کی درخواست پر مجبور ہو گیا۔ اور والدہ کو ساتھ لے کو جموں چلا آیا۔ جہاں میں اسکول ماسٹری کرنے لگا۔ لیکن میری اس عجیب و غریب بیماری کا حال سن کر لوگ ہچکچانے لگے کوئی میرے ساتھ چھونا اور بات کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا آخر کار سب بچوں کے والدین نے مل کر درخواست کی ایسا خوفناک شخص استاد ہونے کے قابل نہیں۔ چنانچہ میری ملازمت چھوٹ گئی اور میں محنت و مشقت کر کے اپنا اور اپنی والدہ کا پیٹ پالتا رہا۔

دو سال ہوئے میری والدہ فوت ہو گئی ہے اور میں نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا ہے خوش قسمتی سے آپ کے ہاں ملازمت مل گئی ہے اب ہر قمری مہینے کی آخری راتوں کو بظاہر رخصت پر چلا جاتا ہوں لیکن در حقیقت کہیں جاتا نہیں۔ بلکہ کمرے کو باہر سے مقفل کر کے کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہو جاتا ہوں۔ اور تین چار دن تک یعنی جب تک میری حالت درست نہیں ہوتی کمرے میں پڑا رہتا ہوں۔

چیختی لاشیں

اس پر اسرار دنیا میں بعض لوگوں کو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن کی تفصیل سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے .... میں لوگوں کی انگشت نمائی کے خیال سے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ لیکن بقول چراغ۔ "جب میرے سفید بال اس پر ہول واقعہ کی یادگار میرے پاس موجود ہیں۔ تو پھر کیوں نہ ان کو عوام کے سامنے دہرا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں"۔

.... میرا نام مشتاق احمد اور وطن مالوف مظفر گڑھ ہے میرے والد حکیم تھے۔ ہم دو بھائی بہن تھے۔ میری بہن کا نام ذکیہ تھا۔ وہ مجھ سے چھ سال بڑی تھی۔ مگر بے حد شریر اسے جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے کئی خرگوش اور گلہری کے بچے پال رکھے تھے۔ ہم دونوں بہن بھائی کی آپس میں بہت محبت تھی جب میں ذرا بڑا ہوا تو اس نے اپنی شرارتوں میں مجھے بھی شامل کر لیا۔ وقت گذرتا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی بڑے ہوتے گئے حتیٰ کہ میں نو سال کا ہو گیا۔ اور ذکیہ پندرہ سال کی۔

ہمارا مکان بازار میں تھا جس کی نچلی منزل میں ابا کا مطب تھا اور بالا خانے پر ہماری رہائش تھی۔ بالا خانے کی کھڑکیوں کے قریب باہر کی طرف ابا کے مطب کا سائن بورڈ لگا تھا ایک دفعہ کسی شامت کی ماری چمگادڑ نے اس سائن بورڈ کے پیچھے بچے دیئے۔ اور اتفاقیہ ذکیہ کی نظر ان پر جا پڑی۔ بس پھر کیا تھا وہ اس بچہ کو چھیننے پر آمادہ ہو گئی اس نے اس کام میں مجھے بھی شریک کرنا چاہا۔ مگر میں نے آج سے پیشتر یہ جانور کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لئے ڈر کر انکار کر دیا میرے انکار پر وہ بہت برافروختہ ہوئی۔ اور مجھ سے روٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تاہم اس کی چنچل طبیعت میں سکون کہاں تھا۔ تھوڑی دیر بعد ابا کی چھڑی ہاتھ میں لئے پھر آموجود ہوئی۔ میں اس خیال سے کہ شاید مجھے [illegible]

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem
Uploaded By Muhammad Nadeem
ندیم

گرمیوں کا موسم اور دوپہر کا آتشیں وقت تھا۔ آفتاب سر پر پہنچ چکا تھا۔ درودیوار تپش سے سیاہ ہو رہے تھے۔ ذکیہ کا چہرہ کچھ گرمی اور کچھ غصہ سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ مدت سے کچھ بڑبڑاتی اور مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے گھورتی ہوئی کھڑکی میں ایک ٹانگ باہر کی طرف لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اور جھک جھک کر اس مضبوط چھڑی سے چمگادڑ اور اس کے بچوں کو کچوکے دینے لگی۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ لیکن ان جانوروں کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھی حتیٰ کہ چمگادڑ تنگ آ کر بچوں کو وہیں چھوڑ پروں کو پھڑ پھڑاتی ہوئی اڑی۔ بچے بے چارے بغیر ماں کے سسکنے لگے۔ ذکیہ فوراً آگے بڑھی۔ اور ایک بچے کو اٹھا کر چھوٹے سے پنجرے میں ڈال دیا۔

دن بھر تو وہ چمگادڑ غائب رہی۔ مگر شام ہوتے ہی اپنے گھونسلے میں واپس آ گئی اور بچے کو وہاں نہ پایا۔ تو کھڑکی کے ذریعے کمرے میں گھس کر چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ طاقچے میں پنجرا پڑا تھا۔ وہ بار بار پنجرے پہ جھپٹتی اور ناکام واپس جاتی۔ ذکیہ نے بہت کوشش کی کہ وہ کسی طرح باہر نکل جائے۔ لیکن وہ نہ ٹلی۔ ایک بار جب وہ پنجرے پہ جھپٹی تو ذکیہ نے اس پر اس زور سے چھڑی کا وار کیا۔ کہ چمگادڑ بیدم ہو کر گر پڑی۔ اور ذکیہ نے چھڑی کی مزید ضربوں سے اسے ہلاک کر دیا خدا کی قدرت اسی رات ذکیہ بیماری میں مبتلا ہو گئی اور گیارھویں دن گوشہ قبر میں ....

جا سوئی۔ مجھے اس کی موت کا بے حد صدمہ ہے۔

اس واقعہ کو اٹھارہ سال گذر گئے۔ میرے والدین سفر آخرت کر چکے تھے۔ اب میں خود حکیم تھا۔ مجھے اپنے کام میں خاص دل چسپی تھی۔ اور میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کا بڑا شائق تھا۔ ہمارا پرانا ملازم چراغ اس کام میں میرا معاون تھا۔ چراغ مجھ سے دس سال بڑا تھا۔ ابا نے اس کو یتیم خانے سے لے کر پرورش کیا تھا۔ اور اسے اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے یہ شخص بڑا وفادار تھا۔ اور مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر سینتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اور چراغ کی تقریباً سینتیس سال تھی۔

میں اور چراغ اکثر بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور تیزوں میں مارے مارے پھرا کرتے۔ میں نے کئی نئی بوٹیاں دریافت کیں۔ جن کی عجیب و غریب خاصیت نے میری حکمت کو چار چاند لگا دیئے۔

اسی غرض سے ایک دفعہ میں نے جموں کا [illegible] اس علاقے میں گھومتا پھرتا نئی نئی

بوٹیاں دریافت کرتا ہوا ہوٹ تک جا پہنچا۔ چراغ اس سفر میں بھی میرے ہمراہ تھا اور میرے آرام کا بہت خیال رکھتا تھا۔ میرے پاس تین گھوڑے تھے جن میں سے ایک پر میں خود سوار ہوتا۔ اور باقی دونوں پر سامان باربرداری لادا جاتا۔ چراغ ایک پہاڑی ملازم پچھو کے ہمراہ ہمیشہ پیدل چلا کرتا۔

پچھو قصبہ روہنی کا باشندہ تھا۔ جو رام بن سے دو سو میل جانب غرب ان دشوار اور پر خطر پہاڑوں کے پیچھے تھا جس کی برفانی چوٹیاں آسمان سے ملی ہوئی نظر آتی تھیں۔ دوران سفر میں ایک دن جب کہ جڑی بوٹیوں کا ذکر ہو رہا تھا پچھو نے مجھے بتایا کہ روہنی کے قریب جنگلوں میں ایک پودا ملتا ہے جس کی جڑ کی خوشبو سے شیر مست ہو جاتا ہے۔ پہاڑی لوگ شیر سے بچاؤ کی خاطر اکثر اس جڑ کو اپنے پاس رکھتے ہیں۔

اور اس نے یہ بھی بتایا کہ موضع روہنی سے بیس میل پرے ایک قصبہ باتھری آباد ہے یہ مسلمانوں کی بستی ہے۔ اس گاؤں کے گرد و نواح میں روشنی دینے والے درخت پائے جاتے ہیں اس درخت کو پہاڑی زون کا درخت کہتے ہیں اس کی روشنی سفید اور شفاف ہوتی ہے لوگ اس کی ٹہنیاں کاٹ کر گھروں میں بطور چراغ کے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس علاقہ کے غاروں میں ایک دھواں نکلنا شروع ہو جاتا ہے اور گرد و پیش کئی کئی گز تک دھند چھا جاتی ہے لیکن قریب ہی بھوتوں کا ایک قصبہ آباد ہے۔ گو ان لوگوں نے بھوتوں کی روک تھام کے لئے بہت کچھ انتظام کر رکھا ہے۔ پھر بھی ان کو بھوت تنگ کرتے رہتے ہیں۔

پچھو کی زبانی اس انوکھے گاؤں اور اس کے عجیب و غریب پودوں کا حال سن کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں تمام دن اسی گاؤں کے متعلق سوچتا رہا۔ اس رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں اور چراغ ایک خوبصورت پہاڑی پر کھڑے تھے۔ جس کے مقابل کی ایک دلفریب پہاڑی پر ایک گاؤں آباد تھا۔ اور ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان کھڈ میں ایک شور انگیز ندی کف اڑاتی مچلتی ہوئی گذر رہی تھی۔

اس کھڈ کے اوپر دو پل بنے ہوئے تھے۔ ایک پل گاؤں کی طرف جاتا تھا اور دوسرا ایک عالیشان مکان کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ جو دوسری طرف عین کھڈ کے اوپر بنا تھا۔ اس مکان کا آدھا حصہ جو دمدمہ نما تھا نہایت کاریگری سے کھڈ کی طرف بڑھا کر دو پتھریلی چٹانوں کی چوٹیوں پہ ایستادہ کیا گیا تھا۔ یہ چٹانیں جو اس دمدمے کے نیچے ستونوں کا کام دیتی تھیں جہاں پانی گہرا مست ہاتھی کی طرح چٹانوں سے ٹکراتا ہوا جا رہا تھا اس پل پہ دمدمے کے قریب میری بہن ذکیہ نہایت مغموم کھڑی تھی اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ نہایت عاجزی سے کہنے لگی۔ "مشتاق مجھے بچاؤ"۔ میں نے غم آلودہ لہجہ میں کہا۔ ذکیہ یہ کونسی جگہ ہے۔ اور تم یہاں کیسے آ گئیں؟" اس نے کہا "میں ذکیہ نہیں میرا نام شمشاد ہے اس گاؤں کو باتھری کہتے ہیں۔ اور میں یہاں کی مظلوم رانی ہوں۔ میں اس کی مدد کو بڑھا۔ یکدم سخت آندھی چلی۔ وہ پل ٹوٹ گیا۔ اور ذکیہ کھڈ میں گر گئی۔ لیکن

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

میں نے اس کے پیچ کو پکڑ لیا۔

اس وحشت ناک خواب کی گھبراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ میں بے قراری سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگا۔ میں نے چراغ کو بلا کر اپنا خواب سنایا۔ اور اسے فوراً باتھری کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم یہاں سے روانہ ہو گئے۔

ہمارا راستہ تنگ اور پیچ در پیچ تھا جو ایک پر خطر کھڈ کے کنارے ہوتا ہوا پہاڑ کی ناہموار اور ناقابل عبور چڑھائی پر جا پہنچا تھا۔ بعض گھاٹیاں اتنی دشوار گذار تھیں کہ گھوڑے اپنے پاؤں زمین پر گاڑ گاڑ کر چلتے تھے ان پہاڑوں میں آمدورفت بہت محدود تھی۔ دوران سفر میں صرف دو دفعہ ان پہاڑوں سے وہ قافلے ملے۔ جو من میش کی طرف تیر تھیا زا کرتے جا رہے تھے۔

آخر تیرہ دنوں کی شبانہ روز صعوبتوں کے بعد ہم یہ راستہ طے کر کے روہنی کے دلکش گاؤں میں جا پہنچے۔ اس مسلسل اور کٹھن سفر کی تکان سے ہمارے بدن چور ہو رہے تھے اس لئے کچھ دن ہم روہنی میں ٹھہرے۔ پھر ایک ہفتہ کے قیام کے بعد ہم لوگ باتھری کی طرف روانہ ہوئے۔ پچھو ہمارے ساتھ جانے کو تیار نہ تھا۔ مگر زیادہ تقاضا کرنے پر وہ ہماری درخواست رد نہ کر سکا۔

یہ راستہ پہلے سے بھی زیادہ ناقابل گذر اور شکستہ تھا بڑی دقتوں سے اسے طے کر کے دوسرے دن کہیں، دوپہر کے وقت ہم لوگ ایک کھلے میدان میں پہنچے۔ سامنے ایک خوبصورت ٹیلہ تھا۔ اس دیدہ زیب میدان کو دیودار کے شاندار درخت گود میں لئے کھڑے تھے۔ آفتاب کی تابانیوں سے میدان کا ذرہ ذرہ کوہ نور کا ہمسر تھا۔ دھوپ اپنے پورے جوبن پر تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے متوالے جھونکے اس میدان کے خس و خاشاک کی بلائیں لے رہے تھے۔ اس پر کیف منظر سے متاثر ہو کر ہم نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ اور کھانا جو پہلی منزل سے پکا کر ساتھ لائے تھے کھا کر آرام کرنے لگے۔

سہ پہر کو میں اور چراغ سیر کرتے ہوئے ٹیلے پر جا نکلے۔ دور سے ہمیں ایک عورت دکھائی دی۔ جو چیل کے سائے میں بیٹھی تھی۔ یہ ایک لمبے قد کی گرانڈیل اور مضبوط مگر بوڑھی عورت تھی۔ اس کے بال بہت دراز اور بالکل سفید تھے۔ جن کو کھولے ہوئے وہ کنگھی کر رہی تھی۔ چراغ جھجک کر کہنے لگا بچپن کی کہانیوں میں بڑی بوڑھیوں سے سنا کرتا تھا کہ ویران جنگلوں اور پہاڑوں میں چڑیلیں رہا کرتی ہیں۔ جن کے بال پاؤں کی ایڑیوں تک لمبے ہوتے ہیں میں اس کی ضعیف الاعتقادی پر ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا پاؤں کی آہٹ پا کر اس نے اپنے نقرئی تاروں کے سے سفید بال چہرے سے ہٹائے۔ اور میری طرف دیکھا۔ پھر پہاڑی زبان میں کہنے لگی۔ تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو۔ اور یہاں کیسے آنا ہوا؟۔"

"میں نے کہا "میں حکیم ہوں اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ لیکن کیا تم اس ویرانے میں اکیلی رہتی ہو؟۔"

اس عورت نے گہرا سانس لیا۔ اور کہنے لگی۔ "نہیں میں موضع باتھری کی رہنے والی ہوں۔ جو یہاں سے تین کوس آگے ہے۔ میرا نام فرزانہ ہے۔ میں بے اولاد ہوں۔ اس وجہ سے گاؤں کی کئی بے رحم عورتیں مجھے منحوس خیال کرتی ہیں اور میرے شوہر کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ میرا شوہر نبی خاں سخت گیر آدمی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر مجھے بری طرح زدوکوب کرتا ہے بعض اوقات اس کی سختیوں سے تنگ آ کر میں اس جنگل میں آ جاتی ہوں اور کچھ دن بعد جب اس کا غصہ سرد پڑ جاتا ہے تو واپس چلی جاتی ہوں"۔

اس نے مجھے اپنے بازو اور شانے دکھائے۔ جن پر بڑے بڑے نیلے داغ تھے۔ یہ اس کے شوہر کے وحشی پن کا ثبوت تھا۔ مجھے اس پر بڑا رحم آیا۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد پا کر کہنے لگی۔ "پہلے تو میں اس ظلم و ستم سے بہت گھبراتی تھی مگر جب سے مجھے ایک رشی نے بشارت دی کہ تیرا بیٹا ایک دن گاؤں کا سردار ہوگا تب سے مطمئن ہوں۔ گو میں جانتی ہوں کہ میری عمر بچہ پیدا کرنے کی نہیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ رشی کی پیشین گوئی ضرور پوری ہوگی۔"

فرزانہ بہت نیک دل اور باادب عورت تھی۔ میں نے اس سے باتھری کے حالات اور بھوتوں کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ بیشک یہ قصبہ بھوتوں کے ظلم و ستم کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ موجودہ سردار کا انتہائی ظلم ہے جو اس نے گاؤں کے اصلی وراثت اور اس کے حامیوں پر کیا تھا"۔

پھر کہنے لگی .... "آج سے نصف صدی پیشتر موضع باتھری ان کالے کالے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں آباد تھا۔ اس گاؤں کی آبادی تقریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی"۔

اس وقت موجودہ سردار کا چچا نعمان خاں گاؤں کا حاکم تھا۔ اس سردار کو شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ جب وہ شکار کو جا رہا تھا اس کا گھوڑا ایک دشوار گذار گھاٹی سے بھڑکا۔ اور سوار سمیت کھڈ میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد نعمان خان کا چھوٹا بھائی (یعنی موجودہ سردار کا باپ) رمضان خان یہاں کا عارضی حاکم بنایا گیا۔ کیونکہ متوفی سردار کا لڑکا ہمدان خاں صرف ایک سال کا بچہ تھا۔ پھر تیرہ سال بعد جب رمضان خاں کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے سلطان خاں نے جو ہمدان خان سے پانچ سال بڑا تھا۔ ہمدان خاں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا اور خود حاکم بن بیٹھا۔ اس پر ہمدان خاں کے حامیوں نے شورش مچائی۔ تو سلطان خاں نے ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بس اس دن سے موضع باتھری پر تباہی آ گئی۔ یعنی تمام بے گناہ مقتولوں کی روحیں بھوت بن کر گاؤں والوں کو ستانے لگیں۔ اور انہیں بھوتوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر ایک درے کے راستے اپنی رعایا کے ساتھ بھاگ آیا۔ اور پہاڑ کے اس طرف ایک جگہ موجودہ باتھری آباد کیا۔ پھر اس پہاڑ [illegible] درے کو ایک پتھریلی دیوار بنا کر جو کئی گز اونچی ہے بند کر دیا۔ اب یہ بھوت گاؤں میں تو نہیں [illegible]

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

آتے۔ لیکن جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کی لاش کو قبر سے نکال کر کھا جاتے ہیں۔

میں نے کہا "فرزانہ باتھری کے لوگ مسافروں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں" فرزانہ کہنے لگی۔ "بھوتوں کے ڈر سے اس طرف کوئی مسافر آتا ہی نہیں۔ البتہ کبھی کبھی کشمیری سوداگر آ کر حسین لڑکیاں سردار کے پاس فروخت کر جاتے ہیں ان کے لئے سردار نے ایک مہمان خانہ بنوا رکھا ہے تم حکیم ہو۔ اگر عمدہ دوائیں سردار کو تحفہ دو گے تو تمہاری بہت قدر کرے گا"۔

شام کے قریب ہم لوگ فرزانہ کی معیت میں باتھری کی طرف روانہ ہو کر ایسی جگہ پہنچے جہاں خواب کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ہم لوگ اس وقت ایک ایسی پہاڑی پر کھڑے تھے۔ جس کے مقابل کی دوسری پہاڑی پر گاؤں آباد تھا۔ وہی ندی، وہی کھڈ، وہی دو پلیا، وہی دمدمہ نما مکان جس کا آدھا حصہ کھڈ کے درمیان سنگی چٹانوں پر قائم تھا میں بھونچکا سا ہو کر خواب والی حسین لڑکی کی جستجو میں اس خوبصورت پل کی طرف دیکھنے لگا جو اس عمارت کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ مگر وہاں کچھ دکھائی نہ دیا۔

فرزانہ میری بد حواسی پر بہت متعجب ہوئی۔ میں دیر تک پاگلوں کی طرح کھڑا ادھر ادھر کے مناظر دیکھتا رہا............ شام کافی تاریک ہو جانے پر ہم باتھری میں داخل ہوئے ٹچھو اور گھوڑوں کو فرزانہ نے اپنے مویشی خانہ میں جگہ دی۔ میں اور چراغ رات کو مسجد میں سوئے۔

صبح کے وقت مسجد کے مولوی سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے اپنا پیشہ اور یہاں آنے کی وجہ بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور جمعہ کے دن مجھے سردار سے ملانے کا وعدہ کیا اس مولوی کا نام عبدالصمد تھا گاؤں میں اسکی بہت عزت تھی۔ اس کا رتبہ سردار کے بعد دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اور بہت تواضع سے پیش آیا...... تین دن تک ہم لوگ مولوی عبدالصمد کے مہمان رہے۔ چوتھے دن جمعہ کی نماز کے بعد اس نے سردار سے میرا تعارف کرایا۔ سردار جس کی عمر دراصل تیس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ چالیس سال کا ایک مضبوط اور طاقتور آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رنگ سفید اور نقش و نگار بھدے تھے۔ بشرے سے رعونت ٹپکتی تھی۔

وہ کہنے لگا کہ بھوتوں کے متعلق سب روایات سچی ہیں۔ انہیں بھوتوں کی وجہ سے سردار اصلی گاؤں چھوڑ کر یہاں آباد ہوا ہے لیکن یہاں بھی قبرستان میں رات کے وقت بھوت پھرتے رہتے ہیں چنانچہ اس نے خود ایک دفعہ ایک بھوت کو دیکھا تھا۔ یہ [illegible]

بھوت تھا۔

اس کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ سردار پر ان مقتولوں کی ایسی لعنت پڑی ہے۔ کہ وہ اب تک بے اولاد ہے۔ اس کی عورتیں چونکہ دوسرے ملکوں کی ہوتی ہیں جن کو بردہ فروش سردار کے پاس فروخت کر جاتے ہیں اس لئے وہ کچھ عرصے کے بعد محل سرا سے بھاگ جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔ کیا سردار اس بدعت کی روک تھام کے لئے کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ وہ کہنے لگا وہ بھی ہرجائی ہے۔ اس کے پاس بردہ فروش ہمیشہ نئی نئی لڑکیاں لاتے رہتے ہیں۔ یہ باتیں سن کر میں بہت متعجب ہوا۔ کیوں کہ اس گاؤں کی ہر ایک بات انوکھی تھی۔

شام کا پژمردہ وقت تھا۔ افسردہ ہوائیں موسم خزاں کی آمد کا پتہ دے رہی تھیں پت جھڑ سے درخت بے رونق ہو رہے تھے پہاڑوں کی اودی اودی چوٹیاں سر پر غرور کو بصد شان و شوکت اٹھائے تماشائے لیل و نہار میں مصروف تھیں۔ سرمئی آسمان پر دور دراز تک سفید بگلوں کی قطاریں۔ گھونسلوں میں پرندوں کی سوکھی پھڑ پھڑاہٹ جنگلی گدھوں کی منحوس آواز ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ خونخوار ندی کا پانی سیاہ ناگن کی طرح اپنی زبان خارا شگاف سے پتھروں کو چھیدتا تیزی سے رواں تھا۔ اردگرد کی فضا نہایت اداس تھی۔

میں عبدالصمد کی ملاقات سے واپس آتے ہوئے موسم کے انقلاب سے بہت متاثر ہوا۔ اور بددلی سے قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے کی طرف واپس جا رہا تھا۔ ارادہ تھا کہ سردار سے رخصت حاصل کر کے واپس چلا جاؤں۔ کیونکہ جاڑا بہت قریب آ گیا تھا۔

جونہی میں نے پل پر قدم رکھا۔ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی۔ جو پل کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ میں جلدی جلدی پل کو عبور کر کے اس کے قریب پہنچا۔ تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیوں کہ یہ لڑکی بالکل وکیہ کی ہم شکل تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ یکایک بڑے دروازے سے دو آدمی نکلے۔ ایک آدمی جو بہ نسبت اپنے ساتھی کے اچھی پوشش میں تھا۔ کہنے لگا۔ "شمشاد تم یہاں کھڑی ہو۔ اور ہم تمہیں مہمان خانے میں تلاش کر رہے تھے۔ چلو سردی ہو رہی ہے۔ یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں"۔

شمشاد کے نام پر میں دوبارہ چونکا۔ اور اپنے خواب کو الہام تصور کرنے لگا۔ لڑکی چپ چاپ متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اور میں دیر تک دریائے حیرت میں ڈوبا ہوا کھڑا رہا جب اندر گیا تو مہمان خانے میں خوب چہل پہل تھی۔ چراغ نے مجھے بتایا کہ کشمیر

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

سوداگر سردار کے پاس لڑکیاں فروخت کرنے آیا ہوا ہے۔ میں تمام رات سوچتا رہا کہ کس طریقے سے اس لڑکی کی مدد کی جائے۔ مگر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

دوسرے دن فرزانہ کی زبانی معلوم ہوا کہ ان لڑکیوں میں سے جو سوداگر لایا تھا صرف تین لڑکیاں سردار نے اپنے لئے منتخب کی ہیں جن میں ایک شمشاد بھی ہے۔ باقی ماندہ لڑکیاں گاؤں کے لوگوں نے خرید لی ہیں۔ تیسرے دن صبح کو سوداگر چلا گیا۔ اور تمام کوٹھڑیاں خالی ہو گئیں۔

گو میں بہت اداس تھا۔ مگر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ کیونکہ اس الہامی خواب کے زیر اثر مجھے یقین ہو چکا تھا کہ شمشاد کو ایک نہ ایک دن میری مدد کی ضرورت ہو گی۔ کچھ دن بعد سخت سردی پڑنے لگی برف باری بھی شروع ہو گئی۔ ہر طرف برف کے انبار دکھائی دینے لگے ندی کا پانی یخ بستہ ہو کر رہ گیا۔ میں اور چراغ جو اتنی سردی کے عادی نہ تھے۔ رات دن اندر پڑے رہتے۔

خدا خدا کر کے موسم بہار کا آغاز ہوا۔ ہوا میں طراوت اور خوشگواری پیدا ہونے لگی بلند پہاڑ جو آج سے چند دن پہلے لبادہ پہنے ہوئے تھے سفید نقاب اتار کر سیاہ دیوؤں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ ندی نالوں کی گنگناہٹ اور پرندوں کے شیریں گیت کائنات میں نئی زندگی کا پتہ دینے لگے۔

ایک دن صبح کو جب چراغ نے دروازہ کھولا۔ فرزانہ سہمی ہوئی اندر آئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کے خوف و ہراس کی وجہ دریافت کی تو وہ کہنے لگی.......... "آج میں نے ایک گہری سازش کا پتہ لگایا ہے۔ جو آپ لوگوں کے خلاف سازش ہو رہی ہے؟"۔ وہ کہنے لگی ہاں سنئے۔ آج رات کو جب کہ میں اپنی کوٹھڑی میں بے خبر سو رہی تھی۔ آہٹ پا کر بیدار ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ میرا شوہر باہر جا رہا ہے۔ چونکہ ہمارے گاؤں میں رات کے وقت کوئی آدمی گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ اس لئے یہ بات معمولی نہ تھی۔ میں نہ رہ سکی۔ اور دل کڑا کر کے دبے پاؤں اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔ وہ سیدھا سردار کے محل کی طرف گیا۔ اور پچھواڑے کی طرف چھوٹے سے دروازے پر اس نے ایک خاص قسم کی دستک دی۔ اور دروازہ فوراً کھل گیا۔ اور وہ اندر چلا گیا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی میں نے سوراخوں سے دیکھنا شروع کیا دروازہ کھولنے والا شخص سردار سلطان خاں تھا۔ وہ نہایت مضمحل دکھائی دیتا تھا۔ سردار کہہ رہا تھا دونوں کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ نبی خاں مصر تھا کہ ایک ہی دن دونوں کو ٹھکانے لگانا لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کر دے گا۔ ان دونوں میں کم از کم مہینے کا وقفہ ضرور ہونا چاہیے اس پر سردار نے کہا "اچھا دو تین دن کے اندر ایک تو ٹھکانے لگاؤ"۔ نبی خاں کہنے لگا یہ بھی اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ندی میں ابھی پانی تھوڑا ہے تقریباً دس پندرہ دن تک زور پکڑے گا۔ سردار مضطرب ہو کر کہنے لگا۔ دن تو بہت ہیں لیکن خیر مجبوری ہے۔ اچھا تم اس کل کو درست کر رکھو۔ نبی خاں نے بہت بہتر کہا۔ اور سلام کر کے رخصت ہوا۔ میں اس سے پہلے آکر جھوٹ موٹ خراٹے لگانے لگی۔

فرزانہ کی باتوں سے صداقت کی بو آتی تھی لیکن بار بار مجھے خیال آتا کہ ہمیں ٹھکانے لگانے میں سردار کا کیا فائدہ ہے اس بات کو تقریباً ایک ہفتہ گذرا تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد سردار نے مجھے حکم دیا کہ مہمان خانے کی مرمت ہونے والی ہے اس لئے اپنی کوٹھڑی خالی کر کے پل کی دوسری طرف اس خوبصورت جھونپڑے میں چلے جائیں۔ جو انہی دنوں تمہارے لئے بنوایا گیا۔ اس حکم سے ہمارے شبہات اور بھی مضبوط ہو گئے۔ مگر ہمیں مجبوراً مہمان خانہ خالی کر کے اس جھونپڑے میں جانا پڑا۔

اب ہم لوگ فرزانہ کی رائے کے مطابق دن بھر تو اسی جگہ رہتے لیکن رات کو ایک محفوظ جگہ چلے جاتے۔ یہ ایک جھونپڑی تھی جو گاؤں سے پرے ویران جنگل میں خوفناک درے کے قریب واقع تھی۔ یہ جھونپڑی اسی رشی کی تھی جس نے فرزانہ کو بشارت دی تھی کہ تیرا بیٹا ایک دن گاؤں کا سردار ہو گا۔

رشی کی موت کو کئی سال گزر چکے تھے۔ تاہم جھونپڑی اچھی حالت میں تھی فرزانہ کا معمول تھا کہ وہ ہر صبح کے وقت جا کر جھونپڑی کو صاف کرتی۔ اور جہاں رشی بیٹھا کرتا تھا۔ اس جگہ کو پھولوں سے سجاتی۔ پھر وہ دروازہ مقفل کر کے واپس آجاتی۔

اسی طرح چھ دن گذر گئے۔ ایک دن صبح کے وقت میں نے یہ خبر سنی کہ ان لڑکیوں میں سے جو بردہ فروش لائے تھے۔ ایک لڑکی تاج نام سردار کے محل سے بھاگ گئی ہے۔ سردار نے اس کی تلاش میں مختلف راستوں پر سوار دوڑائے۔ پھر بھی اس لڑکی کا کچھ پتہ نہ ملا۔ آخر دوسرے دن باتھری سے دو کوس پرے ندی کے بہاؤ پر پانی میں سے کسی شخص کو ایک حاملہ عورت کی لاش ملی۔ جس کی کھال پتھروں کی رگڑ سے ادھڑ چکی تھی۔ شناخت ہونے پر معلوم ہوا۔ کہ لاش تاج کی ہے۔

اس لڑکی کی دردناک موت پر دفعتہً میرے دماغ میں روشنی پیدا ہوئی مجھے یقین ہو گیا۔ کہ وہ سازش جو سردار اور نبی خاں کر رہے تھے ناحق ہم نے اپنے سے منسوب کی۔ وہ اس کی مظلوم عورتوں کے خلاف تھی۔ کیونکہ نبی خاں کی گفتگو سے ظاہر تھا۔ کہ وہ کسی ندی میں پھینک کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں.......... میں نے فرزانہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ کہنے لگی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے سردار کی تمام عمر میں صرف یہی دو عورتیں امید سے ہوئی تھیں یعنی ایک تاج اور دوسری شمشاد۔ سردار کی تمام امیدیں انہیں سے وابستہ تھیں۔ اس صورت میں وہ تاج کو کیسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔

فرزانہ کے منہ سے شمشاد کے حاملہ ہونے کا سن کر میں چونک اٹھا میں نے چلا کر کہا۔ "فرزانہ ضرور اب دوسری موت شمشاد کی واقع ہو گی۔ فرزانہ کہنے لگی "وجہ؟ میں نے کہا" وجہ یہی ہے کہ حاملہ ہے"۔

وہ ظالم ہمیشہ اپنی مظلوم عورتوں کو جو حاملہ ہوتی ہیں ہلاک کر کے مشہور کر دیتا ہے کہ بھاگ گئیں۔ حالانکہ ان راستوں سے ایک عورت کا اکیلے فرار ہونا کیسے ممکن ہو سکتا ہے فرزانہ

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کہا آگے جو عورتیں غائب ہوتی رہیں وہ حاملہ نہ تھیں۔" میں نے کہا تمہیں کیا معلوم۔ وہ ان کو ابتدائی ایام ہی میں ہلاک کروا دیتا ہوگا۔ اب چونکہ حالات موسم سرما میں رونما ہوئے ہیں جس وقت کہ ندی کا پانی منجمد تھا۔ اس لئے اس کام کو جلدی انجام نہ دے سکا۔ اور حمل ظاہر ہو گیا۔

میرے سمجھانے سے فرزانہ بھی قائل ہو گئی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور شمشاد کو بچانے کی کوئی تدبیر کرے گی۔ وہ آج کل اپنے شوہر سے روٹھ کر آئی ہوئی تھی۔ اور ہمارے پاس ہی رہتی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ باہر نکل گئی اور تمام دن غائب رہی۔ رات کو جب ہم سونے کی تیاری کر رہے تھے واپس آئی۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ تبسم تھا میں نے کہا کہو فرزانہ سارا دن کہاں رہی؟"۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور لمبے لمبے کرتے کی آستین سے کسی پودے کے بیج نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے کہا" یہ کیا چیز ہے؟۔ وہ کہنے لگی" یہ ایک قسم کا زہر ہے جس کے کھانے سے آدمی تین دن تک مردہ رہتا ہے۔ یہ میں شمشاد کے لئے لائی ہوں۔ اس کے ذریعے اس کو مردہ بنایا جائے گا۔ اور بعد میں اسے بھوتوں کے آنے سے پیشتر قبر نکال کر آپ راتوں رات فرار ہو سکتے ہیں ۔" میں نے کہا۔ "تجویز تو بہت اچھی ہے۔ مگر اس بیچاری کے بچے پر کہیں مضر اثر نہ پڑے۔" فرزانہ کہنے لگی۔ یہ بالکل بے ضرر چیز ہے۔ اگر اس کو کوئی نقصان پہنچا تو میں ذمہ دار ہوں۔

دوسرے دن ان بیجوں کو پیس کر سفوف بنایا گیا۔ اور ایک پڑیا میں باندھ کر فرزانہ نے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور کہنے لگی مخلصرا میں میری ایک رشتہ دار لڑکی ملازم ہے۔ آج میں اس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کروں گی۔

وہ مخلصرا کی طرف چلی گئی۔ شام کے بعد جب واپس آئی۔ تو کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ آتے ہی کہنے لگی۔ آقا دوا میں نے شمشاد کو پلا دی ہے۔ اور یہ کام تو ہمارے حسب منشاء ہو جائے گا۔ مگر اس کام میں عجلت کر کے میں نے بڑی غلطی کی۔ کیونکہ ہمیں اس سے قبل اس کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کر لینی چاہیے تھی۔ جہاں اس کو بھوتوں کے آنے سے پیشتر قبر سے نکال کر لے جاتے۔"

میں نے کہا۔ "اب بھی کافی وقت ہے۔ ابھی جا کر انتظام کر لیں گے۔"

فرزانہ کہنے لگی "کیا اس وقت قبرستان جانے کا ارادہ [illegible]

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

ہے؟ فرزانہ کہنے لگی۔ "وہاں پہنچنے میں ہمیں بہت دیر ہو جائے گی۔ اور بھوتوں سے بچ کر ہم واپس نہیں آسکیں گے۔ آج گاؤں میں ایک عورت مر گئی تھی۔ اس کی لاش پر بے شمار بھوت جمع ہو رہے ہونگے۔"

میں چونکہ بھوت پریت کا قائل نہ تھا۔ اور ان لوگوں کی روایات کی کوئی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔ میں دیکھوں گا ان بھوتوں کی کیا اصلیت ہے۔ در حقیقت یہ کوئی بندر کی قسم کا جانور ہوگا۔ جو میری بندوق کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا"۔

میں نے بندوق کندھے پر رکھی۔ اور زودن کی لکڑی جیب میں ڈال کر اکیلا چل کھڑا ہوا۔ مجھے اس طرح جاتے دیکھ کر چراغ بھی چپ چاپ میرے ساتھ ہو لیا۔ جب ہم گاؤں والے پل پر پہنچے تو فرزانہ بھی ہانپتی کانپتی ہم سے ملی۔ ہم لوگ خاموشی سے گاؤں کے باہر مولوی عبدالصمد کے مکان کی طرف جا کر ایک گھاٹی پر سے گذرتے ہوئے قبرستان میں جا داخل ہوئے۔

چاند کی چھٹی تاریخ تھی۔ وہاں درخت اس کثرت سے اگے ہوئے تھے کہ ان کے سائے سے قبرستان بے حد تاریک ہو رہا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ چاند کبھی کبھی بادلوں سے نمودار ہوتا اور گھنے درختوں کی شاخوں میں سے اس کی دھیمی روشنی قبروں پر پڑ کر نہایت بھیانک سماں پیش کرتی۔

قبرستان کے ایک کونے میں جہاں درخت قدرے کم گھنے تھے۔ ایک احاطہ بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک پہلو پر دو کوٹھڑیاں تھیں۔ فرزانہ نے مجھے بتایا کہ وہ شاہی قبرستان ہے۔ ہم لوگ اس احاطے میں داخل ہوئے۔ کوٹھڑیاں کھول کر دیکھیں۔ ایک کوٹھڑی میں قبر کھودنے کے اوزار اور لکڑی کے خالی تابوت رکھے تھے۔ دوسری کوٹھڑی میں ایک ایسی چارپائی پڑی تھی جس پر میت رکھی جاتی ہے .... یہ چارپائی والی کوٹھڑی ہمارے کام کے لئے بہت موزوں تھی۔ اسے فرزانہ نے صاف کیا۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ کل شمشاد کو رات بھر یہیں رکھا جائے صبح کے قریب رشی کی جھونپڑی میں لے جائیں گے۔ اس تجویز کو مکمل کر کے ہم لوگ احاطے سے نکلے۔ جب ہم اس نئی قبر کے قریب پہنچے (جس میں آج نئی میت دفن کی گئی تھی) تو فرزانہ میرا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے کہا۔ "یہ کیا رہی ہو؟" وہ سرگوشی سے کہنے لگی۔ دیکھو اس نئی قبر کے پاس کیا چیز ہے"۔ یک لخت بادل پھٹ گیا۔ اور چاند کی پھیکی بے رونق روشنی شاخوں سے چھن کر قبر پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ چار پانچ عجیب ساخت کے آدمی قبر کو پنجوں سے کھود رہے ہیں۔ شاید ان لوگوں نے میری آواز سن لی۔ یا چاند کی روشنی میں ہمیں دیکھ لیا۔ ان میں سے ایک اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔

میں نے ایک ہاتھ میں بندوق سنبھالی۔ اور دوسرے ہاتھ میں زودن کی لکڑی پکڑ کر اسے دیکھا۔ اف یہ میرے سامنے پانچ گز کے فاصلے پر ایک لاش جس کی آنکھیں بے نور اور ڈراؤنی تھیں۔ جس کے سر کے بال کھڑے تھے۔ جس کے دانت ہڈیوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ اپنے استخوانی پنجے پھیلائے ہماری طرف آرہی تھی۔

ندیم

میں فطرتاً دلیر واقع ہوا ہوں مگر یہ ہولناک منظر دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے زون کی لکڑی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ عین اس وقت فرزانہ کا ہاتھ اونچا ہوا۔ اس نے کوئی چیز اس لاش کی طرف زور سے پھینکی۔ فوراً ہمارے اور اس کے درمیان سیاہ دھند چھا گئی۔

فرزانہ ہم دونوں کو گھسیٹتی ہوئی احاطے کی طرف لے گئی۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے ہم لوگ اس کے اشارے پر اندھا دھند دوڑتے ہوئے احاطے میں داخل ہوئے اور چارپائی والی کوٹھڑی میں پہنچ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ چراغ نیم بے ہوش سا ہو رہا تھا میری حالت بھی بہت بری تھی۔ مگر فرزانہ کی طبیعت بالکل برقرار تھی .... تمام رات نمودار ہونے پر لرزتے ہوئے وہاں سے نکلے۔ اور سہمے ہوئے اس نئی قبر کو دیکھنے کے لئے بڑھے۔ قبر درمیان سے شق تھی۔ اردگرد گیلی مٹی کے تودے لگے تھے۔ اور لاش غائب تھی خوف و ہراس سے پہلے ہی ہماری زبانیں گنگ ہو رہی تھیں۔ اب قبر کی حالت دیکھ کر ہمارے رہے سہے حواس بھی گم ہو گئے۔

قبر اژدہا کی طرح منہ کھولے ہوئے تھی۔ اور بھوتوں کے پاؤں کے نشان نمناک زمین پر صاف نظر آئے تھے۔ ہم لوگ لڑکھڑاتے ہوئے قبرستان کی یاس آمیز بھیانک فضا سے نکل کر کھائی پر چڑھے۔ اور بہت بری حالت میں گھر لوٹ آئے۔ راستے میں ہم نے ایک آدمی سے سنا کہ سردار کی رانی شمشاد آج رات فوت ہو گئی ہے۔

جھونپڑی میں آتے ہی میں اور چراغ بیدم ہو کر گر پڑے۔ فرزانہ بھی گو سہمی ہوئی تھی لیکن ہماری طرح وحشت زدہ نہ تھی۔ وہ قہوہ تیار کر کے لائی۔ اور مجھے تسلی دینے لگی۔ میں نے فرزانہ سے پوچھا کہ ہم لوگ رات کو اس بھوت سے کیسے بچے۔ وہ کہنے لگی۔ "ہمارے ملک میں ایک قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے جس کے پھونکنے سے دھند چھا جاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے لوگ اس گھاس کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب میں رات کو آپ کے ساتھ گئی تو گھاس میرے پاس موجود تھی۔ پھر میں نے آپ کی دواؤں کے بکس سے ایک بوتل لی اور اس میں پانی بھر کے ساتھ رکھ لیا۔ رات بھر میں خوف کی وجہ سے سو نہ سکا تھا۔ صبح کے قریب نیند آ گئی۔ اور دوپہر ڈھلے آنکھ کھلی۔ اب میری طبیعت درست تھی چراغ بھی کافی دیر پہلے سو چکا تھا۔ اور مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ فرزانہ نے مکئی کی موٹی موٹی روٹیاں اور گھی لا کر ہمارے آگے رکھا۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور رات کی مہم کے لئے تیار ہو گئے فرزانہ نے پتہ لگا لیا تھا کہ شمشاد کو دفنا دیا گیا ہے۔

Uploaded By Muhammad Nadeem

شام قریب تھی۔ آفتاب کا چراغ ہستی عنقریب گل ہونے والا تھا درختوں کے سائے غیر معمولی لمبے ہو کر سورج کی زرد اور مرجھائی ہوئی کرنو

کھڑے تھے رات کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے حوصلے بھی پست ہوتے جا رہے تھے مگر کوئی پراسرار طاقت ہمیں قبرستان کی طرف کھینچ رہی تھی۔

جب ہم لوگ شاہی قبرستان کے احاطے میں داخل ہوئے تو سورج کی آخری ٹمٹماتی ہوئی کرن بھی غائب ہو گئی اور افق پر تاریک بادل چھا گئے فرزانہ کہنے لگی یہ بادل ہمارے لئے بہت مفید ہیں ہمیں ابھی سے اپنا کام شروع کر دینا چاہئے تاکہ شام تاریک ہونے سے پہلے ہی شمشاد کو نکال لیا جائے۔

ہم تینوں کدالیں لے کر قبر کھودنے میں مصروف ہو گئے آدھ گھنٹہ میں ہم نے شمشاد کو تابوت سے نکال لیا فرزانہ کہنے لگی خلاف امید یہ کام بہت جلد ہو گیا ہے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ شمشاد کو اسی وقت رشی کی جھونپڑی میں پہنچا دیا جائے یہ کوٹھڑی زیادہ محفوظ نہیں مبادا بھوت نیا گل کھلائیں۔

فرزانہ کا مشورہ معقول تھا چنانچہ میں نے شمشاد کو کندھے پر اٹھا لیا اور کھائی کو عبور کر کے جنگل کی طرف بڑھے ایک گھنٹہ تک ہم اس جھونپڑی میں پہنچ گئے ابھی ہم اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ رم جھم مینہ برسنا شروع ہوا ہم نے دروازہ ایک آہنی کھٹکے کے ساتھ اندر سے بند کر لیا اور شمشاد کو گھاس کے بستر پر لٹا دیا گیا میں اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا ساتھ لایا تھا فرزانہ نے کفن اتار کر اسے میرے کپڑے پہنا دیئے ہم لوگ اپنی کامیابی پر مسرور تمام رات جاگتے رہے۔

صبح کو فرزانہ کہنے لگی تم اپنی جائے اقامت پر واپس چلے جاؤ میں یہاں شمشاد کے پاس رہوں گی تم رات کو میرے لئے کھانا لے کر آ جانا۔

بادل کھل کر آسمان صاف ہو چکا تھا ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے فرزانہ کچھ دور تک ہمارے ساتھ آئی ہم جھونپڑی سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر آئے ہوں گے کہ وہ فوراً رک گئی اور حیرت سے زمین کی طرف دیکھنے لگی اس جگہ مٹی بہت چکنی اور نرم تھی اس پر بہت سے بے ڈھنگے پاؤں کے نشانات تھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی لاش کے قدموں کے نشان تھے ہم خوف زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے فرزانہ کہنے لگی ضرور کفن کی بو پر بھوت ادھر آئے ہیں مگر بارش کی وجہ سے جھونپڑی کو دیکھ نہیں سکے میں نے مضطرب ہو کر کہا اب کیا کیا جائے؟"۔

وہ سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر بعد کہنے لگی "ان اونچے پہاڑوں میں مجھے ایک غار معلوم ہے یہ غار بہت بڑا اور محفوظ ہے اس میں داخل ہو کر اگر اس کے چھوٹے سے دہانے پر پتھر چن دیئے جائیں تو باہر سے کوئی ان کو ہٹا نہیں سکتا اس لئے آج شمشاد کو سرِ شام ہی وہاں پہنچا دیا جائے تو بہتر ہو گا"۔

میں نے دریافت کیا "وہ غار یہاں سے کتنی دور ہے" وہ کہنے لگی "یہاں سے کوئی کوس بھر کے فاصلے پر ہو گا اگر آپ چاہیں تو ابھی چل کر دیکھ سکتے ہیں"۔ میں نے کہا "ضرور" وہ دوڑتی ہوئی گئی اور جھونپڑی کا دروازہ مقفل کر کے ہمارے آگے چل دی جنگل کے کناروں پر گھومتے ہوئے ہم لوگ پہاڑ

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

کے دامن میں پہنچے یہ زمین سنگلاخ اور راستہ ناہموار تھا مگر طوعاً کرہاً اس غار تک جا ہی پہنچے۔
واقعی یہ غار محفوظ اور اندر سے وسیع اور صاف ستھرا تھا ایک طرف بڑی بڑی سلیں تھیں جو غار کا منہ بند کرنے کے لئے بہت موزوں تھیں غار اندر سے اس قدر لمبا تھا کہ اس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دیتا تھا میں نے کہا "فرزانہ یہ غار کہاں ختم ہوتا ہے؟" فرزانہ نے لاعلمی ظاہر کی اس لئے میں اور چراغ زدن کی لکڑی ہاتھ میں پکڑے غار کا معائنہ کرنے لگے۔
تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد راستہ اتنا نیچا ہو گیا کہ ہمیں جھک کر چلنا پڑا ہمارے سامنے کسی زمین دوز آبشار کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی ہماری پنڈلیوں تک پانی آ پہنچا تھا آگے پانی کے گہرا ہونے کا خطرہ تھا تاہم ہمیں اطمینان ہو گیا کہ اس طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہیں اور ہم واپس آ گئے فرزانہ تو شمشاد کے پاس چلی گئی اور ہم دونوں اپنی جھونپڑی میں آ گئے۔
گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے سردار کے پاس جھوٹی تعزیت کو گیا دوپہر کے قریب وہاں سے واپس آیا اور کھانا کھا کر سو گیا چار بجے کے قریب بیدار ہوا ساتھ لے جانے کا ضروری سامان فراہم کر کے میں اور چراغ وقت کا انتظار کرنے لگے خدا خدا کر کے دن ختم ہوا سورج گوشہ مغرب میں روپوش ہونے والا تھا کہ ہم لوگ اس طرف چل کھڑے ہوئے شام کے پہلے ستارے نے جب آسمان کی کھڑکی سے جھانکا تو ہم جھونپڑی تک پہنچ چکے تھے۔
فرزانہ نے سامان خورد و نوش سنبھالا میں اور چراغ باری باری شمشاد کو کندھے پر اٹھاتے غار کی طرف روانہ ہوئے اور نہایت پھرتی سے راستہ طے کر کے منزل مقصود تک جا پہنچے۔
غار بہت تاریک ہو رہا تھا جس کو زدن کی بہت سی ٹہنیوں سے روشن کرنا پڑا پھر دہانے کو سلوں سے بند کر کے ہم نے بے اطمینان خاطر کھانا کھایا اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہم تینوں رات کو باری باری جاگ کر شمشاد کی حفاظت کریں پہلے تین گھنٹہ چونکہ چراغ کی باری تھی میں اور فرزانہ بے فکر سو گئے۔
ہمیں سوئے کوئی ایک گھنٹہ گذرا ہو گا کہ یک لخت ایک جگر خراش چیخ سنائی دی میں اور فرزانہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے تو چراغ بے ہوش پڑا تھا ہمیں خیال ہوا شاید اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے میں اسے دیکھنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ فرزانہ بھی الو کی طرح چیخنے لگی میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔
اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں لب خشک ہو رہے تھے اور لرزہ براندام غار کے اندرونی حصے کی طرف اشارہ کر کے بے تحاشا چیخ رہی تھی میں نے جلدی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔
"آہ معبود! ایسا جگر پاش اور حوصلہ شکن نظارہ میرے پیش نظر تھا کہ خوف سے مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی انتہائی دہشت سے میرے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو کر رہ گئے اور گلا خشک ہو کر بند ہو گیا میں نے دیکھا کہ چار پانچ انسانی لاشیں جن کی شکلیں مسخ شدہ اور بے حد ڈراونی تھیں غار کے اندرونی حصے سے نکل کر ہماری طرف آ رہی ہیں۔

فرزانہ کی چیخیں اب بند ہو چکی تھیں وہ بے حس و حرکت پڑی تھی میں اس بدحواسی میں اٹھا مرتعش ہاتھوں سے بندوق اٹھائی اور ایک لاش کی پیشانی کا نشانہ باندھ کر داغ دی گولی ٹھیک نشانہ پر بیٹھی اس لاش کا آدھا سر اڑ گیا مگر وہ بدستور بڑھ رہی تھی حتیٰ کہ لاشیں بالکل قریب آ گئیں۔
بڑھتی ہوئی مایوسی اور بے بسی سے میرا دل بیٹھ رہا تھا میں دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا مجھے صرف اتنا معلوم ہوا کہ کوئی ٹھنڈی سخت چیز میرے بدن سے مس ہوئی اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں اور چراغ ایک بڑے وسیع ہال میں پہلو بہ پہلو ایک چٹائی پر پڑے تھے چراغ کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے اور وہ ابھی غشی کی حالت میں تھا کمرے میں زدن کی روشنی ہو رہی تھی ایک طرف بڑے سے گول دائرے کی صورت میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی اس دائرے کے درمیان ایک پلنگ بچھا تھا جس کے قریب ایک سفید ریش بوڑھا آدمی اس کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا اس لاش کو دیکھ کر مجھے وہ غار والا منظر یاد آ گیا میرے جسم میں جھرجھری سی ہوئی اور ایک کپکپاتی ہوئی چیخ نما آہ میرے منہ سے نکل گئی۔
میری آواز پر وہ بوڑھا پلٹا اور آگ کا دائرہ پھاند کر میرے قریب آ کھڑا ہوا میں نے بے سوچے سمجھے چیخ کر کہا "اے شاہ جنات! ہم پر رحم کر"۔ بوڑھا نرمی سے کہنے لگا خوف نہ کرو میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں تم بالکل محفوظ جگہ پر ہو"۔
اس کے بعد اس آدمی نے دوسرے کمرے سے ایک پیالہ دودھ کا لا کر مجھے دیا جس کے پینے سے میرے بدن میں کچھ توانائی آ گئی اور میں اٹھ کر ستون کے سہارے بیٹھ گیا وہ بوڑھا میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگا میاں مشتاق میں اس کی زبانی اپنا نام سن کر سناٹے میں آ گیا مگر وہ کہنے لگا حیرانی کی کوئی وجہ نہیں فرزانہ کی زبانی تمہارا نام اور وہ سب قصہ جس کی وجہ سے تم مصیبتوں میں مبتلا ہوئے سن چکا ہوں پھر آہ سرد بھر کر کہنے لگا میں سردار سلطان خاں کا بدقسمت چچا ہوں میرا نام نعمان خاں ہے یہ جگہ باتھری کا قدیم گاؤں ہے جہاں تم اس وقت بیٹھے ہو یہ باتھری کا قلعہ ہے آج سے پچاس سال پیشتر میں یہاں کا حاکم تھا مجھے شکار کا بے حد شوق تھا ایک دفعہ شکار کے موقعہ پر جب میں گھوڑے سوار تھا ایک کھڈ کے کنارے پر سے گذر رہا تھا تو ایک ملازم نے مجھے دھکا دے کر کھڈ میں پھینک دیا دن بعد جب میں ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو سادھو کی کٹیا میں پایا کچھ عرصہ تک میں کٹیا میں صاحب فراش رہا سادھو نے میری بہت خدمت کی اور اس کی کوششوں سے میری جان بچ گئی۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

جب میں بالکل تندرست ہو گیا تو اس سادھو کے ذریعے معلوم ہوا کہ میری جگہ اب میرا چھوٹا بھائی رمضان خاں میرے لڑکے ہمدان خاں کے زمانہ نابالغی تک یہاں حاکم قرار پایا ہے اور میری بابت گاؤں میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے کہ نعمان خاں کی روح بھوت بن گئی ہے کیونکہ میری لاش نہ ملنے سے میرے بھائی کو میری طرف سے اندیشہ تھا مجھے بھائی کی شقاوت قلبی سے سخت صدمہ ہوا مجھے اس سے بہت محبت تھی لیکن اس کا یہ سلوک دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا اور میں حکومت کا خیال ترک کر کے اس سادھو کے پاس رہنے لگا یہ سادھو ایک زبردست عامل تھا اس کے علاوہ اسے علم طب میں بھی کمال حاصل تھا اس کی ہم نشینی میں مجھے بھی اس کے علوم و فنون کی خواہش پیدا ہوئی اور اس کی شاگردی میں رہ کر چند سال کے عرصے تک میں بھی زبردست عامل بن گیا میری ظاہری موت سے تیرا سال بعد میرے بھائی رمضان خاں کا انتقال ہو گیا اس وقت میرے لڑکے ہمدان خاں کی عمر چودہ سال کی تھی اور رمضان خان کا لڑکا بیس سال کا تھا یہ لڑکا اپنے باپ سے بھی زیادہ سنگدل ثابت ہوا اس نے ہمدان خاں کو زہر دے دیا۔ اور اس کے حامیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اس خبر سے دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی میں چاہتا تو سلطان خاں سے سخت انتقام لیتا مگر میں نے اسے نقصان پہنچانا پسند نہ کیا۔

ان دنوں میں اور سادھو لاشوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں ان پر عمل کیا کرتے تھے اس لئے میں اپنے لڑکے کی لاش کو بھی قبر سے نکال لایا چنانچہ یہ لاش جو سامنے پلنگ پر پڑی ہے اسی لڑکے ہمدان خاں کی ہے اور یہ چالیس سال کی پرانی لاش اب تک تازہ معلوم ہوتی ہے۔

آخر کار کئی سال کی تگ و دو کے بعد ہمیں صرف اتنی قدرت حاصل ہوئی کہ ہم لوگ مردہ لاشوں سے اپنی دماغی قوت کے ماتحت خدمت لینے لگے یعنی جس کام کا ہم خیال کرتے لاشیں فوراً ہمارے عمل کے زور سے وہ کام انجام دینے لگتیں لیکن ہم چاہتے تھے کہ لاشوں میں اصلی روحیں ڈال کر انہیں زندہ کیا جائے اس لئے ہم نے اپنا عمل باقاعدہ جاری رکھا اور جب کبھی کوئی گاؤں میں مر جاتا تو ہم اپنے تخیل کے ذریعے ان خدمت گار لاشوں کو حکم دیتے اور وہ مردے کو قبر سے نکال کر ہمارے پاس لے آتیں ابتدا میں جن لاشوں کو ہم نے معمول بنایا ان میں زیادہ تر ہمدان خاں کی لاشیں تھیں جب ان لاشوں کی تعداد بڑھ گئی تو ان کی رہائش اور اپنے عمل کے لئے ہمیں کسی وسیع عمارت کی ضرورت محسوس ہوئی اس لئے غور و خوض کے بعد ہم دونوں نے یہ طے کیا کہ ان لاشوں کو ایک گھنٹہ کے لئے باتھری کے گلی کوچوں میں کھلم کھلا پھرنے کا حکم دیا جائے تاکہ وہ لوگ ڈر کر گاؤں خالی کر دیں چنانچہ ان لاشوں کو ہم نے اپنی قوت متخیلہ کے ماتحت وہاں جانے کا حکم دیا تو وہ بلا دھڑک گاؤں میں داخل ہو گئیں جب گاؤں کے لوگوں نے ان لاشوں کو دیکھا ان کے اوسان خطا ہو گئے کئی لوگ خوف سے مر گئے اور کئی اپنے مکانوں میں چھپ گئے سلطان خاں اتنا خوف زدہ ہوا کہ اپنی رعایا سمیت گاؤں خالی کر کے بھاگ گیا اور ایک درے کو جو یہاں سے قریب ہے عبور کر کے دوسری طرف جا بسا

یہ قلعہ اور گاؤں تھری آباد کیا اور درے کو ایک نہایت بلند سنگی دیوار بنا کر بند کر دیا اس طرح میں نے اس سے جیت لیا جب یہ لوگ یہاں سے ہجرت کر گئے تو ہمیں اپنے عمل کے لئے نئی لاشوں کے حاصل کرنے میں بہت دقت ہونے لگی لیکن بہت جلد ہم نے ایک ایسا راستہ تلاش کیا جو پایاب ندی کے زیر زمین دوز منبع کے قریب سے ہو تا ہوا ایک وسیع میں کھلتا تھا اور نئی باتھری کا قبرستان بھی اس جگہ سے صرف میل بھر کے فاصلے پر تھا اب ہمیں اپنے کام میں بہت سہولت ہو گئی ہم لوگ اس خفیہ راہ سے ان لاشوں کو قبرستان میں بھیج دیتے جو نئی قبر سے مردہ نکال کر لے آتیں اب وہ سادھو مر چکا ہے دنیا میں مری صرف یہی آرزو ہے کہ انسان کی فرار شدہ روحیں دوبارہ تن خاکی میں داخل کرنے میں کامیابی حاصل کروں تاکہ اپنی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک بار اپنے لڑکے کو زندہ دیکھ سکوں گو مجھے اس لگاتار کوشش کے باوجود ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی مگر امید واثق ہے کہ ایک دن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا پرسوں یہ لاشیں ایک تابوت کھود کر لائیں تابوت میں صرف شاہی خاندان کے لوگ ہی رکھے جاتے ہیں اس لئے تابوت کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا لیکن جب تابوت کا ڈھکنا اٹھایا تو تابوت خالی تھا میں سوچنے لگا لاش کہاں جا سکتی ہے مجھے یہ معمہ حل کرنے کی جستجو ہوئی اس لئے میں نے لاشوں کو حکم دیا کہ اس تابوت کی آرامگاہ میں سونے والا جہاں کہیں ہو لے آؤ اگر اس کام میں کوئی مزاحمت کرے تو اس کو بھی پکڑ لاؤ چنانچہ جب تم لوگ غار میں پناہ گزیں تھے تو یہ لاشیں شمشاد کے علاوہ تم لوگوں کو بھی جو بے ہوش تھے اٹھا لائیں لیکن شمشاد نے ان لاشوں کو نہیں دیکھا اور نہ لاشوں کا اس کو کچھ علم ہے وہ یہی سمجھتی ہے کہ تم لوگ اسے یہاں لائے ہو میں نے اس کو ایسے آرام دہ کمرے میں رکھا ہے جہاں ان لاشوں کا گذر نہیں وہ اس وقت ہوش میں ہے اور بہت کمزور ہے ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چراغ کے کراہنے کی آواز سنائی دی ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے وہ ہوش میں آ چکا تھا مگر بے چینی سے سر کو ادھر ادھر پٹک رہا تھا مجھے دیکھ کر وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے پھوٹ کر باہر نکلنے لگیں میں حیران تھا کہ کیا معاملہ ہے۔

یکایک اس نے میرے سر کی طرف اشارہ کیا نعمان خان کہنے لگا وہ تمہارے بالوں سے جو رات کو غار والا خوفناک سین دیکھنے سے بالکل سفید ہو چکے ہیں ڈر رہا ہے میں نے اسے تسلی دی کہ ہم لوگ محفوظ ہیں اور بتایا کہ خود اس کے بال بھی میری طرح سفید ہیں جس کی وجہ رات والا انتہائی صدمہ ہے اس کے بعد نعمان خاں سے اس کا تعارف کرایا اور نعمان خاں والا قصہ بیان کر کے اسے بھوتوں کی اصلیت سے آگاہ کیا۔

نعمان خاں نے ہمیں اپنے قلعے کے ایک گوشہ میں نہایت آرام دہ کمرہ رہنے کو دیا اس کمرے کے دروازے ہم نے اندر سے بند کر لئے اور اطمینان سے سو گئے سہ پہر کو دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو نعمان خاں کھڑا تھا وہ ہمیں شمشاد کے پاس لے گیا فرزانہ نے اس کو ہماری خدمت

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

گزاری سے آگاہ کرر کھا تھا۔وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور دیر تک میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔

دوسرے دن نعمان نے مجھے کہا۔کہ تم لوگوں کی زبانی یہ سن کر کہ سلطان خاں نے اپنی حاملہ بیویوں کو نبی خاں کے ہاتھوں ہلاک کروادیا ہے میں بہت متعجب ہوں .... نبی خاں کو میری خدمت گار لاشیں گرفتار کر کے لے آئی ہیں اور میں اس کے بیان لینے والا ہوں اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔میں نے کہا۔کیا وہ لاشیں بھی وہیں ہونگی۔نعمان خاں کہنے لگا۔"ہاں وہ تو ہر وقت وہیں رہتی ہیں۔اس دن صرف تمہاری خاطر ان کو ہٹایا گیا تھا"۔

ہم دونوں ان خوفناک لاشوں کے تصور سے گھبرا گئے۔نعمان خاں ہمیں جزبز دیکھ کر کہنے لگا۔"اگر تم لاشوں سے خوف کھاتے ہو تو تمہیں ایسی جگہ بٹھا سکتا ہوں جہاں سے تم سب کچھ دیکھ سکو۔اور اس کی باتیں سن سکو"۔

چنانچہ وہ ہمیں قلعہ کے اوپر ایک برج میں لے گیا۔جس میں نیچے اترنے کے لئے ایک تنگ زینہ بنا ہوا تھا۔اس زینہ کے ذریعے ہم ایک گیلری میں اتر گئے۔یہ چھت کے ساتھ ملی ہوئی جالی دار گیلری اس بڑے ستون کے ارد گرد بنائی گئی تھی۔جو ہال کمرے کے درمیان استادہ تھا۔نعمان خاں چلا گیا۔اور ہم دونوں لکڑی کی ایک نشست پر بیٹھ کر دیکھنے لگے ہال کمرہ اس وقت ہمارے قدموں کے نیچے تھا۔

نبی خاں اس ستون کے قریب ایک چٹائی پر بے ہوش پڑا تھا۔اور لاشوں کی ایک جماعت سامنے والی دیوار کے ساتھ پشت لگائے کھڑی تھی۔آگ کا دائرہ برابر جل رہا تھا اتنے میں نعمان خاں ہال میں داخل ہوا۔نبی خاں کو ابھی تک بیہوش پا کر اس نے کوئی دوا اس کے منہ میں ٹپکائی جس کے اثر سے فوراً وہ ہوش میں آ گیا۔اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور لاشوں کی جماعت دیکھ کر چیخیں مارنے لگا۔نعمان خاں تحکمانہ لہجہ میں بولا۔"اس چیخ و پکار سے کوئی فائدہ نہیں۔اگر جان کی امان چاہتے ہو تو جو میں دریافت کروں سچ سچ بتا دو۔نبی خاں ہکلا کر کہنے لگا۔"آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"۔

نعمان خاں نے کہا۔میں نے سنا ہے کہ سلطان خاں اپنی عورتوں کو جو حاملہ ہوتی ہیں تمہارے ہاتھوں ہلاک کروادیتا ہے کیا یہ سچ ہے؟"نبی خاں کانپ کر کہنے لگا"ہاں بالکل صحیح ہے"نعمان خاں بولا۔"وہ ایسا ظالمانہ فعل کیوں کرتا ہے؟نبی خاں نے جواب دیا۔اس کو کسی نجومی نے کہا تھا کہ تمہارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کی پیدائش کے بعد تم جلدی مر جاؤ گے"۔

اس غرض سے سردار نے کھڈ کے اوپر ایک مہمان خانہ ہوا رکھا ہے جس میں آمنے سامنے دو ہال کمرے ہیں ان دو کمروں کے درمیان ایک زمین دوز خفیہ کمرہ کھڈ کی گہرائی پر بنایا گیا ہے اس خفیہ کمرے میں ایک عجیب و غریب کل لگی ہوئی ہے ان کمروں سے ایک تو قتل گاہ ہے اور دوسرے میں اس کل والے کمرے میں جانے کا خفیہ راستہ ہے جو انگیٹھی میں ایک کمانی دبانے سے کھلتا ہے۔جو کمرہ قتل گاہ کا کام دیتا ہے اس میں ایک مسہری ہے یہ مسہری جو پتھر کی معلوم ہوتی ہے دراصل لکڑی کے دو تختے ملا کر بنائی گئی ہے اس پر شیر کی خوبصورت کھال اس صفائی سے منڈھی ہوئی ہے کہ بالکل دو حصوں کا نشان دکھائی نہیں دیتا۔ان دو تختوں کے نیچے زنجیریں لٹک رہی ہیں کل کا ہینڈل دبانے سے تختے جدا ہو جاتے ہیں۔اور اس پر سونے والا زمین آخری تہ میں گر کر ہلاک ہو جاتا ہے۔

سردار جب اپنی کسی عورت کی جان لینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے آدھی رات کو بل کی سیر کے بہانے لے کر محل سرا کے پچھلے دروازے کے ذریعے مہمان خانے میں آ جاتا ہے یہاں وہ اس لڑکی کو ایک خاص قسم کی شراب پلاتا ہے جس سے وہ گہری نیند سو جاتی ہے اس کے بعد سردار اس کو مسہری پر لٹا کر الو کی طرح آواز نکالتا ہے۔میں جو پہلے ہی اس کی آواز پر کان لگائے بیٹھا ہوتا ہوں جھٹ مشین کا ہینڈل دبا کر اس لڑکی کو کھڈ میں گرا دیتا ہوں اس طرح وہ فوراً ہلاک ہو کر پانی میں بہہ جاتی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی"۔

یہ باتیں سن کر غیظ و غضب سے نعمان خان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور کہنے لگا خدا کی قسم میں سلطان خان کو قید کر کے اس ظلم کا خاتمہ کرونگا وہ ہر گز حکومت کے قابل نہیں"۔

ایک دن نعمان میرے پاس آیا اور کہنے لگا میں نے سلطان خان کی گرفتاری کے لئے لاشوں کو بھیجا ہے مگر وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا۔کیونکہ نبی خاں کی گمشدگی سے خوف کھا کر گاؤں کے لوگوں نے جگہ جگہ الاؤ لگا رکھے ہیں ایسی حالت میں ان لاشوں کے جل جانے کا اندیشہ ہے اس لئے ابھی کچھ دن انتظار کروں گا۔

ہمیں اس غیر آباد قلعے میں آئے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا۔ایک دن صبح کو فرزانہ نے ہمیں شمشاد کے فرزند پیدا ہونے کی خوش خبری دی۔ہم فوراً بچہ کو دیکھنے گئے۔نعمان خان پہلے ہی وہاں موجود تھا اور بچہ کو دیکھ کر نہال ہو رہا تھا۔پر شکوہ پہاڑوں سے رونما ہونے والا آفتاب اپنی رنگین کرنوں سے اس کے چہرے کو شادمانی کی جلا دے رہا تھا۔ویران گاؤں کے کھنڈروں میں رونق و برکت جھلک رہی تھی۔کائنات کی ہر ایک چیز ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔اور اب ہم سب کے دل مسرت سے بھر پور تھے۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

تھوڑی دیر بعد نعمان خاں چلا گیا۔ مگر ہم دونوں تمام دن وہیں رہے شمشاد بخار میں مبتلا تھی۔ میں اس کا علاج کرتا رہا۔ شام کے وقت میں فرزانہ کو ضروری ہدایات دے کر چراغ کے ہمراہ اپنی جائے قیام کی طرف روانہ ہوا۔

جب ہم صدر دروازے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ لاشوں کی ایک پوری جماعت دروازے میں داخل ہو رہی ہے ان میں سے دو لاشوں کے کندھوں پر ایک بڑا سا بنڈل تھا۔ ہم دونوں گھبرا کر ایک طرف ہٹ گئے۔ اور وہ جماعت سیدھی ہال میں چلی گئی۔ میں نے چراغ سے کہا۔ چلو گیلری سے جا کر دیکھیں۔ اس بنڈل میں کیا چیز ہے؟

چنانچہ ہم گیلری پر چڑھ گئے آتشیں دائرہ بدستور جل رہا تھا نعمان خاں اپنے لڑکے کی لاش پر عمل کرنے میں مصروف تھا۔ ستون کے قریب لاشوں نے اپنا بوجھ اتارا۔ اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی چیز کو کھول دیا یہ سردار سلطان خاں تھا۔ جس کو ان لاشوں نے چٹائی پر ڈال دیا۔ اور خود ساری جماعت سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

ہم انتظار میں تھے کہ دیکھیں چچا بھتیجا کی ملاقات کس طرح ہوتی ہے اور اس ملاقات کا ان دونوں پر کیا اثر ہوتا ہے لیکن نعمان خاں اپنے کام میں اس قدر منہمک تھا کہ اسے اس کارروائی کا کچھ علم نہ ہوا۔ سلطان خان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک غشی کی حالت میں تھا۔ لیکن کچھ دیر جب اسے ہوش آیا۔ تو انگڑائی لے کر ستون کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اپنے چچا پر پڑی۔ جو اپنے لڑکے کی لاش کے پاس کھڑا اس پر عمل کر رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اسے غور دیکھتا رہا۔ پھر کسی فوری جوش سے گھونسہ تان کر حملے کی نیت سے اٹھا۔ مگر جب اس کی نظر سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی لاشوں پر پڑی۔ تو لڑکھڑا کر گر پڑا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور جو پہلے زرد تھا نیلا ہو کر مرجھا گیا۔ اس کی گنہگار روح جسم سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ نعمان خاں اب تک ان واقعات سے بے خبر اپنے عمل میں مصروف تھا۔

دفعتہً لڑکے کی لاش میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اور وہ یکایک آنکھیں کھول کر اسے خشمناک نگاہوں سے گھورنے لگا۔ پھر یکدم اٹھا۔ اور بھوکے شیر کی طرح اس پر جھپٹا۔ اور اپنی انگلیاں بوڑھے کے گلے میں پیوست کر دیں۔

یہ حالت دیکھ کر فوراً ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوند گیا۔ میں نے اوپر سے چلا کر کہا۔ آہ یہ فتح ایک مکمل شکست ہے تمہارے بیٹے کے جسم میں سلطان کی روح داخل ہو گئی ہے۔ اس نے میری آواز سن لی اور پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا یکایک سلطان خاں کی لاش دیکھ کر سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔

اب وہ گلا چھڑانے کی ناکام جدوجہد چھوڑ کر لاشوں کی جماعت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ یہ نظریں بے معنی نہ تھیں۔ وہ ان کو دشمن پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے رہا تھا۔ یک لخت لاشیں آگ کا

دائرہ پھاند کر پل پڑیں اور لڑکے کی لاش کی تکا بوٹی کر دی۔ لیکن اس کی انگلیاں بدستور بڈھے کے گلے میں جکڑی رہیں۔ اور وہ مردہ ہو کر فرش پر گر گیا۔ نعمان خاں کے مرنے سے لاشوں کی قوت زائل ہو گئی اور وہ بھی سوکھے تنے کی طرح اوندھی گر گئیں ہم اس ناگہانی واقعہ سے سہم گئے اچانک آگ کے شعلے بھڑکے۔ اب ہمیں خطرے کا احساس ہوا جب لاشوں نے آگ کا دائرہ پھاندا توان کے کفنوں میں آگ لگ گئی جن کے جلنے سے آگ ہال کی چٹائیوں اور دوسری چیزوں تک پہنچ گئی۔ تمام کمرہ دھواں دھار ہو گیا۔ ہم بمشکل وہاں سے جان بچا کر بھاگے۔ شمشاد کے کمرے کی طرف آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ہم فوراً اس طرف دوڑے۔ ان کو وہاں سے نکال لیا۔ آناً فاناً آگ ہر طرف پھیل گئی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ہم شمشاد اور اس کے بچے کو یہاں سے اٹھا کر بھاگے اور زون کی ٹہنی کی مدد سے اس کھوہ میں داخل ہوئے جس میں سے ندی نکل رہی تھی جب ہم زمین دوز نج کے قریب گئے تو ایک طرف ہمیں ایک نیچا اور لمبا سرنگ کا راستہ دکھائی دیا۔ اس میں کمر کمر تک پانی تھا جس میں ہم کافی دیر تک چلتے رہے اور بدقت تمام اس راستے کو ختم کر کے اس غار میں پہنچے جہاں سے ہمیں لاشیں پکڑ کر لے گئی تھیں۔ ہم لوگ پانی میں تر ابور تھے شمشاد بھی جسے پانی سے بچانے کی ہم نے بہت کوشش کی تھی۔ بھیگ گئی تھی۔

وہ پہلے ہی بخار کی حالت میں تھی۔ بھیگ جانے سے اس پر نمونیے کا زبردست حملہ ہوا۔ اس وقت نہ کوئی دوا میرے پاس تھی نہ علاج کا کوئی دوسرا ذریعہ تھا۔ اس کی حالت بگڑنے لگی اور رات کے آخری حصے میں جان حق ہو گئی ...... ہمیں اس کی دردناک موت کا بہت قلق ہوا۔ اور صبح کے وقت میں بصد حزن و ملال مولوی عبدالصمد کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ میں نے تمام واقعات جو دیکھے اور سنے تھے اس کے گوش گذار کر دیئے اتفاقیہ وہ جمعہ کا دن تھا مولوی عبدالصمد نے مجھے تسلی دی۔

بعد نماز اس نے گاؤں والوں کو (جو اپنے سردار کی گمشدگی پر ہراساں تھے) یہ قصہ سنایا۔ بچہ ان کے سامنے لایا گیا۔ سردار کی خطرناک موت سے ان لوگوں کو یک گونہ رنج ہوا مگر بھوتوں کے خاتمہ کی خوشخبری اور بچے کے دیکھنے سے سب مطمئن ہو گئے اور سہ پہر کے وقت شمشاد کو دفن کر دیا گیا۔ بچے کا نام شمشاد خاں رکھا گیا۔ اور اس کے سن بلوغت تک مولوی عبدالصمد عارضی حاکم اور بچے کا اتالیق مقرر ہوا۔ اور فرزانہ رشی کی پیشن گوئی کے مطابق ننھے سردار کی ماں بنائی گئی۔

شمشاد کی موت سے میرا دل اچاٹ ہو گیا تھا اس لئے جلدی ہی ہم لوگ وہاں سے چلے آئے۔ اب مجھے ان لوگوں کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ البتہ میرے سفید بال اب بھی اس اندوہناک واقعہ کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem

آسیبی بلی

گیتی آرا گلنار سے جس قدر محبت کرتی تھی شجاع اس قدر اس سے نفرت کرتا تھا۔ جب کبھی وہ اُسے دیکھ پاتا نہایت غضبناک ہو کر کہتا

"گیتی آرا! اس ڈائن کو یہاں سے دور کرو۔ ورنہ میں اس کو گولی مار دوں گا"

در حقیقت وہ تھی بھی ڈائن اسے یہ کہنا بالکل موزوں تھا اس کا رنگ سیاہ اور شکل مکروہ تھی مگر اپنی اپنی طبیعت ہے گیتی آرا اس پہ جان و دل سے فدا تھی جب تک گلنار نہ کھا لیتی گیتی آراء کے حلق سے نوالہ نہ اترتا تھا۔

گلنار بڑی سمجھدار تھی اس کی محبت کو محسوس کرتی اور اس کا دل خوش کرنے کو طرح طرح کی حرکتیں کیا کرتی وہ نہایت صفائی پسند تھی بڑے سلیقے سے کھانا کھاتی اور ایک گدیلے والی کرسی جو گیتی آرا نے خاص اسی کی خاطر بنائی تھی بیٹھی رہتی۔

جب شجاع کے پاؤں کی آہٹ سنتی تو جھٹ اچک کر گیتی آرا کے ڈریسنگ روم میں گھس جاتی اور جب تک شجاع گھر میں رہتا او نچا سانس تک نہ لیتی گیتی آراء اس کی اس عقلمندی کی بہت معترف تھی اور اکثر بڑے فخر سے کہا کرتی کہ جتنی عقلمند میری گلنار ہے اتنا عقلمند کوئی انسان بھی نہیں۔

شجاع اور گیتی آرا کی آپس میں بڑی محبت تھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے ان کی شادی کو پانچ سال گذر گئے مگر وہ دو سے تین نہ ہو سکے تھے ایک کامیاب بیرسٹر اور والدین کا اکلوتا فرزند تھا چنانچہ اس حالت میں گیتی آرا کا بانجھ ہونا سخت خطرناک تھا۔

شجاع کے والدین اس کو با اولاد دیکھنے کے خواہشمند تھے اس کی والدہ کی عین آرزو تھی کہ اس کا سونا گھر ایک معصوم اور شوخ ہستی کی برکت سے بارونق ہو کوئی اسے توتلی زبان سے دادی اماں کہے اسے دلفریب شرارتوں سے ستائے اور معصومانہ اداؤں سے مچل کر اس کا دل لبھائے گیتی آرا ابھی اس

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

کمی کو محسوس کرتی تھی مگر یہ خدا کی دین ہے کسی کے بس کی بات نہیں۔

جوں جوں دن گذرتے جاتے گیتی آرا کے تفکرات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کیونکہ اس کا مستقبل تاریک تھا اپنے حسرتناک انجام کا نقشہ اسے آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا تھا اور وہ اکثر اپنی پائمالی محبت کے خیال سے تھرا اٹھتی تھی۔

جب تک شجاع گھر میں رہتا گیتی آرا کا دل بہلا رہتا مگر جونہی وہ عدالت کو جاتا وہ افسردہ ہو جاتی کیونکہ گھر میں کوئی اس سے کھل کر بات چیت نہ کرتا تھا اس لئے اس نے اپنا غم غلط کرنے کو گلنار پال رکھی تھی جو اس کی محبوب بلی تھی وہ اکثر تنہائی میں اس سے باتیں کیا کرتی تھی جس کے جواب میں گلنار اس کو ایسی نگاہوں سے دیکھتی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ اس کی باتیں سمجھتی اور دکھ درد میں اس کی شریک ہے۔

شجاع کو والدین بارہا دوسری شادی کیلئے کہہ چکے تھے مگر وہ انکار کرتا رہا آخر جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو مجبوراً اسے رضامند ہونا پڑا۔

شجاع کی دوسری شادی کو بھی مدت گزر گئی مگر بچے کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی اس کی والدہ ہنوز زندہ تھی وہ چاہتی تھی کہ ایک دفعہ اور شجاع کی شادی کر کے قسمت آزمائی کرے لیکن اب اس کا نئی بہو سے سابقہ تھا جس نے شجاع کو اس طرح قابو کیا تھا کہ اسے دم مارنے کی جرأت نہ تھی گیتی آرا کو وہ بالکل بھول چکا تھا۔

شہزادی اپنی چالاکیوں سے اس کو موقع ہی نہ دیتی تھی کہ وہ کسی سے ملنے کے لئے وقت نکال سکے وہ ہر وقت اس کی نازبرداریوں میں مصروف رہتا شجاع کے اس طرز عمل سے گیتی آرا کو سخت قلق ہوتا تھا مگر وہ راضی برضا تھی۔

شہزادی شکل و صورت میں تو گیتی آرا کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی مگر ناز نخروں میں طاق تھی مرد کی تسخیر کا گر جانتی تھی وہ سخت مزاج کمینہ خصلت اور تندخو عورت تھی اس کا باپ ایک اعلیٰ خاندان کا رکن تھا لیکن ماں ایک بازاری عورت تھی اور ماں کی تربیت کا اثر اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے تھا وہ گیتی آرا کے خون کی پیاسی تھی اس نے محل سرا کی طرف کھلنے والے دروازے عرصہ سے بند کر دیئے تھے تاکہ شجاع کی نظر کہیں گیتی آرا پر نہ پڑ جائے اس انقلاب نے گیتی آرا پر دنیا کا عیش و آرام حرام کر دیا اس کی اس بے کیف زندگی میں واحد غم گسار اس کی پیاری بلی گلنار تھی۔

جنوری کے آخری دن تھے شجاع خواب راحت سے بیدار ہوا تو اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے چنبیلی کے ایک خوبصورت ہار پر پڑی جس کے قریب ہی ایک رقعہ دیکھ کر اسے یاد آگیا کہ آج اس کی پہلی شادی کی سالگرہ ہے اس نے ہار کو اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیا بھولی ہوئی گیتی آرا کی یاد تازہ ہو گئی گذشتہ ایام کی پر محبت زندگی کا نقشہ سینما کی متحرک تصاویر کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا اسے اپنے ظالمانہ سلوک سے جو اس نے چھ سال سے اس کے ساتھ روا رکھا تھا سخت ندامت ہوئی وہ آہ سرد بھر کر کہنے لگا........ "آہ گیتی آرا کیسی عقلمند ہے۔ زرد چنبیلی کا ہار بھیج کر اس نے مجھے اس بے اعتنائی پر ملامت کی ہے۔ کیا اس سے میری محبت انہی پھولوں کی طرح زرد ہو چکی ہے۔"

وہ ایک ہارے سے ہوئے جواری کی طرح ہار کو ہاتھ میں لے کر کرسی پر بیٹھ گیا بہت دیر تک انہی خیالات میں محو رہا اور جانے کب تک اسی حالت میں رہتا مگر شہزادی کی کرخت آواز سے چونک اٹھا۔

"کیا اس بیہودہ عورت نے اس دفعہ پھر زرد پھولوں کا تحفہ بھیجا ہے یہ پھول تو تابوت پر ڈالے جاتے ہیں کون نمک حرام یہ ہار یہاں لایا ہے؟"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے یہ ہار شجاع کے ہاتھ سے لے کر پھینک دیا اس کے بعد گیتی آرا کو کوستی اور نوکروں کو برا بھلا کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی شجاع نے منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں وہ سوچنے لگا کیا مظلوم گیتی آرا کا تحفہ محبت ہر سال اسی طرح حقارت سے ٹھکرا دیا جائے گا۔"

وہ تمام دن مغموم رہا شام کے قریب جب وہ باہر سیر کو گیا تو بغیر کسی ارادے کے چلتے ہوئے باہر کے راستہ سے محل سرا میں داخل ہو کر سیدھا گیتی آرا کے کمرے میں جا نکلا گیتی آرا دریچہ کے قریب کرسی پر بیٹھی بحر فکر میں غوطہ زن تھی وہ خاکی رنگ کے کپڑے پہنے تھی اس کے عنبر افشاں سیاہ بال الجھے ہوئے کندھوں پر پریشان تھے سورج کی آخری کرن اس کے زردی مائل دلفریب چہرہ کو چار چاند لگا رہی تھی۔ گلنار بھی اپنی کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

وہ کئی منٹ تک دروازے میں کھڑا اس کو دیکھتا رہا گیتی آرا اپنے خیالات کی رو میں بہہ رہی تھی شجاع کی موجودگی کا اس کو مطلق احساس نہ ہوا مگر گلنار نے اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے فوراً ہی چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

گلنار کی اس حرکت پر وہ ایک دم چونک پڑی اور سامنے شجاع کو کھڑا دیکھ کر بے اختیار ایک چیخ

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اس کے منہ سے نکلی اور لڑکھڑاتے ہوئے اس کے استقبال کو بڑھی لیکن شجاع وہیں کھڑا رہا ندامت و
سے اس کے پاؤں بھاری ہو رہے تھے۔

اس واقعہ کے بعد شجاع شہزادی سے چوری چھپے اکثر گیتی آرا کے پاس آتا جاتا رہا جب اس ملاپ کو ایک سال کے قریب ہو گیا تو یکایک گیتی آرا سخت بیمار ہو گئی کھانا پینا چھوٹ گیا اور سوکھ کر کانٹا ہو گئی پہلے تو معمولی بات سمجھ کر اس نے کسی سے بیماری کا ذکر نہ کیا لیکن آخر جب تکلیف زیادہ بڑھ گئی تو ڈاکٹر کو دکھایا گیا جو معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسز شجاع اُمید سے ہیں۔

یہ نوید جاں فزا سن کر فرط خوشی سے شجاع کی باچھیں کھل گئیں بڑی بیگم نے منہ مانگی مراد پائی شہزادی نے جب یہ خبر سنی تو وہ سناٹے میں آ گئی مگر کیا کر سکتی تھی تھی سلجھنے والی نہ تھی جل بھن کر رہ گئی آخر اس نے اس غداری کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

شجاع کو خوف تھا کہ نہ جانے اب شہزادی کیا آفت برپا کرے گی مگر برخلاف اس کے شہزادی نے اسے مبارکباد دی اس خبر پر نہایت خوشی کا اظہار کیا اور رفتہ رفتہ گیتی آرا سے بھی راہ و رسم بڑھا کر اپنی ریاکارانہ محبت میں اسے ایسا اسیر کر لیا کہ وہ اس کا دم بھرنے لگی گیتی آرا کا کمرہ بازار کے سرے پر واقع تھا جس کے نیچے ہر وقت دوکانداروں کی کرخت آوازیں موٹریں اور تانگوں کا شور و غل بپا رہتا شہزادی اب اکثر اس کے کمرے میں آتی اور دریچے میں بیٹھ کر پہروں اس پر رونق بازار کی سیر دیکھا کرتی۔

شام کا وقت تھا گیتی آرا اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی شہزادی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی ایک پلیٹ تھی۔

"بہن آج طبیعت کیسی ہے؟" شہزادی نے مسکرا کر پوچھا۔

"بدستور خراب ہے" گیتی آرا نے جواب دیا۔

"کچھ کھایا پیا بھی ہے"۔

"بہن کھانے کو جی نہیں چاہتا"۔

"اس طرح فاقہ کرنے سے تو بہت کمزوری ہو جائے گی لو یہ تھوڑی سی مٹھائی کھالو امی جان نے نیاز کی بھیجی تھی یہ تمہارا حصہ ہے"۔

گیتی آرا کی طبیعت آج بہت بدمزہ تھی اسے متلی ہو رہی تھی مگر شہزادی کے خوش کرنے کو اس نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی اور رس گلا اٹھا کر کھانے لگی۔

شہزادی مسکراتی ہوئی دریچہ میں بیٹھ کر بازار کا نظارہ دیکھنے لگی گیتی آرا نے رس گلا اٹھایا مگر کھانے کو جی نہ چاہتا تھا اس نے شہزادی کی آنکھ بچا کر سب مٹھائی گلنار کی پلیٹ میں ڈال دی اور خود یونہی منہ ہلاتی رہی اور جب وہ مٹھائی ختم کر چکی تو گیتی آرا نے شہزادی کو دکھانے کیلئے تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھ کر خالی پلیٹ میز پر رکھ دی۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی یکایک گلنار کرب و اضطراب سے لوٹنے لگی گیتی آرا کی آنکھ کھل گئی اسے بیدار دیکھ کر گلنار نہایت دردناک آواز سے کراہنے لگی اس کی حالت متغیر تھی پتلیاں پھر گئی تھیں سانس رک رک کر آتا تھا اور وہ کوئی دم کی مہمان معلوم ہوتی تھی۔

گیتی آرا کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی وہ انتہائی الم سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بے اختیار اس کے آنسو جاری ہو گئے اتنے میں کسی نے زور سے دستک دی گیتی آرا سہم گئی کہ اس وقت دستک کے کیا معنی آخر دل کڑا کر کے پوچھا کون ہے "جلدی دروازہ کھولو" کسی نے کہا آواز پہچان کر گیتی آرا نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

شجاع بوکھلایا ہوا اندر آیا اور کہنے لگا "اف گیتی آرا غضب ہو گیا جلدی چلو شہزادی قریب المرگ ہے اس ناگہانی خبر سے گیتی آرا کے دل پر دھچکا سا لگا وہ کلیجہ مسوس کر رہ گئی اور بھرم رکھنے کی خاطر گلنار کو اسی حالت میں چھوڑ کر شجاع کے ساتھ چل دی۔

گیتی آرا کو دیکھ کر شہزادی باوجود انتہائی کرب کے بستر سے اچھل پڑی "آہ تم ابھی زندہ ہو" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "کیوں کیا ہے" شجاع نے کانپ کر کہا۔

شہزادی مایوسانہ نگاہوں سے دیکھ کر بولی میں نے پہلے اس کو مٹھائی میں سنکھیا ملا کر کھلایا اور بعد میں خود کھایا مگر تعجب ہے اس پر ابھی تک کچھ اثر نہ ہوا۔

شہزادی کی زبان سے یہ لفظ سنکر شجاع تھرا اٹھا مگر گیتی آرا کہنے لگی۔

"بہن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے میں نے وہ مٹھائی خود نہیں کھائی تھی بلکہ گلنار کو دے دی تھی آہ وہ بے چاری مجھ پر صدقے ہو گئی اب تک یقیناً مر چکی ہو گی۔"

شہزادی اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ "آہ تم زندہ ہو اور میں اس دنیا سے نامراد جا رہی ہوں افسوس صد افسوس!"۔

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں ناک ٹیڑھی اور اعضاء بے حس و حرکت ہو گئے وہ کئی منٹ تک بالکل خاموش رہی یکا یک اس نے اپنی سب قوتوں کو یک جا کر کے پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنی نظریں بحال کر کے کہنے لگی۔

"گیتی آرا تم خوش ہو گی کہ میں مر رہی ہوں لیکن یاد رکھو میری روح تم سے ضرور انتقام لے گی"۔

اتنا کہتے ہوئے اس کی گردن کا منکا ڈھلک گیا اور روح تن سے جدا ہو گئی۔

شہزادی کی تجہیز و تکفین کے بعد جب گیتی آرا اپنے گھر گئی تو یہ دیکھ کر اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ گلنار صحیح و سلامت اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔

اس حادثہ کے دو مہینے بعد خدا نے گیتی آرا کو چاند سا بیٹا عطا کیا مگر افسوس یہ خوشی ان لوگوں کو زیادہ دیر تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی بچہ پندرہ دن زندہ رہ کر گھر والوں کو داغ مفارقت دے گیا۔

بچے کی موت سے گیتی آرا اور شجاع نہایت دل برداشتہ ہو گئے بڑی بیگم کو تو ایسا صدمہ ہوا کہ وہ جانبر نہ ہو سکی ان کے بعد گھر کی رہی سہی رونق بھی کافور ہو گئی۔ شجاع تو پھر بھی باہر جا کر دو گھڑی دل بہلا لیتا مگر گیتی آرا تصویر یاس بنی ہوئی ہر وقت کڑھتی رہتی در و دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے اب اسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی اس پر طرہ یہ کہ گلنار نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

جب سے گلنار اس خوفناک موت کے منہ سے بچی تھی اس دن سے اس کی عادتیں بالکل بدل گئی تھیں وہ نہایت غصیلی اور خونخوار ہو گئی تھی اب وہ اکثر اوقات گیتی آرا پر غراتی اور شجاع کو دیکھ کر بھی سامنے ڈٹی رہتی اور اکثر اوقات ایسی خوفناک آواز نکال کر روتی کہ سننے والوں کے دل دہل جاتے۔

گیتی آرا نے اس کے گلے میں پٹہ ڈال دیا تھا یہ تمام دن بر آمدے میں زنجیر سے بندھی رہتی اور رات کو کھول دی جاتی تھی۔

ڈیڑھ سال بعد پھر گیتی آرا کے لڑکی پیدا ہوئی مگر وہ بھی چندرہ دن تک زندہ رہ کر بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گئی اس بچی کی موت سے شجاع کو یقین ہو گیا کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے وہ اکثر اوقات رات کو نہایت ڈراؤنے خواب دیکھتا تھا چنانچہ ان توہمات کے زیر اثر اس نے وہ گھر چھوڑ دیا اور باہر کوٹھی میں سکونت اختیار کر لی۔

یہاں آ کر بھی ان خوفناک خوابوں نے پیچھا نہ چھوڑا وہ اکثر دیکھتا کہ گلنار گیتی آرا کے سرہانے

بیٹھی ہنس رہی ہے اور بعض دفعہ اسے محسوس ہوتا کہ گلنار کا قد بڑھتے بڑھتے گدھے جتنا ہو گیا ہے اس کا خیال تھا کہ یہ واقعات عالم بیداری کے ہیں مگر گیتی آرا اس کے اس خیال کو تمسخر میں اڑا دیا کرتی تھی۔

اسی سال گیتی آرا کو پھر امیدواری ہوئی شجاع کے باپ کے ایک دوست شیخ نیاز احمد نے جو ایک عالم باعمل تھے استخارہ کر کے شجاع کو بتایا کہ گیتی آرا کے بچوں پر کسی بد روح کا سایہ ہے چنانچہ انہوں نے ایک تعویذ دیا کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کے گلے میں ڈال دیا جائے۔

اتفاق کی بات سمجھو یا خدا کی قدرت گیتی آرا کا تیسرا بچہ اصغر زندگی والا پیدا ہوا شجاع اور گیتی آرا کے رنج و اندوہ مسرت میں تبدیل ہو گئے اور وہ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت تصور کرنے لگے۔

بچہ نہایت تندرست اور موٹا تازہ تھا والدین کا اعتقاد تھا کہ بچہ نے تعویذ کی برکت سے ہی زندگی پائی ہے چنانچہ وہ تعویذ کسی وقت بھی اس کے گلے سے علیحدہ نہ کیا جاتا تھا۔

صغر کی پہلی سالگرہ تھی شام کا وقت تھا گیتی آرا کا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہوا تھا گلدستوں کی بو باس سے تمام کوٹھی مہک رہی تھی برقی قمقموں کی تیز روشنی شیشوں کے سامان پر پڑ کر نہایت دلفریب سماں پیش کر رہی تھی جا بجا دروازوں پر سہرے لٹک رہے تھے جو ایسی تقریب پر اکثر باندھے جاتے ہیں در و دیوار سے شادمانی ٹپک رہی تھی شجاع میز کے قریب کھڑا نہایت خوشی سے ان تحائف کو دیکھ رہا تھا جو میز پر قرینے سے رکھے تھے اور کمرے کی زینت کو دوبالا کر رہے تھے یہ وہ تحائف تھے جو شجاع اور گیتی آرا کے عزیزوں نے اصغر کو سالگرہ پر دیئے تھے۔

مہمان عورتیں رخصت ہو گئیں گیتی آرا اصغر کو گود میں لئے اندر داخل ہوئی بچے کو دیکھ کر شجاع کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا اس نے بچے کو ماں کی گود سے لے لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اس سے کھیلنے لگا۔

یکا یک اس کی نظر بچے کے گلے پر پڑی وہ گھبرا کر کہنے لگا۔

"گیتی آرا اس کا تعویذ کہاں ہے؟"

یہ سنتے ہی گیتی آرا اسٹ پٹائی ہوئی غسل خانے کی طرف بھاگی اس نے نہلاتے وقت اسے اتار کر شیلف پر رکھا تھا مگر اب اس کا نام و نشان تک نہ تھا تعویذ کی گمشدگی سے ان کے دل بجھ گئے اور رنگ فق ہو گیا تمام مسرتیں یک دم کافور ہو گئیں دونوں عالم یاس میں بچے کو گود میں لے کر پلنگ پر بیٹھ

Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem

گئے۔

رات طویل اور خوفناک تھی بارہ بجے کے بعد جھکڑ چلنا شروع ہو گیا بارش کے ساتھ اولے بھی پڑنے لگے بادل گرج اور برق کی چشمک زنی قیامت برپا کرنے لگی ہوا نے وہ زور باندھا کہ الامان۔

کمرے میں اداسی چھائی تھی پچھواڑے کی طرف برج میں گلنار بیٹھی نہایت پر درد آواز میں "میاؤں میاؤں" کر رہی تھی اس کی ہولناک آواز شب تار کی نحوست میں دو چند اضافہ کر رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صد ہا روحیں بین کر رہی ہوں۔

باہر توشہ خانہ کی طرف سے برتنوں کی جھنکار سن کر گیتی آرا کے کان کھڑے ہو گئے تھوڑی دیر بعد دروازے پر کھٹکا ہوا پھر پاؤں کی چاپ سنائی دی وہ کانپنے لگی شجاع نے اسے تسلی دینے کی غرض سے پستول اٹھا کر پاس رکھ لیا

اتنے میں روشندان سے کوئی چیز دھماکے کے ساتھ گری گیتی آرا خوف سے اچھل پڑی شجاع نے کہا "اوہو یہ تو گلنار ہے" گلنار آتے ہی ڈریسنگ روم میں گھس گئی شجاع نے اٹھ کر ڈریسنگ روم کے دروازے میں چابی گھما دی تاکہ گلنار باہر نہ نکل سکے۔

رات چوتھائی کے قریب گزر چکی تھی شجاع اور گیتی آرا کی آنکھ لگ گئی یکایک گیتی آرا نے خواب میں دیکھا کہ شہزادی اس کے ساتھ ہاتھا پائی کر کے بچہ چھیننا چاہتی ہے اور دہشت سے اس کی آنکھ کھل گئی اتفاقاً اس کی نظر ڈریسنگ روم کے دروازے پر جا پڑی دروازہ آہستہ آہستہ کھلا ایک عورت اندر سے نمودار ہوئی گیتی آرا چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی شجاع جاگ اٹھا اس نے دیکھا کہ شہزادی پلنگ کے قریب بچے پر جھکی ہوئی ہے گھبرا کر اس نے یکایک پستول داغ دیا ایک خوفناک چیخ کے ساتھ دھم سے کوئی چیز زمین پر گر کر کراہنے لگی۔

یک لخت بجلی فیوز ہو گئی کمرہ دھوئیں سے بھر گیا شجاع حواس باختہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا ادھر اصغر نے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا اس کے رونے سے شجاع کی کچھ ڈھارس بندھی اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

مطلع صاف ہو چکا تھا مہینے کے آخر چاند کی پھیکی روشنی کمرے میں پڑنے لگی شجاع نے بچے کو اٹھا لیا اتنے میں گیتی آرا بھی تازہ ہوا کے جھونکے سے ہوش میں آ گئی اور "میرا بچہ' میرا بچہ' کہہ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"تمہارا بچہ محفوظ ہے" شجاع نے کہا اور گیتی آرا کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں لے آیا ادھر پستول کا دھماکا سن کر ملازم بھی آ چکے تھے شجاع نے انہیں لیمپ جلانے کا حکم دیا لیمپ روشن ہونے پر دونوں اندر آ گئے یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ بجائے شہزادی کے فرش پر گلنار کی لاش پڑی تھی۔

ندیم
Uploaded By Muhammad Nadeem
Scanned And Uploaded By Muhammad Nadeem